ہدیہ بہ بارگاہِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ (مسلم شریف)

تفسیر ایوبی

جلد چہارم

پارہ عمّ کے چند رکوعات کی جامع تفسیر

از

حضرت امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ محمّد ایوّب صاحب

دہلوی قدس اللہ سرہٗ

مکتبہ رازی

۱۵ - شہاب مینشن

محمد بن قاسم روڈ - کراچی ۱

ڈاکٹر منظور احمد
چیئرمین شعبۂ فلسفہ
یونیورسٹی کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علّامہ حافظ محمد ایوب متاخرین علماء میں ان چند گنے چنے لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی عظیم عقلی روایت کے امین ہیں۔ اب اس قسم کے لوگ دنیائے اسلام سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور اس کی جگہ ایک عقلیت پسندی لے رہی ہے جو اگرچہ بعض جہتوں سے اسلامی فکر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن عام طور پر عقل حاضر کے افادیتی فلسفہ سے متأثر ہے جس کی وجہ سے وہ عقل کے ان معیارات پر پوری نہیں اترتی جو متقدمین نے قائم کئے تھے۔

علّامہ ایوب صاحب صرف متقدمین کے فن کے امین ہی نہ تھے بلکہ اس بارے میں انہوں نے نئی راہیں تلاش کی ہیں اور اکثر جگہ متکلمین سابقہ کے دلائل سے اختلاف کیا ہے۔ تفہیم قرآن میں ان کا یہ رویہ، قرآن کو منظم، مربوط اور کلی نظام کی حیثیت سے سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ فلسفیانہ باریکیوں اور مشکل مضامین کے باوصف حضرت علامہ میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ اپنے اندازِ بیان سے اس مشکل کو آسان کر دیا کرتے تھے۔ اور مختلف مضامین ایسی مثالوں سے سمجھاتے تھے جو ہمارے ماحول میں ملتی ہیں۔ اور جن کو روزمرہ زندگی میں عقلی طور پر تشفی بخش سمجھتے ہیں۔ یہ کام بڑے جگر کا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ بیان کرنے والے کو نفس مضمون پر کلی عبور حاصل ہو۔

علّامہ کی قرآن کی تفہیم عالمگیر منطقی کلیات پر مبنی ہے لیکن

اپنے دلائل اور طرزِ تشریح میں وہ کسی مدرسۂ فکر کے پابند نہیں ہیں۔ اکثر مسائل پر نئی دلیلیں نکالی ہیں جن کا پتہ حکمائے متقدمین میں نہیں ملتا بعض مقامات پر منطق کے اصولوں کی پکڑ بھی کی ہے اس لئے کہ منطق کے اصول ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے۔ ایسے مواقع پر علامہ نے قرآن کی روشنی سے استفادہ کیا ہے اور قرآن کے بیان کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ یہ تفسیریں قرآن کے فلسفیانہ اور منطقی تشریحیں ہیں غلط ہوگا۔ یہ قرآن فہمی کے لئے وہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں جن کے بعد قرآن کے اسرار و رموز نفس انسانی پر آشکارا ہوتے ہیں۔ میری دانست میں یہ تفسیریں وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہیں اور بعض افکارِ باطلہ کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ یہ صرف فلسفیانہ مزاج والوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر پڑھے لکھے قاری کے لئے مفید ہیں اور خصوصاً مجتہدین کے لئے انشراح کا باعث ہوں گی۔

نوٹ

قارئین کرام! یہ تقاریر ٹیپ ریکارڈ سے نقل کی گئی ہیں ہمیں افسوس ہے کہ ان میں تسلسل قائم نہ رہ سکا۔ آئندہ کوشش کی جا رہی ہے۔ والسلام!

ادارہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِیْ هُمْ
فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ؕ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ؕ
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ وَّخَلَقْنٰكُمْ
اَزْوَاجًا ۙ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۪ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ
وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً
ثَجَّاجًا ۙ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ اِنَّ
يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ
فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ
وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ؕ اِنَّ جَهَنَّمَ
كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ
اَحْقَابًا ۚ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ
اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ جَزَآءً وِّفَاقًا ؕ

عم یتساءلون

عم یتساءلون عن النبا العظیم

کیا یہ لوگ نبار العظیم یعنی قیامت کی بابت آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں. کوئی کہتا ہے. آئے گی کوئی کہتا ہے نہیں آئے گی۔ روز حساب اور قیامت کے بارہ میں جھڑکا "کلا" یعنی اسبات میں جھگڑنا اور اختلاف نہیں کرنا چاہیئے "سیعلمون" یعنقریب جان لیں گے "ثم کلا سیعلمون" اور پھر دوبارہ جھڑکا کہ روز جزا میں اختلاف نہیں کرنا چاہیئے. عنقریب یہ جان لیں گے. جب وہ جہنم کو دیکھ لیں گے اور قیامت کو دیکھ لیں گے تو اس وقت ان کو یقین آجائے گا کہ جس بات کی ان کو خبر دی گئی تھی وہ ٹھیک تھی۔ دو جگہ ہے "کلا" ایک سے مراد مرنے کا وقت اور دوسرے سے مراد قیامت ہے۔ آپ غور کریں۔

قیامت کے امکان کے دو اصول ہیں۔ ایک تو اللہ تعالے قادر ہو مردہ کو دوبارہ اٹھانے پر قادر ہو. قدرت اس کی عام ہو اور دوسرا علم۔ اگر اس کو علم نہیں ہوگا۔ تو اس کو شناخت نہیں ہوگی کس کو اٹھایا جائے

ہیں۔ قدرت اور علم اللہ کی پوری کتاب میں یہی دو اصول بیان کیے گئے ہیں
اللہ تعالےٰ عالم ہے۔ ان اجزاء کا جن سے انسان کا قوام بنا۔ اس کو جگہ جگہ
بار بار قرآن میں دوہرایا ہے۔ بل عجبوا ان جاءھم منذر منھم فقال
الکفرون ھذا شیٔ عجیب کافر کہنے لگے یہ بڑی عجیب اور تعجب کی بات ہے۔ (ق-۲)
ءاذا متنا وکنا ترابا اے کاش کے جب مٹی ہو گئے۔ ذلک رجع بعید دوبارہ آنا،
مشکل اور بعید ہے۔ (ق-۳) یہ ان ہی دو اصلوں پر مبنی تھا۔ تو اس کا جواب دیا۔ قد
علمنا ما تنقص الارض منھم ہمیں خوب معلوم ہے کہ زمین ان سے کتنی گھٹی ہے
یعنی اجزائے ارضیہ ان کے قوام میں کتنے خرچ ہوئے ہیں۔ وعندنا کتاب حفیظ
اور اگر یہ خیال ہے کہ یہ علم جاتا رہے گا تو ایک محفوظ رجسٹر میں اس کو نوٹ (ق-۴)
کر لیا ہے اور بے شمار جگہ قیامت کا ذکر ہے۔ قرآن میں تو تقریباً چھ سو آیات
ہیں اعمال کے متعلق باقی سارا قرآن عقائد کے متعلق ہے اور عقائد میں قیامت
ہی پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور مختلف طریقہ سے اس کو سمجھانے کی کوشش کی
ہے اور یہی دو اصل بیان کی ہیں۔ ایک علم اور دوسری قدرت۔ ان آیات کا
اب میں ذکر کرتا ہوں۔ الم نجعل الارض مھدا کیا اس بات میں غور نہیں کرتے
کہ ہم نے زمین کو فرش بنا دیا تاکہ اس پر لیٹیں بیٹھیں دوڑیں پھریں جو چاہے سو کریں
زمین سے فائدہ اٹھائیں۔ تو فائدہ جب ہی اٹھا سکتا ہے جب ساکن ہو۔ اگر
زمین متحرک ہو گی تو پورا پورا فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ اگر حرکت سیدھی ہو گی
تو نیچے کو جائے گی کہ بھاری ہے اوپر سے جانے والی چیز کبھی بھی زمین تک
نہیں پہنچ سکے گی۔ اگر گول حرکت ہے تو اگر مغرب کی جانب حرکت ہے تو

مشرق کی جانب اس کے خلاف حرکت نہیں ہو سکے گی۔ جو چیزیں مغرب میں ہیں وہ حرکت کے بعد یا شمال میں یا جنوب میں یا مشرق میں آجائیں گی حالانکہ ۲۴ گھنٹے جو شے جہاں ہے وہیں رہتی ہے۔ اور جو سیارے جہاں ہیں وہیں رہتے ہیں۔ اپنی جگہ نہیں بدلتے۔ اگر حرکت ہو گی تو خلاف سمت نظر آئے گا۔ اس سمت میں نظر نہیں آئے گا۔ یہ دلیل اہل علم نے بیان کی ہے میری دلیل نہیں اور حکیم ارسطو نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ زمین پورے کرہ عالم مرکز ہے اور مرکز ساکن ہوتا ہے اس لئے زمین ساکن ہے۔ کیونکہ اگر مرکز ساکن نہیں ہو گا تو وہ دائرہ بن جائیگا مرکز نہیں رہیگا۔ لہذا زمین سے اسی وقت پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب وہ ساکن ہو۔ ایسی سخت نہ ہو جیسے پہاڑ۔ ایسی نرم نہ ہو جیسے پانی۔ اور بہت شفاف نہ ہو۔ کیوں کہ اس وقت روشنی پھیل جائے گی۔ اور تکلیف دے گی۔ آنکھ کو اور نظر نہیں آئے گا۔ اس لئے اس کو غبار آلود بنایا تاکہ یہ انسانوں اور جانوروں کے لئے مفید ہو جائے۔

والجبال اوتادا۔ اوتاد وتد کی جمع ہے۔ وتد میخ یا کھونٹی کو کہتے ہیں پہاڑوں کو ہم نے میخ یا کھونٹے کی طرح گاڑ دیا ہے۔ تاکہ زمین ہلنے نہ پائے۔ اور اعتدال قائم ہو جسے BALANCE کہتے ہیں۔ اسے آپ سمجھ لیں کہ زمین کا جو موجود وزن ہے اس وزن سے یہ ایک رتی کم بھی ہو سکتی تھی۔ اور زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ دونوں ممکن ہیں اور جتنا اس کا طول اور عرض ہے اس میں ایک انچ کی زیادتی یا ایک انچ کی کمی دونوں ممکن ہیں۔ باوجود امکان کے یہ موجود طول و عرض کے ساتھ محدود اور مطول ہوئی اور موزوں ہوئی موجودہ وزن کے ساتھ اس کے خلاف ممکن تھا

تو اس موجودوزن سے موزوں کس وجہ سے ہوئی. کیونکہ زمین کی طبیعت یہ نہیں چاہتی کہ وہ اتنی ہو جتنی کہ وہ اب ہے. جب کمی و بیشی دونوں ممکن ہیں. تو موجود حالت کا تعین اس کا ذاتی فعل نہیں ہے. بلکہ اس کی ماہیت سے باہر ہے اور خارج ہے. باہر کی کسی طاقت نے اپنے قہر سے مقہور کر کے اپنی تعین کے ساتھ اس کو معین کر دیا. یہ دلیل اس کے خالق کے وجود کی ہے. ایک مکان ہے اس کو آپ کیوں یقین کر لیتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے. اس کی وجہ یہی ہے کہ مکان کی ماہیت کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ یہ اتنا بڑا ہو. بلکہ کسی بیرونی طاقت نے اس کو موجود طول وعرض کے ساتھ مطول اور معین کر دیا. تو ضرور ضرور کوئی زمین کا پیدا کرنے والا ہے. اور زمین جسم ہے تو اس کا بنانے والا، پیدا کرنے والا جسمانی نہیں ہوگا. بلکہ غیر جسمانی ہوگا. اور جب وہ غیر جسمانی ہوگا. تو یہ جسم اس کو یا منفک ہوگا یا لازم ہوگا. تو اب آپ غور کریں اگر کائنات کے جو اجزا ہیں. ان کا موثر اور بنانے والا اگر موجب اور بے قرار ہوگا یعنی غیر اختیاری ہوگا. تو اس کے افعال اضطراری ہوں گے اور فعل اس کو لازم ہوگا. یہاں ایک باریک بات ہے جو علماء اور متکلمین کے خیال میں نہیں آئی. لازم ہونے کی صورت میں کیا خرابی ہے. پیدا کرنے والے کو یہ لازم نہیں ہے. بلکہ وہ اس سے دور ہے اور اس سے غنی ہے غنی کے معنی بے پرواہ ہے. اور دور ہے. اللہ تعالیٰ نے فرمایا "غنی عن العالمین" وہ تمام عالموں سے غنی ہے یعنی اس کو ان چیزوں کی حاجت نہیں ہے. اگر اس کو ان کی حاجت ہوتی تو جب سے وہ ہے یہ چیزیں اس کے ساتھ لازم ہوتیں. لیکن ایسا نہیں ہے. اب اس کو سمجھ لیں کہ ایسا کیوں

نہیں ہے۔ اگر یہ لازم ہوگا تو اس کے مقابلے کی جو شے ہے اس کو ملزوم
کہتے ہیں اور لازم کی نفی سے ملزوم کی نفی ہوجاتی ہے اور ملزوم کی نفی ہوجاتی
ہے اور ملزوم کے وجود سے لازم کا وجود ہوجائے تو لازم سے اگر قطع نظر کرلی جائے
گی۔ تو ملزوم ناقص ہوجائے گی۔ جیسے آگ ہے۔ اس کو حرارت لازم ہے۔ اگر حرارت
سے قطع نظر کرلی جائے تو آگ آگ نہیں رہے گی۔ خاک ہوجائے گی کوئی اور
شے ہوجائے گی۔ اسی طرح اگر مخلوق خالق کو لازم ہوگی۔ تو اگر مخلوق سے قطع
نظر کرلیں گے تو خالق خالق نہیں رہے گا۔ کوئی شے نہیں رہے گی مگر
وہ کوئی شے ہے تو معلوم ہوا کہ خالق مخلوق سے بالکل جدا ہے۔ اور غنی ہے مخلوق
اس کا لازمی فعل نہیں ہے۔ اور اس کی ذات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے
لازم جو ہوتا ہے اس کا تعلق ذات سے ہوتا ہے۔ تو پھر کس سے تعلق ہے
اس کا تعلق اس کی مشیت اور اختیار سے ہے۔ اس کی ذات سے نہیں ہے۔ تو
اس کا پیدا کرنے والا غیر جسمانی ہے۔ عاجز نہیں ہے مختار ہے۔ صاحب قدرت
ہے۔ تو جتنی چیزیں بیان کی گئیں ہیں۔ وہ دلالت کرتی ہیں۔ حادث ہونے پر اور
محکم ہونے پر۔ محکم کے معنی ہیں مرتب۔ ترتیب دار۔ علم سے اور شعور سے جو شے
بنائی جائے گی۔ اس میں ترتیب ہوگی۔ اور بے شعوری میں جو شے بنے گی۔ وہ
ایک ہی قسم کی ہوگی۔ اس میں ترتیب نہیں ہوگی۔ آگا پیچھا نہیں ہوگا جیسے
دیوار۔ دیوار بننے سے پہلے یہی اینٹ چونا گارا بے ترتیب اور منتشر پڑا تھا اور
وہ گدھے پر لاد کر لایا گیا تھا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ فعل بے شعور گدھے کا تھا اور یہ دیوار
ایک باشعور عالم انجینئر کا ہے۔ اسی ترتیب کو احکام اور محکم کہتے ہیں۔ یہاں ہر شے

ہیں دو چیزیں موجود ہیں ایک حدوث اور دوسری ترتیب۔ حدوث دلالت کر رہا۔ محدث پر خالق پر قادر ہونے پر اور ترتیب دلالت کر رہی ہے علم پر یہ دو اصول بیان کئے اور ان دونوں سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ الم نجعل الارض مھاداً کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا۔ والجبال اوتاداً اور پہاڑ کو میخ نہیں بنایا۔ وخلقناکم ازواجاً اور کیا تم کو جوڑے جوڑے نہیں مرد عورت نر و مادہ یا یہ مراد ہے کہ ہر دو متقابل چیزیں۔ ایسی دو چیزیں جو ایک مکان میں ایک وقت میں ایک حیثیت سے جمع نہ ہو سکیں ان کو ازواج کہتے ہیں۔ جیسے کپڑا کہ ایک وقت میں یہی کپڑا اسفید بھی ہو اور کالا بھی ہو۔ یہاں تمام متقابل چیزیں موجود ہیں۔ یہ فعل بالاختیار ہے۔ اگر اضطرار ہوتا تو ایک ہی قسم کا فعل ہوتا۔ جیسے آگ کا فعل حرارت ہی ہے۔ ٹھنڈک اس کا فعل نہیں ہوگا۔ ایک قسم کا فعل ہے۔ اونچا اور نیچا بنایا۔ گرمی اور ٹھنڈک بنا دی۔ ہوا کا فعل ہمیشہ اوپر جانے گی۔ مٹی بھاری شے ہے۔ ہمیشہ نیچے جائے گی۔ جسم ہے کسی کو اونچا کر دیا۔ کسی کو نیچا کر دیا تو معلوم ہوا کہ جسم کی طبیعت میں نہ اونچ تھی نہ نیچ تھی۔ طبیعت کے باہر سے کسی نے اس کو اونچا کر دیا کسی کو نیچا کر دیا۔ تو ہر ذرہ حدوث پر دلالت کر رہا ہے اور ذروں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لاانتہا ہیں۔ تو خدا کے وجود پر لاانتہا دلائل ہیں۔ اور اس کی قدرت کاملہ پر کائنات کے ہر جز کی جگہ کوئی ایک ننھا سا جزو لاینجزا لگا یا جا سکتا ہے۔ اب ج د اس کی آپ ترتیب کریں تو کتنی ترتیبیں بن جائیں گی۔ اب ج د، ب اج د، ب

[illegible]

بہت سی ترتیبیں ہیں تو ایک اور لاانتہا میں ترتیب دی جائے گی تو لاانتہا مدارج ہو جائیں گے۔ یعنی ہر جز ہر جز کی جگہ واقع ہو سکتا تھا۔ مگر وہ اپنی مقررہ جگہ پر واقع ہوا ہے۔ تو ہر ذرہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اس کا کوئی کرنے والا ہے تو علم اور قدرت یہ دو اصول لازمی ہیں۔ قیامت کے لیئے۔ اگر یہ دو اصول نہیں ہوں گے تو قیامت نہیں ہو گی۔ قیامت کا انکار یعنی ان دونوں چیزوں سے انکار ہے۔ آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ اگر ننھے ننھے اجزاء نطفہ کو دیکھا جائے تو سب یکساں ہوں گے۔ پھر کیا وجہ کہ ایک نر بن گیا اور دوسرا مادہ یعنی اگر نطفہ کی طبیعت کا تقاضہ ۔ مرد بننے کا ہوتا۔ تو کبھی عورت نہ بنتی اور اگر عورت بننے کا تقاضہ ہوتا تو کبھی مرد نہ بنتا اور مرد عورت دونوں بن رہے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ نطفہ سے باہر کسی اور قوت نے اپنے قہر سے مقہور کر کے کسی کو عورت اور کسی کو مرد بنا دیا۔ وجعلنا نومکم سباتاً۔ اور ہم نے تمہاری نیندوں کو تمہارے لیئے باعث راحت بنایا کہ تم دن بھر کام کرتے ہو تھک جاتے ہو تو رات کو تمہیں راحت ملے اور تمہاری تکان دور ہو جائے۔ یہ بھی قدرت اور علم پر دلالت کر رہی ہے۔ میرے ذہن میں ایک بات آئی اسی وقت کہ یہ براہ راست قیامت پر دلالت کر رہی ہے۔ سبات کے معنی لغت میں قطع کرنے کے ہیں۔ اور چونکہ نیند تکلیف کو قطع کر دیتی ہے اور اس لئے اس کو سبات کہا۔ زائل کرنے والی تکان کو زائل کر دے گی تو ظاہر ہے کہ راحت ہی راحت ہو گی۔ بڑی اچھی بات ذہن میں آئی کہ اگر مقصود بالذات یہ زندگی ہوتی۔ کھانا پینا اور عیش کرنا تو آدھی عمر سونے میں خرچ نہ کی جاتی [illegible]

مقصود ہوتا۔ یہ زندگی مقصود ہوتی۔ یہ راتیں مقصود ہوتیں تو آدھی عمر سونے میں نہ گنوائی جاتی تو معلوم ہوا کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے مقصود بالذات کوئی اور شئے ہے جس کے لئے یہ بنائی ہے اگر یہ مقصود ہوتی تو ۲۴ گھنٹے جاگنا اور لذت میں رہنا۔ وجعلنا اللیل لباسا اور رات کو لباس بنایا۔ لباس کے معنی ڈھانکنے والا رات کے اندھیرے میں اپنی ضرورتیں حفاظت وغیرہ پوری کرلیں۔ وجعلنا النهار معاشا اور دن کو ہم نے معاش بنایا۔ وقت معاش۔ وقت معیشت۔ وقت عیش بنایا۔ اگر معاش کو اسم ظرف لیا جائے۔ تو معنی ہوں گے عیش کی جگہ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ دونوں معنی لگتے ہیں۔ اور اس کے خلاف بھی ممکن تھا مگر ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کسی قادر نے اپنی قدرت سے اس کو ایسا بنا دیا۔ وبنینا فوقکم سبعا شدادا اور ہم نے تمہارے سروں کے اوپر سات مستحکم اور مضبوط آسمان بنائے بنا ڈالی۔ بنا کے لفظ میں ایک بڑا دقیقہ ہے۔ کیونکہ بنا نیچے سے ہوتی ہے بنیاد کے لئے بنا کا لفظ ہے تو اوپر کیا بنیاد پڑے گی۔ آسمان کی کیا بنیاد۔ آسمان تو چھت ہے۔ بنیاد ایسی شئے ہے کہ کچھ بھی ہو زلزلہ آئے طوفان آئے سب کچھ گر جاتا ہے۔ بنیاد باقی رہتی ہے۔ اتنی مضبوط ہوتی ہے۔ تو یہ چھت اتنی مضبوط بنائی ہے کہ گویا یہ بنیاد ہے۔ اس قدر مضبوط ہے یہ فصاحت و بلاغت ہے۔ "وجعلنا سراجا وهاجا" وہاج کے معنی خوب چمکتا ہوا۔ سراج کے معنی چراغ۔ خوب چمکتا ہوا چراغ بنایا۔ "وانزلنا من المعصرات ماءً ثجاجا" اور ہم نے بادلوں سے دھواں دھار پانی برسایا۔ تاکہ معصرات = بادل ابر ثجاج دھواں دھار) کثرت سے پیدا وار ہو لنخرج به حبا ونباتا وجنات الفافا تاکہ اس بارش کے ذریعہ ہم اس سے نکالیں

حب دانہ جس میں گومٹی پڑی ہوتی ہے اور نبات۔ جو بغیر گومٹی کا ہے (الف ابانہ نبیت کی جمع لپٹا ہوا۔ جیسے گھنے درخت ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہوتے ہیں) تین قسمیں ہوتی ہیں تینوں کا اظہار کر دیا۔ یہاں تک قدرت کا اظہار تھا۔ علم اور قدرت دونوں اصولوں کو ان سے ثابت کر دیا۔ اور جب وہ اس پر قادر ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے خلاف پر بھی قادر ہے۔ اس کے موافق پر بھی قادر ہے۔ اور اس کو علم بھی ہے اور جو چیز ایک جسم کے لئے ثابت ہے۔ وہ دوسرے جسم کے لئے ممکن ہے۔ تو ایک جسم کا ٹوٹنا پھٹنا یہ ثابت ہے۔ واقع ہے۔ تو دوسرے جسم کا ٹوٹنا پھوٹنا بھی ممکن ہو گیا۔ خواہ واقع ہو یا نہ ہو۔ مگر اس کا ہونا۔ ضروری ہے کاٹنا اور پھاڑنا۔ حرکت اگر مستقیم ہے تو دوسرے جسم کے لئے بھی حرکت مستقیم ممکن ہو گئی۔ اب آسمان چونکہ جسم ہے۔ آسمان میں بھی حرکت مستقیم ہو سکتی ہے۔ یعنی اس کا ٹوٹنا پھٹنا بھی ممکن ہے تو عالم کا تباہ ہونا ممکن ہو گیا۔ ان تمام دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ممکن ہے۔ اب مخبر صادق نے اس ممکن کے واقع ہونے کی خبر دی تو وہ واجب الیقین ہے۔ اس کا یقین کرنا پڑے گا کہ قیامت ضرور واقع ہو گی۔

اب رہا اس کا وقت کہ کب واقع ہو گی۔ یہ سماعی چیز ہے عقل میں نہیں آ سکتی۔ نبی نے خبر دی اس وجہ سے معلوم ہو گیا۔ ورنہ کچھ بھی پتہ نہ چلتا اور اس کی بین دلیل آپ کا مکان ہے۔ اس کا آپ کو یقین ہے کہ یہ ٹوٹ جائے گا۔ مگر کب ٹوٹے گا یہ نہیں بتا سکتے۔ جو چیز یہاں یہ بتا رہی ہے کہ یہ مکان ٹوٹ جائے گا۔ وہی چیز آسمان میں موجود ہے۔ اس کے ٹوٹنے کا علم آپ کو کیونکر ہوا۔ کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے اور ضرور ٹوٹ جائے گا۔ اس دیوار کے اوپر کا جو پلاسٹر ہے وہ اس کے وجود

کی خبر دے رہا ہے۔ اس کے اندر کی جو سطح ہے وہ اس کے خلاف ہے اس کی ضد ہے۔ اور اس کی خرابی پر دلالت کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر اندر والی تہیں بھی ایسی ہوتیں تو بہت مضبوط ہوتیں اور کبھی نہ مٹتیں۔ تو اس کی تعمیر ہی میں تخریب مضمر ہے۔ اسی طرح یہ آسمان کی جو سطح ہے محدب افلاک تو اس کی دوسری سطح اس کی بالکل ضد ہے۔ یہ بقا پر دلالت کر رہی ہے اور وہ فنا پر دلالت کر رہی ہے۔ اور اس میں خرابی مضمر ہے۔ تو جس طرح مکان کے گرنے کا یقین ہے۔ مگر یہ بتایا نہیں جا سکتا کہ کب گرے گا۔ اسی طرح قیامت آئے گی۔ مگر کب آئے گی۔ اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔ اس کا پتہ نہ عقل سے چل سکتا ہے۔ نہ حس سے، یہ صرف سماعی ہے اور اگر سماعی علم قابل یقین نہ ہوتا تو کان نہ دیئے جاتے۔ کان اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ بھی علوم آئیں گے نبی بیان کرے گا۔ "ان یوم الفصل کان میقاتاً"۔ فصل کے معنیٰ جدائی تو اس دن جس دن مومن اور کافر جدا ہوں گے۔ وہی ثواب وعتاب کا دن ہے۔ فصل کے معنیٰ فیصلہ کے بھی ہیں تو فیصلہ کا دن بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں۔ وہ کونسا دن ہے "یوم ینفخ فی الصور" جس دن صور پھونکا جائے گا۔ بعض مفسرین صور کے معنیٰ جان بتاتے ہیں یعنی جس دن بدن میں روحیں پھونکی جائیں گی۔ مگر پہلے معنیٰ زیادہ ٹھیک ہیں کہ اسرافیلؑ صور پھونکیں گے۔ یہ دوسرا صور ہوگا۔ پہلے صور پر سب فنا ہو جائیں گے۔ اور دوسرے صور پر زندہ ہوں گے۔ "فاذا ھم قیاماً ینظرون"۔ سب کھڑے ہو جائیں گے۔ اور ایک دوسرے کو دیکھا کریں گے جس روز صور پھونکا جائے گا۔ "فتاتون افواجاً" تمہاری فوجیں کی فوجیں جماعتوں کی جماعتیں آئیں گی۔

وفتحت السماء فکانت ابوابا" اور آسمان کھول دیا جائے گا. جیسے دروازہ ہی دروازہ ہوں" وسیرت الجبال فکانت سرابا" اور پہاڑ چلیں گے. جیسے سراب ایسا معلوم ہوگا جیسے سراب. یہ بتایا اس کا تعلق نقل سے تھا نبی کے بیان سے تھا کیونکہ سارا دین علاوہ نبی کی تصدیق کے سب کا سب نبی پر موقوف ہے. آج صبح ذہن میں ایک بات آئی کہ مذہب جو ہے وہ ادلتا بدلتا ہے کہ کافر مومن ہو جاتا ہے. مومن کافر ہو جاتا ہے. بعض آدمی کچھ بھی نہیں جانتا. فعل کو کرنا پھر چھوڑ دینا یا ترک کرنا پھر اختیار کرنا یہ دلیل ہیں اختیار کی. تو مذہب جو ہے وہ اختیاری چیز ہے اور عقلی چیز جو ہے وہ اختیاری نہیں ہے. اس لئے کہ جو علم عقل سے حاصل کریں گے اس کے ماننے پر مجبور ہوں گے 3 × 5 = 15 ہوتے ہیں. اس کے ماننے پر سب مومن کافر مجبور رہتے ہیں. اس کے خلاف نہیں کہہ سکتے. خدا کو وحدہٗ لاشریک نہ مانے یہ تو ہو سکتا ہے. نبی کو نہ مانے یہ ہو سکتا ہے. لیکن 3 × 5 پندرہ ہوتے ہیں. یہ نہ مانے یہ نہیں ہو سکتا. اور جو ایسا کرے وہ پاگل اور مجنون ہے. تو دلیل کی تقریر یہ ہوئی کہ مذہب اختیاری ہے. اور عقل اختیاری نہیں ہے اس لئے مذہب عقلی نہیں ہے. بڑی اچھی اور پختہ دلیل ہے. جو لوگ منطق سے واقف ہیں. وہ اس دلیل پر دنگ رہ جائیں گے. بانی مذہب کی صداقت عقل سے اس طرح سمجھ میں آئے گی کہ وہ خود سمجھائے گا. اگر وہ نہ بتائے تو وہ کبھی عقل سے خود بخود نہیں سمجھ سکتا یعنی نبی نبوت ثابت ہونے سے قبل ایسے دلائل بیان کرے گا. عقل کے سامنے کہ وہ اس کو سمجھ لے. اور قبول کرلے بس یہ بات وہ عقلی دلیل سے سمجھائے گا. جب نبوت سمجھ میں آگئی بس پھر جو وہ کہے وہ واجب الایمان

اور واجب العمل ختم ہو گئے پھر آ گئے عقل کی ضرورت نہیں۔ اگر ہر چیز عقل میں آ جاتی تو پھر نبی کے آنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

بیرونی حالات سے انسان مجبور تو ہو جاتا ہے مگر بیرونی حالات سے اتنا مجبور نہیں ہوتا جتنا اندرونی حالات سے مجبور ہو جاتا ہے۔ دل میں کوئی بات بیٹھ جائے یا خوشی یا رنج کی کوئی بات ہو تو اس کا ادراک جتنا شدید ہو گا بیرونی حالات کا ادراک اتنا شدید نہیں ہو گا کیسی بین بات ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود کہہ دے تو انسان مجبور ہو جائے گا یا نہیں۔ ملائکہ آسمان سے اتر کر یہ کہہ دیتے جیسا کافر چاہتے تھے تو پھر کس کی مجال تھی کہ انکار کرتا۔ اگر شجر و حجر یہ کہنے لگیں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ اور نبی اس کا برحق ہے۔ تو کس کی مجال ہے۔ جو انکار کرتے اگر پوری کائنات یہ کہہ دے کہ خالق کائنات ہے تو پھر انسان مجبور ہو جائے گا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسانیت سے خارج ہو جائیگا۔ اختیار جاتا رہیگا اور انسان اسکو رہنا ہے تو لا بد ایسی چیز ہونی چاہیئے۔ جو قابل انکار ہو اور قابل اقرار ہو پھر یا اقرار کرے یا انکار کرے ایسا صرف انسان ہی کا کلام ہے۔ لہٰذا نبی ہونا چاہیئے جس انسان کو مان کر مومن اور انکار کرنے سے کافر ہو جائے۔ اسی کا نام نبی ہے۔ اگر یہ علم عقلی اور حسی ہو گا تو نبی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب اگر یہ کہو کہ نبی کی ہمیں ضرورت نہیں۔ پرواہ نہیں نہ سہی مگر انسانیت کی تو پرواہ ہے۔ انسان مجبور ہو جائیگا۔ انسانیت سے خارج ہو جائیگا۔ مجبورین میں شامل ہو جائیگا۔ اگر اس کیلئے تیار ہیں اور بعض لوگ اس کیلئے تیار تھے۔ تب ہی تو اس نے کہا وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (الانعام-۹۱) اللہ کی جیسے قدر کرنی چاہیئے تھی نہیں کی یعنی ان کو اللہ نے انسان بنایا اور وہ چاہتے تھے کہ مجبورین جائیں۔ کیسا بیّن حربہ ہے۔ ان جہنم کانت مرصادًا

للطّٰغِین مَآبًا۔ معاذاللہ جو لوگ سرکش ہیں اور حد سے گذر گئے ہیں خالق کی طرف سے بھی اور مخلوق کی طرف سے بھی یعنی نظام عالم تباہ کیا۔ بداعمالی کر کے۔ اور الوہیت کو تباہ کیا انکار کر کے۔ مآب۔ ٹھکانہ ان کا جہنم ہے لٰبِثِینَ فیھا احقابا: احقاب جمع حقب کی معنی قرن۔ قرنوں، اس میں رہیں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ قرن کی عمر ۸۰ سال کی۔ ہر سال کے ہزار دن اور ہر دن ہزار سال کا لاکھوں برس ہو گئے۔ مگر تعداد محدود ہی رہے گی۔ جن لوگوں نے کہا ہے کہ عذاب منقطع ہو جائے گا۔ انھوں نے اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے۔ لٰبِثِینَ فیھا احقابا قرنوں جہنم میں رہیں گے۔ یہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شاید عذاب کٹ جائے۔ یُرِیدون ان یخرجوا من النار وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں۔ وما ھم بخارجین منھا مگر وہ اس میں سے نکل نہ سکیں گے۔ (مائدہ - ۱۷) کلما ارادوا ان یخرجوا منھا اعیدوا فیھا جب وہ وہاں سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں ڈھکیل دیئے جائیں گے۔ (سجدہ - ۲۰) یہ منطوق ہے وہ مفہوم ہے۔ ظاہر ہے۔ عذاب ہمیشہ رہے گا مفہوم سے منطوق بہتر ہے۔ ہاتھ اٹھا کر منہ تک لائیں تو یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ پانی مانگا اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ جمائی آئی۔ اس لئے منہ پر رکھا۔ لیکن اگر کہا جائے کہ پانی لاؤ تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ یہ اشارہ سے زیادہ قوی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ہے کہ ہمیشہ رہیں گے اور آیات ہیں۔ فاما الذین شقوا ففی النار۔ خالدین فیھا ما دامت السموات و الارض الا ما شاء ربک جو لوگ شقی ہیں وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے مگر جب (ہود - ۱۰۶ - ۱۰۷) تیرا رب چاہے۔ جب تک آسمان وزمین رہیں گے۔ آسمان وزمین کی عمر متناہی ہے تو جہنم کی عمر بھی متناہی ہو گی۔ پھر استثناء کیا کہ اس وقت تک رہیں گے جب

تک خدا کی مشیت نہ ہو جب خدا کی مشیت ہوگی۔ تو وہ جلد نکل آئیں گے۔ تو مفسرین نے کچھ باتیں بیان کی ہیں مگر وہ صحیح جواب نہیں ہے۔ صحیح جواب یہ ہے۔ فاما الذین شقوا ففی النار شقی لوگ جہنم میں رہیں گے۔ واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیہا ما دامت السموٰت والارض اور متقی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اسی میں رہیں گے۔ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ (ہود۔ ۱۰۸) تو یہ تشبیہ ہے۔ زمین و آسمان کی لا انتہا سے جیسے عرضہا کعرض السماء والارض جنت کا عرض آسمان و زمین جتنا ہے۔ ہمارے خیال میں جو بڑی سے بڑی چیز ہے۔ (حدید۔ ۲۱) وہ آسمان و زمین ہے۔ اس لئے ہمارے خیال کے مطابق تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ کامل کو ناقص کے ساتھ دی ہے۔ عام طور پر ناقص کو کامل کے ساتھ دی جاتی ہے۔ جیسے فلاں آدمی شیر ہے۔ شیر میں بہادری زیادہ ہے آدمی میں کم تو کم کو بڑھتی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اتنی بڑی کوئی چیز ہے ہی نہیں اس لئے کامل کو ناقص سے تشبیہ دے دی۔ جنت بڑی تھی اس کو زمین سے تشبیہ دے دی۔ اس کے عرض کی تشبیہ دے دی اور طول کا کوئی اندازہ نہیں۔ کیونکہ طول عرض سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جب عرض آسمان زمین جتنا ہے تو طول کتنا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ مبالغہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ تشبیہ کامل بالناقص ہے۔ یہ کسی مفسر نے نہیں کہا۔ واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیہا تو اب آیت کے معنی ہوئے کہ نیک بخت لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور جب اللہ تعالےٰ چاہے گا، تو جنت سے ان سعیدوں کو جنت کی نعمتوں سے دور کر دے گا۔ اور اپنے دیدار میں مصروف کر دے گا۔ کیونکہ دیدار ہر وقت

نہیں ہوگا. فاما الذین شقوا ففی النار اور شقی جہنم میں رہیں گے۔ الا ما شاء ربك
مگر جن کو خدا تیرا چاہے گا. نکال لے گا شقی شامل ہے۔ کافر اور فاسق دونوں
کو۔ تو تیرا رب جب چاہے گا. فاسقوں کو جہنم سے نکال دے گا. مولوی شبلی کے
شاگرد تھے سلیمان ندوی تو ایک امداد صابری تھا. وہ ان کا رد کیا کرتا تھا. تو
وہ رد ناصر جلالی کے بھائی سے کرایا کرتا تھا. وہ مجھ سے لکھوا کر لے جایا کرتا تھا۔
انھوں نے لکھ دیا تھا کہ جہنم ختم ہو جائے گا. یہ ہے وہ ہے. یہ اصل میں ابوالہذیل
علاف ایک شخص ہے. ایک جہم ابن صفوان ہے متقدمین میں سے انہوں نے
یہ کہا ہے کہ جہنم ختم ہو جائے گا. اور ان کی بنیاد عقلی علم پر ہے. تو یا تو ان کے
تتبع میں انھوں نے کہہ دیا یا یہ کہ روشن خیالی جیسے کہ آج کل انگریزی پڑھے
لکھے آجکل کچھ کہنے لگے تو اسکو روشن خیال کہنے لگے۔ جیسے کہ عذاب ختم ہو جائیگا۔ اسلئے
کہ جیسے ایک زمانہ تھا جبکہ اللہ ہی اللہ تھا اور کوئی شے نہیں تھی۔ اسی طرح ایک وقت
آئیگا کہ اللہ ہی اللہ ہوگا اور کوئی شے نہیں ہوگی۔ اس پر قیاس کیا۔ یا اس پر قیاس کیا کہ
جس طرح لامتناہی مستقبل میں باطل ہے۔ مگر یہ بات کہ لامتناہی . . . . . .

ماضی میں باطل ہے۔ اسی طرح مستقبل میں باطل ہے. یہ غلط ہے۔ اس لئے
کہ لامتناہی ماضی میں جو ہے. وہ متحقق ہو چکی اور مستقبل میں جو ہے وہ نہیں ہوئی
جتنی متحقق ہوگی وہ متناہی رہے گی. جب تک بھی رہے. ہر روز پیدا ہو کر بھی
متناہی ہے۔ اور ماضی میں لامتناہی جو فرض کی جائے گی. وہ متحقق ہو چکی۔ وہاں
دلائل جو جاری ہوں گے۔ اس کو باطل کر دیں گے. لیکن یہاں تو متحقق ہی نہیں
ہوتی۔ اسے لامتناہی لاتقفی کہتے ہیں اور وہ "لامتناہی کونی" کہتے ہیں جیسے عدد

۱، ۲، ۳ ..... سنکھ در سنکھ وہ جہاں تک بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ محدود ہی رہے گا۔ اس کے معنی یہ کہ کسی حد پر نہیں ٹھہرتا۔ تو یہ اس سے غلطی ہوئی ہے۔ موقع نہیں ہے ورنہ تفصیل سے بیان کر دیتا۔ لایذوقون فیھا برداً ولا شراباً نہ ان کو ٹھنڈی ہوا لگے گی نہ ٹھنڈا پانی ملے گا۔ معاذ اللہ، اللہ آپ کو اور مجھ کو سب کو بچائے۔ الا حمیماً و غساقاً۔ بہت زیادہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ و لہو کا پانی بس یہ دو چیزیں ملیں گی "جزاءً وفاقاً" یہی ان کی پوری پوری جزا ہے۔ ان کی بدعمالی کے بالکل مطابق ہے۔ یہ بڑا مشکل اور سخت مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رکھے آپ غور کریں کہ ایک لحظہ کفر کر کے لا انتہا اتنا سخت اور ابدی عذاب ہو یہ عقل میں نہیں آتا۔ اصل کفر تو وہ ہے جو آخر منٹ میں کرے۔ اور اس کے بعد مر جائے۔ چلیے ساری عمر بھی لگا لیجئے؛ ۶۰، ۶۵ حد ۱۰۰ برس کا کفر بھی کیونکر لا انتہا سزا کے موافق ہوگی۔ یہ ہے دقت اہل سنت والجماعت علماء نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فعل ہے۔ اس سے یہ سوال نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ جو چاہے سو کرے وہ سولہ آنے مالک اور قادر ہے۔ یہ بات بالکل حق ہے۔ وہ جو کچھ کرے وہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ اصول یہ ہے کہ ٹھیک وہی ہے۔ جو وہ کرے وہ ٹھیک نہیں کرتا بلکہ جو وہ کرتا ہے، وہی "ٹھیک" ہے۔ کیونکہ اگر وہ ٹھیک کام کرے کام کرے گا تو کام کرنے سے پہلے ٹھیک کا تحقق ہو جائے گا۔ حالانکہ ٹھیک تو بعد میں نکلا ہے۔ اس کے کرنے سے یعنی جو وہ کرتا ہے۔ اسی کو ٹھیک کہتے ہیں۔ اب ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ وہ میں بتاتا ہوں۔ اس سے کچھ تقویت ملے گی اگر اللہ تعالیٰ فضل کرے گا۔ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک خالق ہے ایک مخلوق

ایک مالک ہے ایک مملوک مثلاً ایک بادشاہ ہے۔ ایک اس کی ذات ہے۔ اور ایک اس کی ملکیت۔ زر و جواہر، قلعہ ساز و سامان مملکت وغیرہ ہیں۔ تو اگر کوئی شخص اس کی ملکیت کو تباہ کر دے تو ہے یہ بری بات۔ ناگوار اس کو ہوگا مگر اس کے مقابلے میں کوئی خود بادشاہ کو تباہ کر دے۔ تو اس کو زیادہ ناگوار ہوگا یہ تو کھلی ہوئی چیز ہے۔ یعنی بادشاہ کی ذات کو نقصان پہنچ جانا۔ اس کی ساری بادشاہت تباہ ہونے سے بھی زیادہ برا ہے۔ تو کفر اور فسق میں فرق یہ ہے کہ کفر تو خالق کو تباہ کرنے کا فیصلہ ہے۔ خالق کا انکار کر دیا۔ "اذ نسویکم برب العالمین" (شعراء ۹۸) اے بتو تم کو اللہ رب العالمین کے برابر قرار دے دیا ہم بڑی بھول میں تھے یعنی کفر کی ایک قسم تو یہ ہے کہ اللہ کا انکار کر دے۔ جیسے دہریہ۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اس کا اقرار کرے مگر اس کو قادر نہ مانے۔ تو اب بادشاہ سے یہ کہہ دے کہ تو اپاہج ہے۔ میرا کر کیا سکتا ہے۔ یہ بھی اس کو ناگوار ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ اس کا انکار کر دے کہ میں تجھے بادشاہ ہی نہیں مانتا۔ یہ بہت زیادہ ناگوار ہوگا۔ پھر تو بادشاہ سہی مگر کسی قابل نہیں تو برا مانے گا۔ اور وہ اپنا آدمی بھیجے بلانے کے لئے اس سے کہہ دے کہ میں اس کو نہیں مانتا میں نہیں جاتا۔ تو اس کے رسول کا انکار وہ بھی کفر۔ وہ اعلان کرے تو وہ کہے کہ میں اعلان کو بھی نہیں مانتا تو جتنے قسم کے کفر ہیں۔ براہ راست خدا کی تباہیت پر دلالت کر رہے ہیں۔ تو خدا کو کتنی اذیت پہنچی ہوگی جب انھوں نے انکار کیا۔ لمقت اللہ اکبر من مقتکم انفسکم آج جو تم جل رہے ہو پریشان ہو تمہیں خبر ہے۔ اذ تدعون

تھے۔ اس وقت مجھے کتنی اذیت ہوتی تھی غصہ آتا تھا۔ اور ناراض ہوتا تھا تو خدا کا تھوڑا سا ناراض ہو جانا بھی سارے عالم کی اذیت سے فارق ہے تو اس نے پلٹ کر جو یہ سزا دی تو درحقیقت بہت کم سزا دی۔ کیونکہ سزا پر اضافہ ہو سکتا ہے۔ مگر خدا کی اذیت پر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت بڑی ہے۔ اس کو تو کم سے کم دکھ دینا بھی بہت بڑا ہے۔ اِنَّ الذین یوذون اللہ و رسولہٗ لعنھم اللّٰہ فی الدنیا والاٰخرۃ (احزاب ۵۷) اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کو لوگ ایذا دے رہے ہیں ان پر دنیا اور عقبےٰ سب جگہ لعنت ہے۔ کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اس لئے جو سزا دی گئی ہے۔ وہ ٹھیک دی گئی ہے۔ جزاءً وفاقا اس کے معنی سمجھا رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہ بات آئی تھی جو میں نے بیان کر دی۔ اور تدارک اس کا کچھ ہو نہیں سکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ بچہ کچا پیدا ہو یا مرا ہوا تو اس کو کوئی طبیب ٹھیک نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ٹھیک ہوتا تو ماں کے پیٹ ہی میں ٹھیک ہو سکتا تھا۔ اس عالم میں اب اس بچہ کی واپسی ہو نہیں سکتی۔ تو بتاؤ کہ جو صورت تھی وہ تو وہیں بننا چاہیئے تھا۔ تو اگر کچا نکل آیا۔ تو نہ اب اس کے کوئی اعضا بن سکتے ہیں اور نہ نکلنے سے ایک بھی منٹ پہلے اگر وہ مر گیا تو اب وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کافر جو ہے وہ کچے یا مردہ بچے کے مثل ہے۔ جب اس ماں یعنی اس عالم کے پیٹ سے نکل کر جائے گا تو یا تو وہ کچے بچے کی حالت میں ہوگا یا مردہ بچے کی حالت میں ہوگا۔ اور واپسی ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ ٹھیک تو اس کو یہیں ہونا ہے۔ جس طرح چار انگلیوں کا بچہ جب تک رہے گا وہ چار انگلیوں ہی کا رہے گا۔ پانچویں انگلی [illegible]

انگلی کا رہے گا. تو کافر جب تک وہاں رہے گا. اسی حالت میں رہے گا. اس کی حالت قطعی نہیں بدلے گی. اس لیے کہ نجات کی کوئی صورت نہیں. یہ دو باتیں میرے خیال میں آئی تھیں. اللہ کو علم ہے. وہی خوب جانتا ہے. جو بات ہے اللہ تعالے گرفت نہ کرے کہیں غلط بیانی نہ ہو باقی یہ بات عقل کو لگتی ہے جس طرح یہاں واپس نہیں ہو سکتا. اسی طرح سے وہاں واپس نہیں ہو سکتا اب جس طرح بدن سے روح نکلنے کے بعد بدن بیکار ہو جاتا ہے روح سے ایمان نکل جانے کے بعد روح بے کار ہو جاتی ہے. اور جس طرح بغیر روح کے بدن جلانے اور دفن کرنے کے قابل ہے. اسی طرح روح بغیر ایمان کے جلانے اور گڑھے میں ڈالنے کے قابل ہے. دقت کونسی ہے اس کو تو جلایا ہی جائے گا. یہ دنیا برابر کہتی چلی آرہی ہے کہ وہ بڑا رحیم وکریم اور شفیق ہے. تو جس طرح یہاں رحیم وشفیق ماں باپ جلا دیتے ہیں. وہاں وہ جلا دیتا ہے. تو اللہ پاک نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا اور حق کیا.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۙ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۚ فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۚ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۙ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۙ وَكَوَاعِبَ

اب یہاں ایک یہ دِقّت ہے کہ کفر ایک لمحے کا ہے۔ اس کی سزا اس
قدر سخت اور طویل کیونکہ ساری عمر نیکی کی آخر لمحہ کفر کیا اور مرگیا۔ یا ساری عمر
بدکاری کی آخری لمحہ توبہ کی اور ایمان لے آیا اور فوراً مرگیا تو اس کی جزا و سزا
اس آخری لمحہ کے اعتبار سے ہے۔ یہ دِقّت صاف کردی گئی۔ اب اگلی آیت
میں یہ بتایا کہ یہ جزا و سزا کیوں ہے۔ یہ اپنی عمر عمل میں غافل رہا۔ اور روز جزا کے
زمانے میں ان سے غافل ہوگیا۔ اس عظیم الشان سزا کی وجہ دو بتائیں۔ ایک تو
یہ بات بتائی کہ ان کو حساب کی امید نہیں ہے۔ یہاں یہ سمجھنے کی چیز ہے کہ امید
اچھی چیز کے لئے بولا جاتا ہے اور حساب مشقت کی چیز ہے۔ ڈراوے کی چیز ہے
اس کے لئے امید کا لفظ کیوں بولا۔ انھم کانوا لا یرجون حسابا۔ تو مفسرین
نے بتایا کہ لا یرجون کے معنی لا یخافون کے ہیں۔ ان کو حساب کا ڈر نہیں تھا
یا اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کو اس کا یقین ہوتا ہے کہ ایمان کا اتنا بڑا ثواب
ہوتا ہے کہ تمام گناہوں کو ختم کرنے کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اس لئے اس کو امید
ہوتی ہے تو یہ مومن نہیں تھے۔ اس لئے ان کو امید نہیں تھی۔ مومن ہوتے تو

ان کو قطعی امید ہوتی بلکہ صحیح بات یہ ہونی چاہیئے کہ لا یرجون کے معنی
لا یتوقعون کے ہیں کہ ان کو توقع حساب کی نہیں تھی۔ یہ زیادہ واضح بات ہے
جب کسی انسان کو حساب اور جواب دہی کی توقع نہ ہوگی۔ تو وہ تمام قسم کی بداعمالیاں
کرے گا۔ اگر وہ نتیجہ اور انجام سے بے خوف ہوگا۔ تو عقیدہ کی اور عمل کی دونوں
قسم کی بداعمالی کرے گا۔ جس کو حساب کا ڈر ہوگا۔ وہ کبھی بداعمالی نہیں کرے گا۔
اتفاق سے ہو جائے ہو جائے۔ مگر وہ بداعمالی جان کر نہیں کرے گا۔ تو قوت
عملی جو بدیہی علوم سے اس کو حاصل تھی وہ بالکل کھو دی۔ زائل کر دی اور دوسری
بات یہ بتائی کہ وکذبوا بایتنا کذابا۔ اور انھوں نے ہماری تمام دلیلوں اور نشانیوں
کو بالکل جھٹلایا۔ الہیات کو، نبوت کو، معاد کو، جنت دوزخ کو سب کو جھٹلایا۔
دو خرابیاں بتائیں۔ ایک عملی خرابی اور ایک عقیدہ کی خرابی۔ اور انسان میں دو
ہی قوتیں ہیں ایک عمل کی قوت جس سے صحیح عمل کرے۔ اور ایک قوت نظری ہے
جس سے صحیح اعتقاد حاصل کرے۔ دونوں قوتوں کو انھوں نے تباہ کر دیا۔ اس
لئے اس قدر عظیم الشان عذاب میں یہ مبتلا ہوئے کیونکہ اس سے بڑی خرابی
کوئی باقی ہی نہ رہی۔ تو اللہ تعالے کی ناراضگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ یہاں ایک
نکتہ کی بات آپ سمجھ لیں کہ اگر کوئی معمولی آدمی مجھ سے ناراض ہو جائے تو مجھ کو
کچھ خیال ضرور ہوگا۔ اگر اس سے بڑا کوئی آدمی ناراض ہو جائے تو مجھے اس
سے زیادہ خیال ہوگا اور اگر کوئی بہت بڑا آدمی ناراض ہو جائے تو مجھے بہت
زیادہ خیال ہوگا۔ اسی طرح جوں جوں ناراض ہونے والے کی بڑائی بڑھتی
جائے گی۔ میرا خیال بھی بڑھتا جائے گا یہاں تک کہ [illegible]

کہ اس سے بڑا کوئی نہ ہو تو اس کی ناراضگی سے جو دکھ مجھے ہو گا۔ اس سے بڑا کوئی دکھ نہ ہو گا۔ تو ایسا بڑا جس سے بڑا کوئی نہ ہو اسی کا نام خدا ہے تو خدا کو ناراض کر دینا اس کا لازمی نتیجہ ایسا بڑا دکھ ہے جس سے بڑا کوئی دکھ نہیں اس نے جو بہتر سے بہتر چیز بنائی وہ انسان ہے اور اس نے انسانیت تباہ کر دیا۔ کوئی صانع یہ نہیں چاہتا کہ وہ اپنی صنعت کو تباہ کر دے۔ ما یفعل اللہ بعذابکم۔ اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا۔ کیا نہال ہو گا! تم کو ستا کر اس نے تو خود ہی ایسی بڑھیا چیز بنائی وہ اپنی بڑھیا چیز کو کیوں برباد کرے ان شکرتم و آمنتم اگر تم نے اس کا شکر کیا ہوتا اور ایمان لے آئے ہوتے شکر سے عملی قوت کی طرف اشارہ کیا اور ایمان سے نظری قوت کی طرف اشارہ کیا دو قوتیں رکھی تھیں۔ دونوں کارآمد ہیں۔ دونوں کو برباد کیا۔ ورنہ اسے کیا پڑی ہے جو تم کو ستائے۔ وکان اللہ شاکراً علیما۔ وہ بہت زیادہ قدر دان ہے (نساء - ۱۴۷) اگر تم نے شکر کیا تو وہ تمہاری نیک عملی کا قدر دان ہے۔ اگر ایمان لے آئے تو اس کا علم ہے۔ وکل شئ احصینٰہ کتٰباً اور ہر شے کو ہم نے گھیر لیا ہے۔ کتاب میں مفسرین یہ کہتے ہیں کہ کتابت اور احصٰے دونوں کے ایک معنیٰ ہیں یعنی کل شئ کتبناہ کتاباً اور کل شئ احصیناہ کتاباً دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ ان کا خیال صحیح اور حق ہے۔ لیکن زیادہ واضح بات یہ ہے کہ ہر شے کو ہم نے گھیر لیا ہے۔ کتاب میں یعنی جتنی چیزیں ہیں وہ کتاب میں مندرج ہیں۔ ان اول ما خلق اللہ القلم (ابن کثیر جلد ۳ صفحہ) پہلے اللہ نے قلم پیدا کیا۔ پھر کہا اکتب لکھ کہا ما اکتب میں کیا لکھوں قال کل شئ

تک تمام اشیاء کو لکھ دیا۔ تو اس نے لکھ دیا۔ تو یہ کتابت کا سلسلہ ظاہری فہم کے مطابق ہے۔ عوام کو سمجھانے کے لئے ورنہ کتابت زائل ہوسکتی ہے اور علم الہیٰ زائل ہو نہیں سکتا۔ تو علم الہیٰ کو کتابت سے تعبیر کرنا۔ افہام ظاہر کے مطابق ہے حقیقت نہیں ہے۔ اللہ کا علم تو ناقابل زوال ہے اور کتابت میں جو شے آجائے گی۔ وہ کچھ دن باقی رہے گی۔ یا ہمیشہ محفوظ رہے۔ لیکن ممکن الزوال ہے علم الہیٰ مکتوب نہیں ہونا چاہیئے۔ تو پھر تفسیر کیا ہوگی۔ ہر شے کو کتاب میں لکھ دیا اور ان لکھی ہوئی چیزوں کو علم الہیٰ نے گھیر لیا۔ یعنی ہر شے کو لوح محفوظ میں لکھتے ہوئے گھیرا ہے۔ یہ تفسیر زیادہ واضح اور اچھی ہے۔ یہ گھیراؤ ایسا نہیں ہے۔ جیسا گھیراؤ انسانی علم میں ہے۔ کیونکہ انسانی علم میں احاطہ اور احصار کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ انسانی علم میں جو گھیرنے والی چیز ہے۔ وہ صرف دائرہ ہے اور دائرہ ایسی چیز ہے کہ اس کو قطر سے تقریباً تین گنا زیادتی کی نسبت ہے اور جس شے میں نسبت عددی جاری ہو وہ محدود ہوتی ہے تو اگر علم الہیٰ کسی شے کو دائرہ کی شکل میں گھیرے گا۔ تو یہ اس شے کا جس کو اس نے گھیرا ہے۔ اس کا تین گنا ہوگا۔ اور جو شے کسی شے سے تگنی ہو وہ محدود ہے۔ تو علم الہیٰ محدود ہو جائے گا۔ تو اس نے اس طرح نہیں گھیرا ہے جس طرح شیر کو گڑھے میں گھیر لیا جاتا ہے یا کھیت کو یا جانوروں کو رسی سے گھیر لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ گھیراؤ ایسا ہے کہ اس سے بچ نکلنے کی صورت ممکن ہے اور اللہ تعالےٰ کا گھیراؤ ایسا نہیں ہے کہ اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ہو۔ لہذا اللہ تعالےٰ

[illegible]

مگر چونکہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ اس کی طرف اشارہ کرکے بتایا جائے کہ ایسا ہے۔ لیس کمثلہ شئ۔ اس کے لئے مثل یعنی مثال نہیں ہے۔ جیسے کسی کو یہ بتانا ہے کہ شیر کیسا ہوتا ہے۔ (شوریٰ-۱۱) تو اس سے کہا جائے گا کہ بلی کو گدھے کے برابر تصور کرو بس یہی شیر ہے یا چھپکلی کو ۱۴، ۱۵ فٹ کا تصور کرو بس یہی مگرمچھ ہے تو شیر اور مگرمچھ سمجھ میں آجائے گا۔ تو ایسی کوئی مثال اللہ کے احاطے کی، اس کی صفت کی اس کی ذات کی اس کائنات میں ایسی نہیں ہے کہ اس کو پیش کیا جاسکے کہ وہ ایسا ہے۔ تو صحیح مثال تو ہے نہیں لیکن خارجی عوارض میں کچھ مناسبت ہے۔ اس کا نام مثل ہے تو اللہ کے لئے مثل اور مثال نہیں ہے مثل ہے۔ وللہ المثل الاعلیٰ اس کے لئے مثل اعلیٰ ہے۔ یہ مثل اعلیٰ کیا چیز ہے۔ وہ میں آپ (نحل-۶۰) کو سمجھا دوں۔ ایسا احاطہ جس سے نکل ہی نہیں سکتا۔ آپ خیال میں اپنے ایک انسان پیدا کریں فوراً پیدا ہو جائے گا۔ اس کو الٹا چلائیں چلنے لگے گا۔ اس کو اتنا تیز دوڑائیں کہ پہیوں والا بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکے۔ وہ دوڑے گا۔ اس کو مار ڈالیں فوراً مر جائے گا۔ پھر اس کو زندہ کرکے دوڑا دیں وہ پھر زندہ ہو کر دوڑنے لگے گا۔ یہ سب آپ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اگر کچھ کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ الا یہ کہ آپ خود یہ چاہیں کہ وہ کرے۔ مگر آپ کے احاطے سے وہ ہرگز نہیں نکل سکتا۔ بس اللہ کے احاطہ کی یہی مثل اعلیٰ ہے اور آپکا تخیل آپ سے اتنا کمزور نہیں ہے جتنا خدا تخیل خدا سے کمزور ہے۔ تو جب آپکی مخلوق آپکے احاطہ سے نہیں نکل سکتی تو بھلا اللہ کی مخلوق اس کے احاطہ سے کیونکر نکل سکتی ہے۔ اللہ پاک کی قدرت اور مشیت ایسی نہیں ہے جیسی ہماری،

نہ ہو اس وقت تک فعل کو کر بھی نہیں سکتا اور فعل کو ترک بھی نہیں کر سکتا یعنی انسان کو جب تک کسی فعل کا انجام اچھا نہ معلوم ہو اس فعل کو نہیں کرے گا۔ اور جب تک انجام کا برا ہونا معلوم نہ ہو۔ اس کو ترک نہیں کرے گا۔ تو اللہ کا فعل ایسا نہیں ہے کہ اس کے انجام پر نظر ہو۔ وہ حسن و قبح کا خالق ہے۔ اس کے فعل کے لیے حسن و قبح کی ضرورت نہیں اور نہ وہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فعل اچھا ہے یا برا ہے۔ وہاں یہ تشقیق ہی صحیح نہیں ہے۔ ہم جو فعل کریں گے۔ وہ اچھا یا برا ہوگا۔ اس کے فعل کے لیے حسن و قبح کی ضرورت نہیں وہ اس سے پاک ہے۔ وہاں یہ سوال ہی نہیں ہوگا۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا۔ وہاں محض مشیت ہے۔ اس کی مثل ایسی ہے کہ ایک خالی الذہن آدمی بلا کسی وجہ کے اِدھر اُدھر دیکھے۔ کوئی مقصد کوئی سبب اس کے اِدھر یا اُدھر دیکھنے کا نہیں ہے۔ یہ مثال نہیں ہے۔ صرف مثل اعلیٰ ہے خالص مشیت ہے کسی شے کو پیدا کرنے کے لئے صرف نفس مشیت کافی ہے کسی مادہ کسی آلہ کسی اوزار اور زمان و مکان کی کسی چیز کی ضرورت نہیں اس کے لئے میں نے ایک مثال گھڑی ہے۔ جو پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ مگر چونکہ یہاں ضرورت ہے اس لئے یہاں بھی بیان کرتا ہوں۔ انسان اپنے تخیل پر سو لہ آنے قادر ہے۔ تمام قسم کی تصاویر اور صورتیں اس کے خیال میں آتی ہیں۔ ان صورتوں کو بدل ڈالیں الٹا کر دیں یعنی سر اوپر اور پاؤں نیچے۔ اس کو الٹ دیں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر دیں۔ اس پر قادر ہیں کہ نہیں اور آدمی پاؤں سے چلتا ہے آپ اس کو سر سے چلا دیں اور سر سے چلنے والے کو پاؤں سے چلنے والے سے زیادہ تیز بھی دوڑا سکتے ہیں۔ مجرد اپنی مشیت سے دوڑا سکتے ہیں

اس میں شعور پیدا کر دیں کہ بغیر آنکھ کے دیکھ لے۔ یہ مثل اعلیٰ ہے۔ اس سے زیادہ واضح ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تصورات جو ہیں کہ جو چاہیں آپ پیدا کر دیں اور جو چاہیں مٹا دیں یک آن لاکھوں آدمی آپ پیدا کر دیں۔ پیدا ہو جائیں گے یا نہیں۔ اب آپ کا یہ تخیل آپ سے اتنا کمزور نہیں ہے۔ جتنا آپ اپنے رب سے کمزور ہیں۔ لاکھوں آدمیوں شہ سواروں کی قطاریں دوڑ رہی ہیں۔ یہ آپ کے تخیل سے باہر کہیں جا سکتی ہیں؟ نہیں جا سکتیں۔ تو کیا احاطہ آپ نے کیا۔ یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا ؕ لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ (رحمٰن ۳۳) اے جن و انس اگر تم نکل سکتے ہو ہمارے احاطے سے تو نکل کر دکھاؤ۔ نہیں نکل سکتے۔ یہ بالکل اسی طرح جس طرح تمہاری مخلوق تمہارے تخیل سے نہیں نکل سکتی۔ اللہ معاف کرے سمجھانے کے لئے مثال گھڑی ہے۔ کوئی بات ایسی نہ ہو کہ اللہ ناراض ہو جائے۔ اب اس بات کو فلسفیانہ طریقہ پر سمجھیں کہ تاثیر ایسی نہیں ہے جو اثر سے جدا ہو۔ کیونکہ اثر کے مٹتے ہی تاثیر ختم ہو جائے گی۔ آگ سے حرارت جدا ہو جائے۔ تو راکھ ہو جائے گی سورج سے روشنی ہٹ جائے تو توا بن جائے گا۔ تو آگ نے حرارت کو اور سورج نے روشنی کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ وہ اس کے احاطے سے نکل نہیں سکتے۔ وہ حسی گھیرا نہیں ہے۔ لوگوں کو سمجھانے کے لئے ایسی بات کہہ دیتے ہیں۔ جیسے اھدنا الصراط المستقیم سیدھی راہ دکھا ہم کو (فاتحہ ۶)۔ تو سیدھی راہ تو یہ سیدھا راستہ حسی نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات سیدھا راستہ محال بھی ہوتا ہے اور اتنا دشوار ہوتا ہے کہ جان لیوا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کنواں ہے۔ اس کو اگر عبور کرنا چاہے۔ سیدھے راستے سے تو اس میں گر جائے گا۔ اور ہلاک ہو جائے گا۔ اور کنارے کنارے گھوم کر جائے گا۔ تو آسانی

سے گذر جائے گا۔ اور سلامت رہے گا۔ تو صراط مستقیم سے سیدھا راستہ مراد نہیں ہے جب موقع ہوگا تو سمجھا دوں گا۔ اللہ پاک نے سمجھانے کا ایسا عوامی طریقہ اختیار کیا ہے کہ کسی کو عذر کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ اگر صاحب عقل ہی کو سمجھانے کا طریقہ استعمال کرنا تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بہت بڑی تعداد کم عقلوں کی ہے۔ ان کو یہ عذر رہتا کہ ہم تو کم عقل تھے۔ ہم سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حسی مثالوں سے سمجھایا اور بعض لوگوں کو اس میں دھوکہ لگ گیا وہ سمجھنے لگے کہ اللہ کے جسم ہے۔ تو وہاں نبیؐ نے دلیل سے سمجھایا۔ فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا (نبا ۳۰) جب میری دی ہوئی بہترین صلاحیتوں کو برباد کر دیا تو اب چکھو عذاب کو اور میں عذاب ہی کا اضافہ کرتا رہوں گا۔ عذاب ہی عذاب ہوگا۔ اللہ آپ کو اور مجھے محفوظ رکھے۔ ہر صحت میں مرض اور ہر حیات میں موت مضمر ہے اور مضمر نہ ہوتی تو ہمیشہ تندرست رہتا اور کبھی نہ مرتا۔ ہر وجود میں عدم مضمر ہے۔ بلکہ عدم کو سنوار کر وجود بنایا گیا ہے حقیقت میں وجود ہی نہیں ہے "زُیِّنَ" زینت دی۔ عدم کو سنوارا، مرض کو سنوار کر صحت کو بنایا۔ ابھی آپ صحتمند بیٹھے ہیں۔ ابھی نزلہ ہو جائے۔ وہ پھیپھڑے پر گرے نمونیہ ہو جائے، معاذ اللہ ۲ منٹ میں ختم بعض وقت دو منٹ میں مر جاتا ہے۔ نزلہ گرا پھیپھڑوں میں بلغم بھرا سانس گھٹا اور گھٹتے ہی مر گیا۔ نوجوان طاقتور آدمی کا یہ حال ہے۔ اس میں طاقت کا بھی کام نہیں۔ یہ باریک بحثیں ہیں کسی وقت بتاؤں گا۔ ہر علم میں جہل مضمر ہے۔ لہٰذا علم پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے۔ بڑا دھوکہ لگا ہے۔ علماء کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو علم ہے۔ علم ولم کچھ نہیں ہے ہاں علم تو بس اتنا ہی ہے جتنا اس نے چاہا۔ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ (بقرہ ۲۵۵) اس کے پیدا کیے ہوئے علم میں سے ذرہ برابر احاطہ نہیں کر سکتے۔ الا بما شاء سوائے اس کے جتنا وہ چاہے

اس کے علم کو تو جان ہی نہیں سکتے۔ اس کے پیدا کیے ہوئے علم میں سے بھی صرف
اس قدر جان سکتے ہیں جتنا اس نے چاہا انبیاء علیہم السلام کو بتا دیا اور انھوں نے قوم
کو بتایا اور انسان نے اپنی عقل سے جو علم حاصل کیا ہے۔ وہ دھوکے میں ہے مغالطہ
ہے۔ وہ علم نہیں ہے۔ ہر علم میں جہل مضمر ہے۔ ایک منٹ میں انقلاب ہو جاتا ہے۔
یہاں ایک باریک بحث ہے میں بیان کرتا ہوں اور کوشش سمجھانے کی کرتا ہوں
کہ یہاں جو استحقاق ہے۔ عذاب کی زیادتی کا۔ کہ روزانہ زیادتی بڑھتی چلی جائے گی۔
اور کسی حد پر نہیں ٹھہرے گی۔ بڑے خطرے کا مقام ہے دعا کریں کہ اللہ پاک سب
مسلمانوں کو بچائے۔ یہ کافر لوگ اس زیادتی عذاب کے مستحق تھے یا مستحق نہیں تھے یعنی عذاب کے تو
وہ مستحق تھے مگر یہ روزانہ جو اضافہ ہوگا اس کے وہ مستحق تھے یا نہیں۔ کلما ارادوا ان یخرجوا منھا
جب وہ اس عذاب سے نکلنا چاہیں گے۔ اعیدوا فیھا پھر ان کو لوٹا دیا جائے گا۔
بدلنٰھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب (النساء-۵۶) یہ کھال جل جائے گی۔ (سجدہ-۲۰) تو اس جلد کو
بدل دیا جائے گا۔ تاکہ عذاب کو چکھیں۔ کوہ احد کے برابر کافر کی ڈاڑھ ہوگی جب
اس میں درد ہوگا معاذ اللہ۔ اس تکلیف کا انداز نہیں کر سکتے۔ نہ اس کی نعمتوں
کا انداز ہو سکتا ہے۔ نہ اس کے عذاب کا نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم (حجر-۴۹) میرے
بندوں کو آگاہ کر دے کہ میں بے شک بڑا درگذر کرنے والا اور بہت مہربان ہوں
وان عذابی ھو العذاب الالیم (حجر-۵۰) اور میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے
دونوں ہی باتیں ہیں تو اب اس زیادتی کا جو استحقاق ہے۔ اس کے کافر یا تو مستحق
تھے۔ یا وہ مستحق نہیں تھے۔ اگر وہ مستحق تھے تو یہ جو پہلے عذاب کم دیا پھر زیادہ دیا کچھ

اور زیادہ دیا پھر اور زیادہ تو شروع میں جو کم عذاب دیا اور کم عذاب پر اکتفا
کیا تو عذاب دینے والے نے گویا اپنا عذاب دینے کا حق چھوڑ دیا اور کریم اور
رحیم اپنا حق اگر چھوڑ دے تو کچھ حرج نہیں مگر رحیم کی شان کے خلاف ہے کہ
اپنا حق چھوڑ دینے کے بعد دوبارہ لوٹے۔ اور اگر وہ مستحق زیادتی عذاب کے نہیں
تھے تو اب ان کو زیادہ عذاب دینا ظلم ہے۔ تو دونوں باتیں عقل میں نہیں
آتیں تو ہمارے یہاں کے جو اعلیٰ قسم کے بڑے بڑے علماء ہیں۔ انھوں نے یہ
جواب دیا کہ یہ اس کا فعل ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے۔ اس سے یہ سوال نہیں ہو سکتا
کہ یہ کیوں کیا اور یہ جواب حق ہے۔ اس کو سولہ آنے اختیار ہے جو چاہے سو کرے
ایک تو کفر کا عذاب ہے کہ دوام کی وجہ سے زیادتی ہوگی اور چونکہ عذاب ابدی ہے
تو عذاب لاانتہا جائے گا۔ اس لئے وہ زیادتی بھی لاانتہا جائے گی مگر یہ بات
نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اس زیادتی کے مستحق ہیں کیونکہ جس طرح یہ لاانتہا
مدت کے مستحق ہیں۔ اسی طرح یہ لاانتہا مقدار کے مستحق ہیں۔ اور جس طرح مدت
ایک دن دو دن سے ہو رہی ہے۔ پوری مدت اول وقت میں نہیں آئی اسی
طرح پوری مقدار اول وقت میں نہیں آئی۔ یہ جواب مجھ سے پہلے کسی نے نہیں
دیا۔ اللہ پاک آپ کو اور مجھے عذاب سے اور عذاب کی زیادتی سے بچائے۔
بلکہ جو غیر حاضر مسلمان ہیں سب پر رحم فرمائے۔ ان للمتقین مفازاً حدائقہ
واعنابا وکواعب اترابا دکاسا دھاقا۔ اللہ پاک کی یہ عادت ہے کہ جہاں
عذاب کا ذکر کرتا ہے۔ وہاں اپنی رحمت کا بھی ذکر فرماتا ہے۔ اب متقیوں کا ذکر
کرتا ہے متقی کے معنی بتا چکا ہوں۔ صحیح معنی وہ ہیں جو اللہ پاک نے بتائے

ان اولیاءہ الا المتقون۔ اولیاء اللہ کون ہیں جو متقی ہیں ہٗ کی ضمیر اللہ کی طرف (الانفال-۳۴)
پھر رہی ہے۔ جو متقی ہے۔ وہی اللہ کا ولی ہے۔ اور یہ ولایت جو ارباب باطن
کے یہاں ہے یہ دوسری چیز ہے۔ وہ دوسری اصطلاح ہے۔ ان کے یہاں ولی
کے معنی کچھ اور ہیں۔ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون تمہیں معلوم
ہونا چاہئے کہ اولیاء کو نہ آنے والی مصیبتوں کا خوف ہوتا ہے۔ نہ گذری ہوئی (یونس-۶۲)
مصیبتوں کا رنج ہوتا ہے۔ وہ کون ہیں۔ الذین اٰمنوا وکانوا یتقون۔ یہ وہ لوگ
ہیں جو ایمان لے آئے اور متقی ہیں اب متقی کون ہیں۔ ھدی للمتقین۔ ہدایت ہے (یونس-۶۳)
یہ کتاب متقیوں کی یا متقیوں کے لئے یہاں تو یہ معنی کئے تھے متقیوں کی ہدایت
یعنی اس کی ہدایت سے وہ متقی بنے۔ یہ نہیں کہ پہلے وہ متقی ہو پھر ان کے لئے
قرآن ہدایت ہو۔ بلکہ متقیوں کو جس سے اتقا حاصل ہوتی ہے وہ یہی کتاب ہے
پہلی شرط یہ ہے کہ یؤمنون بالغیب۔ غیب پر ایمان ہو۔ غیب کے کیا معنی حس
یا حاسے سے جو غائب ہو۔ یہ مفسرین کے معنی ہیں۔ میں نے اس کے یہ معنی کئے۔
یومنون بالغیب کما یومنون بالشھادۃ ان کو غائب چیز کا ایسا یقین ہونا چاہئے
جیسا ظاہر چیز کا۔ جیسے ایک انگلی کو دیکھ کر ایک کہے اور سارا عالم مل کر دو کہے
تو ہرگز نہ مانے گا۔ اسی طرح اللہ کو ایک کہے اور سارا عالم بھی کہے کہ نہیں خدا دو ہیں
تو ہرگز نہ مانے یعنی جس طرح ظاہر کا علم ہے۔ اسی طرح غائب کا علم ہو۔ یہ ہے ایمان
اور یقین۔ اصلی علم آگیا۔ یہ ارباب کشف سے بھی بڑھ گیا۔ وہ حال ہے۔ ایک
منٹ میں ہوا۔ اور زائل ہوگیا اور یقین تو ۲۴ گھنٹے رہتا ہے۔ حال اور وجد کے
معنی کیفیت غیر راسخہ۔ حال ظنی چیز ہے۔ تھوڑی دیر رہتا ہے۔ اور اگر وہ دائم

ہو جائے۔ تو وہ حالت ہے۔ پھر اس میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی۔ جیسے کسی کو کسی سے عشق ہو جائے۔ تو وہ حالت زائل ہو سکتی ہے۔ مگر اولاد سے محبت ہے اس میں جنوں ونوں کچھ نہیں وہ ایسی جاگزیں ہوگئی ہے کہ وہ حالت بن گئی ہے وہ کسی وقت زائل نہیں ہوتی۔ دونوں کا فرق سمجھ میں آگیا کہ عشق کی محبت حال ہے اور بیٹے کی محبت یہ حالت ہے۔ وہ ممکن الزوال ہے اور یہ کبھی نہ جائے گا۔ ہمارا مالدار عزیز تھا۔ اس کے تین لڑکے تھے۔ وہ ان سے بہت ناراض تھا۔ جب مرنے وقت اس سے پوچھا کہ ترکہ کا کیا کریں کس کو دیں تو مرتے وقت یہی کہنے لگا کہ انہیں تینوں کو۔ تو برے سے برا بیٹا بھی ہوتا ہے تو اس کے ساتھ محبت باقی رہتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اچھے کے مقابلے میں برے سے محبت زیادہ ہوتی ہے میں نے اس مضمون کو بہت اچھی طرح سمجھا ہے اور اسی لئے میں نے کہا ہے کہ رسول اللہ کو اپنے امتی سے اتنی محبت ہے کہ خود امتی کو اپنے آپ سے اتنی محبت نہیں۔ آپ کو بروں سے محبت ہے۔ آپ شفیع المذنبین ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ بیان کی۔ بڑی اچھی دلیل ہے جو اللہ پاک نے مجھے سمجھائی کہ اگر ہاتھ کی انگلی میں زخم ہو اور اس پر کوئی چوٹ مارے تو فوراً اچھا ہاتھ اس کو بچانے کے لئے آگے کر دے گا اور زخمی انگلی کو بچائے گا۔ برے عضو کی خاطر اچھے کو نثار کر دیتا ہے حسی تجربہ ہے۔ تو متقی کے معنی آپ کے سمجھ میں آ گئے۔ یؤمنون بالغیب حاسہ سے غائب اشیاء پر ایمان جنت دوزخ وغیرہ سب۔ دوسری شرط بتائی۔ ویقیمون الصلٰوۃ اور جو نماز کو ادا کرتے ہیں۔ قائم کرنا معنی ادا کرنا۔ یہ دوسرا فعل ہے۔ نماز جو ہے وہ جامع عبادت ہے سوائے مالی عبادت کے باقی جتنی بھی عبادتیں ہیں ان سب کا

مجموعہ نماز ہے۔ رکوع ۔ سجود ۔ احرام (تکبیر تحریمہ) درود تسبیح تہلیل ۔ دعا قرآن ۔ احرام میں تو صرف بعض چیزیں حرام ہوتی ہیں کھانا پینا ۔ ادھر ادھر دیکھنا حرام نہیں ہوتا ۔ مگر نماز میں اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا ۔ بات چیت سب حرام ہے ۔ تو یہ تکبیر تحریمہ اس احرام سے بھی زیادہ احرام ہے ۔ یہ جو دو ہاتھ اٹھاتے ہیں یہ بے اعتنائی کے ہوتے ہیں ۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ میں نے آپ کے لڑکے کو فلاں غلط جگہ شراب خانے میں دیکھا تو آپ کہیں گے کہ کیا کروں اس سے تنگ آگیا ہوں ۔ اب تو میں نے اس سے ہاتھ اٹھالیا ہے ۔ میرے سامنے اس کا ذکر بھی نہ کرو ۔ تو ہاتھ اٹھانے کے معنے ہوئے بے اعتنائی ۔ دونوں ہاتھ اٹھائے تو دنیا اور عقبیٰ دونوں جہاں سے میں نے ہاتھ اٹھالئے اور اللہ کی طرف متوجہ ہوا اللہ اکبر اللہ بڑا ہے ۔ اور یہ دونوں اصغر اور ارذل ہیں ۔ یہ معنی ہیں تکبیر تحریمہ کے ۔ بہت بڑی چیز ہے نماز ۔ اس لئے فرمایا ۔ یقیمون الصلوٰۃ سب سے بڑا ایمان یعنی ایمان بالغیب یہ جامع عبادت ہوئی ۔ وممّا رزقنٰھم ینفقون اور جو بھی کچھ ہم نے ان کو دیا ہے یہ جو من ہے یہ تسوید کا ہے ۔ (بقرہ۔۳) اس کے معنی ہے بعد ۔ جو بھی ہم نے دیا ہے اس میں سے یعنی تین وقت کے فاقہ کے بعد آدھی روٹی ملی وہ اس کو بھی پوری نہیں ہوگی ۔ مگر اس آدھی روٹی میں سے بھی ایک ٹکڑا جو اللہ کے نام پر دیتا ہے ۔ ما رزقنا ھم نہیں کہا ۔ من ما رزقنا ھم کہا ۔ اس میں سے زکوٰۃ وغیرہ کا بہاں ذکر نہیں ہے ۔ اب جو فاقوں کے بعد آدھی روٹی ملی ۔ اور اس میں سے ٹکڑا اللہ کی راہ میں دیا تو یہ دیتے ہی متقی ہوگیا ۔ اور متقی ہوتے ہی اللہ کا ولی ہوگیا ۔ ان للمتقین مفازاً ۔ مفاز جو ہے ۔ اس کے دونوں معنیٰ آتے ہیں ۔ کامیابی کا گھر یا نفس کامیابی

متقیوں کے لیے کامیابی ہے. یعنی مطلوب کا حاصل ہونا ضروری ہے. یہ طلب
نہیں ہے کہ عذاب سے رہائی ہو نہ یہ مطلب ہے کہ جنت میں پہنچ جائے. بلکہ
مطلوب جو بھی شے ہو وہ حاصل ہو جائے. کیونکہ عذاب سے بچنا اگر مقصود ہو تو
وہ تو بغیر پیدا ہوئے حاصل تھا. اگر پیدا نہ ہوتا تو عذاب جہنم سے بھی بچ جاتا. اور
دنیاوی دکھوں سے بھی بچ جاتا. تو عذاب سے بچ جانا مطلوب نہیں ہے۔
اگر جنت میں پہونچ گیا تو لازمی عذاب سے بچ گیا. اب وہ دار کامیابی کونسا
ہے. دار کامیابی حدائق. باغ و بہار و اعناب اور انگور اور کواعب اترابا.
کواعب جمع کاعب کی. کاعب اس عورت کو کہتے ہیں. جس کی چھاتی
ابھری ہوئی ہو. اتراب. ترّاب کی جمع. یعنی ہم عمر وکاساً دھاقاً

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ۝ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا كِذَّابًا ۝ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا ۝ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

تو عذاب سے بچنا مطلوب نہیں ہے۔ جو جنت میں چلا گیا وہ لازمی عذاب سے بچ گیا اور اگر عذاب سے بچنا مطلوب ہوتا تو اگر پیدا نہ ہوتا تب بھی یہ حاصل ہو جاتا یہاں کے دکھ سے بھی بچ جاتا اور عذاب جہنم سے بھی بچ جاتا۔ مطلوب مفاز ہے۔ وہ مفاز کیا ہے۔ دار فوز۔ دار کامیابی۔ وہ دار کامیابی کیا ہے حدائق۔ حدیقہ کی جمع۔ باغ و بہار اور اعناب انگور اعلیٰ قسم کے۔ وکواعب اترابا۔ کواعب۔ کعب کی جمع ہے۔ کعب اس عورت کو کہتے ہیں جس کی چھاتیاں ابھری ہوئی ہوں۔ اتراب۔ ترب کی جمع ہے۔ ہم سن۔ بڑی سن کی نہیں ہوں گی۔ وکاسا دہاقا۔ جام لبریز۔ ہمارے یہاں چھلکتا ہوا کہتے ہیں۔ صاحب ذوق سمجھتے ہیں۔ چھلکنے میں کیا ہوتا ہے۔ لا

یسمعون فیہا لغواً

اور لغو ایسے فعل کو کہتے ہیں جو نہ مفید ہو نہ اس سے نقصان ہو۔ یہاں شراب خانوں میں چلے جایئے۔ آپ بیہودہ باتیں اور لڑائی جھگڑے دیکھیں گے۔ اس کی تردید کردی کہ وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ کوئی لغویات کبھی نہیں سنیں گے۔ ولاکذابا مبالغہ کا صیغہ ہے کوئی بہت بڑا جھوٹ نہیں سنیں گے۔ یہاں یہ گمان ہوتا ہے کہ بڑا نہیں تو چھوٹا جھوٹ سنیں گے ؟ حنفی اصول ہے کہ مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے جیسے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اس سے یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ زیادہ قیمت پر بیچو۔ یہ معتبر نہیں ہے۔ لوگوں نے بہت اناپ شناپ تاویلیں کی ہیں سب غلط ہیں۔ صحیح جواب یہی ہے کہ مفہوم مخالف غیر معتبر ہے۔ محمد رسول اللہ سے یہ مفہوم نہیں ہے کہ غیر محمد غیر رسول اللہ ہو۔ یہ عقلی بحث ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں مفہوم مخالف جب معتبر ہوگا جب ایک دوسرے کی نقیض ہو یعنی دونوں جمع نہ ہوسکیں اگر کہا جائے کہ فلاں شخص زندہ ہے تو اس کا یہ مفہوم قطعی ہے کہ وہ مرا نہیں اور جہاں تناقض نہیں ہوگا وہاں کبھی مفہوم مخالف معتبر نہیں ہوگا۔ سود دوچند اور سہ چند کھاؤ۔ اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ ایک گنا یا آدھا گنا کھالو۔

جزاء من ربك عطاء حسابا

یہ جتنی نعمتیں جو اوپر بیان کی گئیں یہ کیا ہے۔ یہ تیرے رب کی طرف سے جزا ہے اور عطا ہے۔ عطا کے معنی عطیہ، مہربانی، عنایت۔ بدلہ تو استحقاق ہے اور عطیہ جو ہے وہ غیر استحقاق ہے۔ پانچ روپیہ روز پر مزدور رکھا دن بھر کام کرایا

کرائے دیدیئے۔ اور یہاں وہی شے جزا ہے اور اسی کو عطا فرمایا تو مفسرین نے یہ فرمایا کہ عمل کیا اس اعتبار سے تو جزا ہے اور عطا اس اعتبار سے ہے کہ اللہ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ عمل پر جو جزا مرتب ہوتی ہے۔ یہ عطا ہے۔ نماز پر اتنا بڑا انعام مقرر کر دیا۔ یہی اُس کی عطا ہے۔ اگر ایک دو منٹ جنت میں رکھ دیتا تب تو خیر کوئی بات تھی۔ بڑی اچھی بات ہے کہ یہ ترتب جزا جو ہے یہ عطا ہے۔ حساب کے معنی کثیر۔ عطائے کثیر۔ ربّ السمٰوٰت والارض وما بینھما۔ وہ رب کون ہے تمام آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے۔ تمام چیزوں کا مالک ہے کثرت سے مال و دولت اُس کے پاس ہے۔ وہ جتنا چاہے کثرت سے دے سکتا ہے وہ کیا ہے الرحمٰن۔ رحمت کا مبالغہ ہے کثرت سے رحم کرنے والا۔ اب غور کریں مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے یا پیدا زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر مریں زیادہ تو تھوڑے عرصے میں ایک آدمی بھی نہ رہے تو حیات زیادہ ہوئی۔ تندرست زیادہ ہیں یا بیمار۔ بھوکے زیادہ ہیں یا پیٹ بھرے۔ کھانے کی ضرورت زیادہ ہے بہ نسبت کپڑے کے۔ کوئی ننگا نظر نہیں آتا۔ تو جب کم ضرورت کی چیز زیادہ دی تو کھانا تو اس سے بھی زیادہ دے گا۔ اگر خدا کی کتاب پر غور کریں تو سب حسّی باتیں ہیں۔ یہی تو بڑی خطرناک بات ہے۔ اتنے بیّن دلائل کے بعد بھی انکار کیا جب ہی تو اُس کو غصہ آیا۔ آپ روزمرّہ کے واقعات پر غور کریں تو اتنی نعمتیں اور انعام پائیں گے کہ ان کو گن نہیں سکتے اپنی زندگی میں صحت اور بیماری کے دن شمار کیجئے تو بیماری کے دن بہت کم ہوں گے۔ اگر عوام کے فائدہ کے لئے کنواں

بچانے کے لئے کنویں کو بند کردیں تو ظلم ہوگا۔ تو یہ شر قبیل جیسے۔ اس پر خیر کثیر
موقوف ہے۔ اس لئے اس کو ایجاد کیا۔ یہ تکلیف بھی نابالغوں کو ہوتی ہے۔
دلی میں دیوالی پر بچے بندر بنایا کرتے تھے۔ ہم بھی ان کو لے آیا کرتے تھے اور بچوں
کو بہلانے کے لئے بڑا بھائی منہ پر لگا لیا کرتا تھا۔ چھوٹا بھائی اس سے ڈر کر روتا
تھا اور ماں اس کے رونے کو دیکھ کر ہنستی تھی۔ بچہ نابالغ تھا۔ روتا تھا۔ ماں
بالغ تھی ہنستی تھی۔ وہ اس کے مذاق کی چیز تھی۔ اس کے برخلاف وہ آٹا گوندھتی
ہو اور بچہ بکری کے پیچھے دوڑ رہا ہو اور ہنس رہا ہو تو وہ روئے گی اور آٹا
چھوڑ کر بھاگے گی اور پکڑے گی۔ اب اس سے پوچھو کہ وہ ہنس رہا ہے تو روتی
ہے اور جب وہ رو رہا تھا تو ہنس رہی تھی۔ اسی طرح جو لوگ معرفت میں نابالغ
ہیں وہ تکلیفوں، کساد بازاریوں کو دیکھ کر روتے ہیں، گھبراتے ہیں۔ وہ ان کی
ناسمجھی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ منہ پر سے بچا ہٹا دے گا اور اپنی اصلی
صورت دکھا دے گا۔ اور جو معرفت میں بالغ ہو چکے ہیں وہ ان دکھوں اور
تکلیفوں کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ انہیں کسی چیز کی تکلیف نہیں۔ انہیں تکلیف کے
اظہار سے تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے اگر زخم ہو جاتے تو پٹی کھول کر دکھانے میں تکلیف
ہوتی ہے۔ وہ تکلیف کا اظہار نہیں کرتے۔ تو ساری دنیا تو کھلونا ہے اور دکھ تکلیف
جو ہے وہ بچا ہے۔ اور عقلی طور پر سمجھ لیں کہ اگر دکھ بھی ہے اور سکھ بھی ہے تو
تھوڑی دیر کے بعد وہ دکھ بھی چھوٹ جائے گا۔ اور راحت بھی چھوٹ جائے گی۔
تو دکھ کا چھوٹ جانا بہ زیادہ بہتر ہے۔ سکھ کے چھوٹ جاتے ہے۔ ساری عمر راحت
میں رہا اور چھوٹ گیا [illegible]

خوش نصیب ہے۔ سارے یورپ کو چیلنج ہے۔ کافر سکھ میں ہیں۔ بہرحال سکھ چھوٹ جاتا ہے۔ مسلمان دکھ میں ہیں بہرحال دُکھ چھوٹ جاتا ہے۔ اشیاء کا حسن و قبح تو انجاموں پر ہے جس شے کا انجام اچھا ہے وہ شے اچھی ہے اور جس شے کا جس عمل کا انجام بُرا ہے وہ بُری ہے۔ اگر انجام نہ ہو تو چوری بدکاری تمام جائز ہو جائے۔ تھوڑی دیر کی لذّت کے لئے کتنی مصیبتوں میں رہنا ہے اس سے نہیں گھبرانا چاہیے۔ صبر کرنا چاہیئے اور جو طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں وہ اوراد اور وہ الفاظ کہنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ پر پُورا بھروسہ رکھنا چاہیئے اور اس سے صحیح تعلق رکھنا چاہیئے۔ رحمٰن ہے۔ مبالغہ ہے۔ بڑی رحمت ہے اس کی۔ ایک اصولی بات سمجھ لیں۔ یہاں جس شے کی زیادہ ضرورت ہے۔ اللہ پاک نے اُس کو زیادہ پیدا کیا ہے۔ دوسری شے کی پہلی سے زیادہ ضرورت تھی۔ تو دوسری شے کو پہلی شے سے زیادہ پیدا کر دیا۔ اسی طرح تیسری کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ اُس کو دوسری شے سے زیادہ پیدا کر دیا۔ رہنے کی ضرورت تھی۔ اتنی بڑی زمین پیدا کر دی۔ کھانے کی ضرورت تھی۔ کھانا زیادہ پیدا کر دیا۔ پیٹ بھرنے کی ضرورت تھی۔ انڈے کی ضرورت نہیں ہے۔ انڈا اگر ایک بھی دیا تو سب کو نہیں ملے گا۔ وہ انسان کی غذا نہیں ہے۔ غذا کے لئے باجرا اور گیہوں پیدا کیا۔ اگر انڈا غذا ہوتی تو سب کو ایک انڈا ملتا۔ سارے پاکستان کا انڈا کراچی کو بھی کافی نہیں ہوگا۔ غذا وہ شے ہے جس کو کھا کر زندہ رہے۔ پانی کی اس سے زیادہ ضرورت تھی تو کنوئیں دریا اور سمندر بنا دیئے۔

ہر جگہ پیدا کر دیا۔ لوہے تانبے کی زیادہ ضرورت تھی اس کو زیادہ پیدا کر دیا۔ سونے چاندی کی کم ضرورت تھی اس کو کم پیدا کیا۔ جواہرات کی اس سے کم ضرورت تھی اُس کو بہت تھوڑا پیدا کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جس شے کی زیادہ ضرورت تھی اُس کو زیادہ مقدار میں پیدا کیا اور جس شے کی ضرورت کم تھی اس کو کم مقدار میں پیدا کیا۔ یہ سارے عالم میں اور ہر شے میں جاری ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ یہ نعمتیں جو بکھری ہوئی ہیں بعض لوگوں کو کوشش سے ملتی ہے۔ بعض کو انتہائی کوشش کے بعد بھی نہیں ملتی اور بعض انتہائی بے وقوف لوگوں کو بغیر کوشش کے بے انتہا ملتی ہے۔ تو دراصل جو شے ہے وہ ان نعمتوں کا ہم تک پہنچنا ہے نعمتیں اتنی ضروری نہیں ہیں جتنا ان کا پہنچنا ہے نعمت کا پہنچانا یہی معنیٰ ہیں رحمت کے۔ نعمت کا پہنچانا یہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ تو رحمت کا تحقق سب سے زیادہ ہونا چاہیئے تو رحمت کل اشیاء سے سارے عالم سے زیادہ ہوئی۔ اسی لئے فرمایا وسئل اللہ من فضلہ کہ اللہ سے مال و دولت مت مانگو اس سے اس کا فضل اور اس کی رحمت طلب کرو۔ کیونکہ سب سے زیادہ (النساء-۳۲)
ضرورت رحمت کی ہے نہ کپڑے کی۔ نہ پیسے کی نہ باغ کی نہ نہر کی۔ کسی کی ضرورت اتنی نہیں ہے جتنی رحمت کی۔ جب رحمت کی ضرورت سب سے زیادہ ہے تو قانون عقل کے مطابق اس کا وجود سب سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ جب رحمت کا وجود سب سے زیادہ ہوا تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہوا۔ اسی کا نام رحمٰن ہے۔

لا یملکون منہ خطابا

باوجود اتنا بڑا رحیم ہونے کے اُس کی جلالت کا یہ عالم ہے کہ اس سے بات نہیں کر سکیں گے۔ کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اُس کے سامنے اُف بھی کر سکے۔ قہار کا لفظ لانا تو خیر قہار کے سامنے کون بول سکتا ہے۔ نہیں یہ لطیفہ ہے کہ باوجود اتنا بڑا رحمٰن ہونے کے میری جلالت کا یہ عالم ہے کہ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ آگے آتا ہے کہ روح الامین اتنے بڑے فرشتے ہیں لا یسبقونہ بالقول (انبیاء-۲۷) اس کے سامنے دم نہیں مار سکتے۔ یہ کس دن یوم یقوم الروح والملئکۃ صفا یا تو اس دن روحیں جسموں میں ڈال دی جائیں گی یا کوئی خاص قسم کی مخلوق ہوگی، روح اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ روح الامین اور فرشتے ایک صف میں کھڑے ہو جائیں گے۔

لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا۔ وہ بات نہیں کر سکیں گے سوائے اُن کے جن کو رحمٰن اجازت دے گا۔ اور سچ بات کہیں گے۔ پوری کائنات میں ایسا کوئی نہیں ہے کہ اُس کے جلال و جبروت کے سامنے اُف بھی کر سکے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝

یہ دن جس کا اوپر بیان ہوا جس دن روح اور ملائکہ صف باندھ کر کھڑے ہوں گے اور سوائے اس کے جس کو رحمٰن اجازت دے گا کوئی بات نہ کر سکے گا۔ یہ دن حق ہے۔ اس لئے جس کا دل چاہے اپنے رب کے پاس مرجع اور ٹھکانا بنا لے۔ بے شک ہم نے تم کو عذاب سے بہت زیادہ ڈرا دیا وہ عذاب جو بہت قریب اور پاس ہے۔ وہ دن جس دن سب لوگ دیکھیں گے۔ وہ سب جو اُن کے دونوں ہاتھوں نے بھیجا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے نفس مراد ہوتا ہے۔ یعنی جو عمل اُس کی ذات نے پہلے سے بھیجے ہیں۔ اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹی ہوتا۔

ذٰلک الیوم الحق۔ یہ دن حق ہے۔ حق کے متعلق علمائے کرام نے سہ باتیں فرمائی ہیں۔ ایک بات تو یہ فرمائی ہے کہ یہی دن حق ہے۔ باقی جو دن ہیں ایام دنیا یہ باطل ہیں لیکن یہ وجہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلا۔ ہم نے زمین کو اور آسمان کو باطل نہیں بنایا اور جو دن ہے وہ آسمان و زمین کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ بین السماء

والارض ہے اس لئے وہ باطل نہیں ہو سکتا۔ عدد السنین والحساب ما خلق اللہ ذلك الا بالحق۔ سالوں کو ہم نے پیدا کیا حق۔ ایام سال اور مہینہ (یونس۔۵) یہ سب حق ہیں۔ تو یہ بات کہ یہی دن حق ہے اس کے علاوہ اور کوئی دن حق نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ دوسری جماعت نے فرمایا کہ حق سے مراد وہ شے ہے جو ناقابلِ فنا اور ناقابلِ زوال ہو اور انھوں نے یہ آیت بھی پیش کی ہے۔ ذلك بان اللہ هو الحق۔ کہ اللہ حق ہے۔ اللہ کے حق ہونے کے یہ معنیٰ ہیں (لقمان۔۳۰) کہ اس کا فنا ناجائز ہے۔ وہ مٹ نہیں سکتا۔ تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس طرح ۱۲ گھنٹہ کا دن ختم ہو جاتا ہے اسی طرح بمقدارہٖ خمسین الف سنة اس کی مقدار بھی ۵۰ ہزار سال ہے۔ یہ دن بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ پچاس ہزار سال میں ختم ہوگا۔ ختم بہر حال ہوگا۔ تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ تیسری بات یہ فرمائی علماء نے کہ یہی دن اس قابل ہے کہ اس کو دن کہا جائے اور کوئی دن اس قابل نہیں۔ کیونکہ دن کے معنی یہ ہیں کہ ہر شے ظاہر ہو جائے تو اس دن تمام چیزیں ظاہر ہو جائیں گی۔ یہ ظہور کا دن ہے۔ لیکن یہ تعریف بھی زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے کہ اس دن بھی کذب ہوگا۔ واللہ ربنا ما کنا مشرکین انظر (الانعام۔۲۳) مشرک کہیں گے قسم کھا کر کہ ہم مشرک نہیں تھے۔ کیف کذبوا علی انفسھم۔ کیسا انھوں نے اپنی جانوں پر جھوٹ باندھا ہے تو اس دن بھی کذب ہوگا۔

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنه اور وہ کہتے تھے کہ ہم کو دوبارہ بھیجدے ہم نیک کام کریں گے۔ تو فرمایا کہ اگر ان کو دوبارہ بھیجدیا جائے تو پھر بدکاری کریں گے (الانعام۔۲۸) وانھم لکاذبون اور یہ جھوٹے ہیں۔ اسروا الندامة لما راوا العذاب وہ جب عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت (یونس۔۵۴)

کو چھپائیں گے تو ظہور کا اور سچا دن وہ کبھی نہ رہا کہ اس دن سچ ہی سچ ہو۔
فوقھم اللہ شر ذلک الیوم۔ اس دن کے شر سے اللہ نے بچایا ان کو
تو معلوم ہوا کہ اس دن میں شر بھی ہے۔ خیر بھی ہے۔ جس طرح دنیا کے ایام
میں شر اور خیر ہے تو اس دن کذب اور شر بھی ہوگا۔ اس لئے یہ وجہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔
چوتھی ایک جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ حق کے یہ معنی ہیں جو نا قابل شک
ہو۔ قیامت میں چونکہ شک نہیں ہے اس لئے اس کو یوم حق کہا۔ تو یہ بھی صحیح نہیں
ہے۔ اس لئے کہ ان ایام میں کس کو شک ہے بلکہ یہ زیادہ نا قابل شک ہیں۔
مومن کافر دونوں یہاں متفق ہیں آج کے یوم میں۔ یوم قیامت پر تو صرف مومن متفق ہیں۔
مومن کافر دونوں یہاں متفق ہیں۔ یعنی یہ موجود دن یوم جزا والے دن سے زیادہ
نا قابل شک ہے۔ یہ جو دن گزر رہا ہے اس میں مومن کافر ہر ایک کسی کو شک
نہیں ہے تو یہ معنی بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ میری معلومات میں صرف یہی چار باتیں ہیں
ممکن ہے کسی عالم نے کوئی اور بھی توجیہ کی ہو مگر وہ میرے علم میں نہیں ہے۔ یہ
جو چار وجہیں بیان کی گئی ہیں میرے خیال میں صحیح نہیں ہیں۔ میری تحقیق یہ ہے کہ
یہاں حق کے معنی واقع کے ہیں۔ حق اور واقع ایک چیز ہے انما توعدون
لواقع جس دن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ واقع ہے یعنی وہ ہو کے
رہے گا۔ وہ آکے رہے گا ان الساعة لاٰتیة لاریب فیھا۔ بے شک قیامت
آنے والی ہے اس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دن
آکے رہے گا۔ اس کے اور کوئی معنی نہیں ہیں۔ ذلک الیوم لواقع۔ ذلک
الیوم لاٰتی۔ یہ دن آکے رہے گا۔ اب علمی مضمون شروع ہو گیا غور کریں تو

سمجھ میں آئے گا۔ یہ اللہ پاک نے فرمادیا ذٰلك الیوم الحق ۔ یہ دن آ کے رہے گا۔ دلیل اُس کی یہ ہے۔ اور قرآن ہی کی تفسیر سب سے بہتر ہے ۔ اِنّما توعدون لواقع ۔ یعنی ان الیوم الذی توعدون لواقع ۔ وہ جس دن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ واقع ہو کر رہے گا۔ اس جہان میں جتنے بھی افعال ہو رہے ہیں۔ اُن پر غور کریں۔ انسان اور حیوان زندگی کے عبور کرنے میں مشترک ہیں۔ اس میں نہ مومن کو شبہ ہے نہ کافر کو ۔ اور مقصد ان دونوں کا زندگی میں ایک ہی ہے ۔ مذاق کا اختلاف ہو وہ اور چیز ہے وہی لذتِ اکل وشرب و وطی دونوں میں مشترک ہے ۔ فرق یہ ہے کہ انسان یہ لذات اسباب سے اور جد وجہد سے حاصل کرتا ہے اور جانور بغیر جد وجہد اور اسباب سے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ روٹی پانی کے لئے کتنی جد وجہد کرتا ہے اور جانور بغیر جد وجہد کے آسانی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ جتنے دنیا کے کاروبار ہیں سب کا مقصد انجام کھانا پینا ۔ رہنا سہنا۔ جاگنا سونا اُٹھنا بیٹھنا ہے اور انسان اس میں جانور سے متفق ،مشترک اور متحد ہے کُل کا کل ۔ کتنی سہل بات ہے معمولی سے معمولی آدمی بھی غور کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ دونوں کا مقصد زندگی عبور کرنا ہی ہے ۔ بلکہ جانوروں کے لئے اس میں سہولت ہے ۔ اور انسان کے لئے دشواریاں ہیں۔ ملازم کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں نکال نہ دیا جائے مگر جانور ملازموں کو کوئی فکر نہیں ہے ۔ دن بھر کام کرتے ہیں۔ شام کو اُن کا مالک بطور معاوضہ اُن کا کھانا اُن کو پہنچا دیتا ہے۔ بالکل صاف بات ہے ۔شبہ کی گنجائش بالکل نہیں ہے ۔ تو اگر زندگی کا مقصد صرف زندگی گذارنا ہوتا تو ان جانور کے برابر ہوتا

یا اس سے بدتر ہوتا۔ برابر تو اس لئے ہوگا کہ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کچھ اچھی غذائیں کھاتا ہے۔ تو یہ غلط ہے کیونکہ وہ مذاق کا اختلاف ہے۔ انسان کے مذاق میں جس طرح کیلے کا گودا ہے اسی طرح جانور کے مذاق میں کیلے کا چھلکا ہے۔ فرق کچھ بھی نہیں ہے۔ اونٹ کانٹے دار جھاڑی بڑے مزے سے کھا لیتا ہے۔ جیسے آپ نے گنڈیری چوس لی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُولٰئِکَ کَالانعام بل ھم اضل۔ یہ مثل جانوروں کے ہے بلکہ ان سے بھی بدتر جانوروں کی مثل اس لئے کہ دونوں کے دونوں ایک ہی پُل پر سے گذر رہے ہیں۔ زندگی کے پُل کو عبور کر رہے ہیں۔ بدتر اس لئے ہے کہ وہ ہلکے پھلکے گذر رہے ہیں۔ اور یہ اتنا عظیم انسان بھاری بوجھ عقل کا پہاڑ لاد کر گذر رہا ہے۔ اور مصیبتیں اُٹھا کر زندہ رہا۔ بہت موٹی بات ہے۔ لیکن انسان اور جانور سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسان جانور سے افضل ہے۔ اور وہ اس کو افضل نہ جانتا تو ہرگز اس کے قابو میں نہ آتا۔ اور نہ اس سے ڈرتا۔ ڈرنا اور مسخر ہو جانا اس کی دلیل ہے کہ وہ انسان کو معظم سمجھتا ہے۔ تو جانور بھی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ انسان افضل ہے۔ اور انسان تو سب متفق ہیں ہی کہ وہ افضل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وجہ فضیلت جو ہے وہ چیز کیا ہے۔ وہ انجام اور نتائج کے اعتبار سے ہے۔ اگر آئندہ زندگی نہیں ہے۔ تو انسان تمام جانوروں سے بدتر ہے لیکن انسان کا تمام جانوروں سے بدتر ہونا بالکل نامعقول ہے۔ لہٰذا اگلی زندگی کا ہونا بالکل معقول ہے۔ اگر اگلی زندگی نہیں ہو گی تو انسان بھی جانوروں سے بدتر ہو جائے گا۔ اگر صرف اس زندگی کو عبور کرنا مقصود ہوگا تو ہر اعتبار سے انسان جانور کے برابر

ایک حیثیت سے جمع نہ ہوسکیں۔ اس کا نام مقابلہ یا تقابل ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ یہاں جتنے ٹکڑے کی ضرورت ہے اتنا بتادوں کہ اس میں جو سب سے زیادہ مقابلے کی چیز ہے وہ دو شے ہیں کہ دونوں جمع بھی نہ ہوسکیں اور ان دونوں سے خلو بھی نہ ہوسکے۔ مثلاً سیاہ اور سفید۔ یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتے کہ ایک وقت میں ایک کپڑا سفید بھی ہو سیاہ بھی ہو۔ لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کپڑا نہ کالا ہو نہ سفید ہو بلکہ سرخ ہو۔ تو یہ ناقص مقابلہ ہے۔ کامل مقابلہ یہ ہے کہ نہ جمع ہوسکے نہ خلو ہوسکے ایسی چیزیں نفی اور اثبات ہونا اور نہ ہونا ہیں۔ یعنی نہ تو یہ ہوگا کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک چیز ہو بھی اور اسی آن میں وہ نہ ہو بھی۔ اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ شے نہ تو "ہو" اور نہ "نہ ہو"۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یا تو وہ شے ہوگی یا نہ ہوگی۔ آپ غور کریں۔ بالکل نئی دلیل ہے۔ مجھ سے پہلے کسی حکیم یا عالم نے یہ بات نہیں کہی ہے۔ میں یہ بات بالکل منفردانہ حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ جانور بھی اس کو جانتا ہے۔ جب آدمی مرتا ہے تو اس کے پلنگ کے پایوں کے نیچے پانی کے کٹورے رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ چیونٹی نہ چڑھے۔ چڑھنے کے مراد یہ نہیں ہے کہ چڑھ کر گزر جائے بلکہ وہ مردہ گوشت کو کھا جاتی ہے۔ زندہ کو نہیں کھاتی۔ وہ جانتی ہے کہ وجود اور عدم کا اجتماع محال ہے دونوں جمع نہیں ہوسکتے اجتماع النقیضین کے محال ہونے کو جانور بھی جانتا ہے۔ یہ پہلا اور بدیہی قاعدہ اور قانون ہے جس پر تمام عقلی علوم اور صنائع مبنی ہیں اگر یہ قانون استعمال نہ کیا جائے تو کوئی علم باقی نہیں رہ سکتا اور جب میں نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ یہ عالم متلون میں ہے۔ تمام علماء سے غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے خالق کو بھی اسی میں شامل کر لیا کہ کوئی شے خالق ہوگی یا مخلوق یہ تشقیق غلط ہے۔

ایک وقت ایسا تھا کہ خالق ہی خالق تھا اور کوئی شے نہیں تھی۔ تو قانون اگر صحیح ہو تو ہر وقت لاگو ہوگا۔ یعنی ازل میں نفی اور اثبات کی تشقیق صحیح نہیں ہے۔ ازل میں اگر یہ کہا جائے کہ خدا ہے یا مخلوق تو یہ غلط ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ یہ نفی اور اثبات کا جو ضابطہ ہے یہ صرف کائنات میں ہے۔ خالقِ کائنات کو یہ لاگو نہیں ہے وہ علوم جو الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں یہ ضابطہ جاری نہیں ہوگا۔ اگر یہ جاری کیا جائے گا تو صدہا غلطیاں بلکہ غلطیاں ہی غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ فلاسفہ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں اسی بنیاد پر ہوئی ہیں۔ وہ مطلق اس بات کو نہیں سمجھے۔ یہ پہلی بار آپ سُن رہے ہیں۔ آج تک کسی نے اس ضابطہ کا رد نہیں کیا۔ یہ غلط ہے۔ نفی و اثبات کا دوران صرف کائنات میں ہے اور کہیں نہیں ہے۔ جیسے میں نے مثال دی کہ ازل میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ ہے یا مخلوق ہے۔ یہ کہہ ہی نہیں سکتے اگر یہ قانون حق ہوتا تو ازل میں بھی صحیح ہوتا لیکن وہاں یہ صحیح نہیں ہے۔ تو معلوم ہوگیا کہ خدا میں یہ قانون لاگو نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کی ذات وصفات کے متعلق یہ کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں کہا جائے گا کہ خدا عالم ہے یا جاہل۔ قادر ہے یا عاجز۔ حکیم ہے یا سفیہ۔ موجود ہے یا نہیں۔ نہیں بلکہ وہ موجود ہی ہے۔ حکیم ہی ہے۔ قادر ہی ہے۔ عالم ہی ہے۔ مقابل ہے ہی نہیں۔ مقابل کی نفی ہے۔ علم الٰہیات اور فلسفہ مابعد الطبیعت پورا کا پورا غلط ہے۔ اس میں اتنی سی بھی سچائی نہیں ہے۔ طبیعات میں غور کرنے کے بعد کچھ حصہ صحیح ہے کچھ غلط ۔ معقولات کے جتنے اجزاء ہیں تقریباً سب غلط ہیں منطق جو ہے بالکل بیکار ہے۔ حکایات ہیں۔ واقعات سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے عقلی علوم جتنے

ہیں سب بے کار ہیں۔ رہ گئے علوم حساب؛ تو ظاہر ہیں عام منافع کے پیش نظر
اُن کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ثابت وہ کبھی نہیں ہیں۔ اس لئے کہ علم الجبر موقوف
ہے علم ہندسہ پر اور ہندسہ موقوف ہے۔ خط کو اپنی سیدھ میں کھینچنے پر یا دو
نقطوں کے درمیان خط ملانے پر یا ایک نقطہ کو مرکز مان کر جتنی دوری سے چاہیں
خط کھینچ سکنے پر۔ ان تین اصولوں پر مبنی ہے اور یہ تینوں ثابت نہیں ہیں بلکہ
غلط ہیں میں نے تغلیط کی ہے مگر کم سے کم درجہ میں ثابت نہیں ہیں۔ کیونکہ
اگر یہ بدیہی ہوتے تو علوم متعارفہ میں شامل ہوتے۔ اگر یہ نظری اور غور طلب
ہوتے تو یہ مسائل نظریہ میں شامل ہوتے۔ دونوں جگہ ان کا شمار نہیں ہے۔
کتنی بڑی بات ہے یعنی اگر نظری ہوتے تو ان کو ثابت کرتا۔ مگر مہندس نے
ان کو ثابت نہیں کیا۔ اور اگر بدیہی ہوتے تو علوم متعارفہ میں شامل کرتا جیسے
برابر مقداروں میں اگر برابر مقداریں ملا دی جائیں تو مجموعہ برابر ہوں گے
یہ بدیہی چیزیں ہیں۔ جیسے چار چار برابر ہیں ان میں ایک ایک شامل کر دیا تو
دونوں پانچ پانچ برابر ہو گئے۔ یہ تینوں قانون ایسے نہیں ہیں یہ اصل موضوع
کہلاتے ہیں۔ یہ معلّم کے حسن ظن سے مفاد عامہ کے پیش نظر تسلیم کر لئے گئے ہیں
یہ مسلمات ہیں، محققات اور یقینیات نہیں ہیں۔ بڑی سخت غلطی ہوئی ہے۔ اسی طرح
جتنے اخلاقی علوم ہیں دلیل سے ثابت نہیں ہوتے بلکہ مفاد عامہ کی خاطر تسلیم
کئے گئے ہیں۔ جیسے ماں باپ کو ستانا بُرا ہے۔ سچ بولنا اچھا ہے جھوٹ بولنا
بُرا ہے۔ کسی کو ستانا بُرا ہے یعنی عقلی طور پر ثابت نہیں ہیں۔ وقت کم ہے
اس لئے میں نے مختصر بتا دیا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مفاد عامہ کے پیش نظر

ان مسلّمات اور مشہوراتِ عام کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ مشہوراتِ عامہ کہلاتے ہیں۔ فرمایا خدائے تعالےٰ نے ادْعُ اِلیٰ سبیل ربّك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن (نحل-۱۲۵) اپنے رب کے راستہ کی طرف بلا حکمت کے ذریعہ حکمت کہتے ہیں یقینی قطعی دلائل کو اور اچھے وعظ کے ساتھ اچھا وعظ مشہوراتِ عامہ ہے جسے ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ تیسری بات یہ بتائی کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو ان ہی مسلّمات سے مسلّماتِ خاصہ سے انکار دکرے۔ جیسے کہا کہ فاتوا بالتوراة فاتلوها ان کنتم صادقین (عمران-۹۳) لاؤ توراۃ اگر تم سچے ہو۔ توراۃ تمہارا مسلّمہ ہے۔ پڑھو اس کو اگر ہم جو کچھ کہتے ہیں غلط ہے۔ یہ نہیں کہا ادع بالجدل و بالمجادلہ تو یہ مشہورات عامہ کہلاتے ہیں۔ بحث باریک باتوں میں چلی گئی۔ خیر تو اب "تناقض" کے معنی سمجھ گئے کہ اس کے معنی ہیں ہونا۔ نہ ہونا۔ وجود و عدم ہمیں ثابت یہ کرنا ہے کہ روز جزا ہے۔ اب یہ وجود و عدم حقیقی ہو یا اضافی ہو۔ فلاں شخص ہے یا نہیں۔ تو ایک بات صحیح ہو گی۔ یا وہ ہو گا یا نہیں ہو گا۔ تیسری بات نہیں ہو گی۔ کالا ہے یا کالا نہیں ہے۔ یہ مقابلہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ مقابلہ صحیح نہیں ہے کہ کالا ہے یا سُرخ ہے کالا ہے یا کالا نہیں ہے۔ یہ حصر ہو جائے گا جو شئے کالی نہیں ہے۔ اس میں غیر کالا تمام عالم آجائے گا۔ تو وجود و عدم میں تناقض ہے۔ اتنا مکمّل مقابلہ ہے کہ نہ یہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ نہ ان دونوں سے خالی ہو سکتا ہے۔ تو اب پہلا عدم لا انتہا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پہلے میں نہیں تھا۔ پھر یہ کبھی جانتا ہے کہ میں تھا یا ہوں تو یہ ہونا ہے پھر نہیں ہے۔ تو یہ ہونا دو نہ ہونے کے بیچ میں ہے۔ اور ہونا "نہ ہونے" کی نقیض ہے اور نہ ہونا ہونے کی نقیض ہے۔ تو یہ وجود۔ عدم کی نقیض

ہے مگر کونسے عدم کی نقیض ہے یا تو گذشتہ عدم کی نقیض ہے یا آنے والے عدم کی نقیض ہے چاہے جس عدم کی نقیض کہہ دو۔ اگر یہ گذرے ہوئے عدم کی نقیض ہے تو آنے والا جو عدم ہے وہ نقیض ہے تو اگر اس کے بعد وجود نہیں آئے گا تو پڑا عدم رہ جائے گا۔ اور عدم کی نقیض ہے وجود۔ عدم واجب ہے نہیں اگر واجب ہوتا تو منقطع نہ ہوتا اور شروع نہ ہوتا۔ پچھلا عدم منقطع ہوگیا اور آئندہ عدم شروع ہوگا۔ اگر بعد کا عدم واجب ہوتا تو وہ موت کے بعد شروع ہوگا اگر واجب ہوتا تو ہر وقت ہوتا۔ اسی طرح پہلا عدم اگر واجب ہوتا تو اس وقت ختم نہ ہوتا اس لئے اُس کے لئے نقیض لازمی ہے۔ اور ایک شے کی دو نقیضیں ہو نہیں سکتیں۔ ایک شے کی ایک ہی نقیض ہوگی۔ اس پر سب کا اتفاق ہے تو پہلے نہیں تھا تو پھر ہوا۔ پھر نہیں ہوگا تو لابد آگے ضرور ہونا ہے۔ تاکہ اس عدم کی وہ نقیض ہو جائے جس طرح پہلے ازلی عدم تھا یہاں آکر وہ ختم ہوگیا پھر یہ وجود محدود ہوا پھر وہ عدم محدود ہوا پھر وہ وجود ابدی شروع ہوگیا۔ تو ازلی عدم کا ابدی وجود سے مقابلہ ہوگیا۔ وہی ابدی وجود جو ہے اسی کا نام روز جزا ہے۔ وہی عالم آخرت ہے۔ بہت بڑھیا بات ہے۔ سمجھ میں آگئی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ آپ سُن چکے ہیں کہ عمل کا اگر انجام نہ ہو۔ غایت نہ ہو نتیجہ نہ ہو۔ عاقبت نہ ہو۔ حشر نہ ہو تو اس صورت میں انسان جانور کے برابر ہو جائے گا۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تو کیا ہونا ہے کہ دو انچ کے گڑھے سے انسان نکلتا ہے اور دو گز کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ ایسی انسانیت سے تو لا انسانیت

حرکت سے بے کار ہے۔ لیکن بے کار نہیں ہے باکار ہے۔ تو لابد جزا ہونی چاہیئے۔ اب غور کیجئے عمل کے لئے جو جزا ہے۔ اس کی پانچ صورتیں ہیں۔ یا جزا صرف روح کو ہوگی یا صرف بدن کو ہوگی۔ یا رُوح یہ ہوگی بدن دوسرا ہوگا یا بدن یہ ہوگا روح دوسری ہوگی۔ یا روح وبدن دونوں یہی ہوں گے۔ یہی پانچ صورتیں ہیں۔ چھٹی کوئی صورت نہیں ہے۔

(۱) تو خالی بدن کو جزا نہیں مل سکتی یہ خلافِ عقل ہے۔ یہاں کبھی آپ دیکھیں کہ اگر کوئی قاتل قتل کرکے مرجائے تو اُس کے بدن کو پھانسی نہیں دی جاتی۔ نہ مقدمہ کیا جائے گا۔ نرا بدن قابلِ جزا نہیں ہے۔

(۲) یا یہ بدن ہو اور کوئی دوسری روح اس میں آجائے تو یہ بدرجۂ اولیٰ غیر ہوگیا۔ تو یہ بدن اور غیر روح قابلِ جزا نہیں ہے۔

(۳) اب رہ گئی خالی روح۔ تو خالی روح کو بھی جزا نہیں ملے گی اس لئے کہ جزا خود کوئی شئے نہیں ہے۔ وہ تو دراصل نام ہے ابدی عمل کا۔ جس طرح یہاں یہ چل رہا ہے۔ پھر رہا ہے۔ لذت اور دکھ حاصل کر رہا ہے۔ کھا رہا ہے پی رہا ہے۔ یہی کل اعمال عالمِ جزا میں کرے گا۔ نام اس کا جزا رکھا ہے دراصل وہ بھی ایک عمل ہے۔ بلکہ بڑا عمل ہے۔ تو جس طرح اس چھوٹے عالم میں رُوح بغیر بدن کے کام نہیں کرسکتی اسی طرح ابدی عالم میں بغیر بدن کے رُوح کام نہیں کرسکے گی۔ یعنی جزا نہیں پاسکے گی۔ لہٰذا تنہا روح کو جزا نہیں ملے گی۔

(۴) اب جو چوتھی شق رہ گئی کہ رُوح اُس کی بدن کوئی اور جیسا کہ

تناسخی والے کہتے ہیں۔ بودھ مذہب اور براہمن آواگون کے قائل ہیں تو تناسخ یا آواگون باطل ہے۔ بالکل غلط ہے جھوٹا مسئلہ ہے۔

ارسطو نے یہ دلیل بیان کی ہے کہ بدن کی طبیعت حدوث نفس کو چاہتی ہے۔ یعنی جسم جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو یہ مبدء فیاض سے روح کو طلب کرتی ہے۔ کہ روح اس کی تدبیر کرے اب اگر کوئی مرجائے اور اس کی روح اس بدن میں جائے تو ایک تو بدن کی اپنی طبیعت ہوگی۔ اور ایک یہ روح اس میں جائے گی تو ایک بدن میں دو روحیں ہوگئیں اور ایک بدن میں دو روحوں کا ہونا یہ ناممکن ہے۔ اور بھی لوگوں نے کئی دلیلیں بیان کی ہیں۔ میں نے ایک رسالہ تحقیق الکلام لکھا ہے اس میں ان سب کا رد کردیا ہے مگر اس کا کوئی نسخہ میرے پاس نہیں ہے کہیں ملے تو آپ اُس کو دیکھ لیں۔ یہ دلیل بھی ناقص ہے اس لئے کہ طبیعت بدن جو ہے وہ حدوث نفس کی مقتضی نہیں ہے۔ بلکہ وہ فیضان نفس کی مقتضی ہے۔ بدن کی طبیعت یہ چاہتی ہے کہ کوئی روح اس کی تدبیر کرے چاہے وہ روح کہیں باہر سے آئے چاہے جدید پیدا کرے۔ یہ باریک بات کبھی ارسطو کی اُس کے خیال میں نہیں آئی۔ وہ نفس کی پیدائش کو نہیں چاہتی بلکہ نفس کے تعلق کو چاہتی ہے۔ کہ نفس اس کا مدبر ہو۔ اس کی یہ دلیل غلط ہے۔ تناسخ کے متعلق صحیح بات آپ سمجھ لیں یہ عقیدہ کی بات ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو سمجھنی چاہیئے۔ روح یا حادث ہے یا قدیم ہے۔ یعنی یا تو وہ پہلے نہیں تھی پیدا ہوئی یا وہ ایسی نہیں ہے کہ پہلے نہ ہو پھر ہو یعنی ہمیشہ سے ہو۔ اب اُس کی پانچ صورتیں ہیں۔ یا تو بدن اور روح دونوں حادث ہیں۔ یا دونوں قدیم ہیں یا روح حادث

بدن قدیم ہے یا بدن حادث روح قدیم ہے۔ پانچویں کوئی صورت نہیں ہے
یہ بہت بڑھیا دلیل ہے جو خدا کے فضل و کرم سے میں بیان کر رہا ہوں جو مجھ
سے پہلے کسی نے بیان نہیں کی۔ اگر بدن اور روح دونوں حادث ہیں تو یہ صاف
بات ہے کہ روح بدن سے پہلی بار متعلق ہوئی اور کسی دوسرے بدن کو چھوڑ کر نہیں
آئی۔ تناسخ یہ ہے کہ رُوح کا ایک بدن کو چھوڑ کر دوسرے بدن میں جانا اعمال کی جزا
کی بنا پر۔ روح جب پہلے نہیں تھی پھر ہوئی اور بدن کے ساتھ متعلق ہوئی تو
بدن سے اُس کا تعلق پہلا ہوا۔ تو اگر رُوح اور بدن دونوں حادث ہیں تو تناسخ
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر رُوح حادث اور بدن قدیم ہے تو یہ ظاہر
بدیہی البطلان ہے۔ بدن مرکب ہے اور مرکب اپنے ہر جز سے پیچھے ہوتا ہے۔ اس
لئے بدن حادث ہے قدیم نہیں ہے۔ اب اگر روح اور بدن دونوں قدیم ہیں تو
یہ دونوں الگ الگ قدیم ہیں یا ملے ہوئے قدیم ہیں۔ اگر الگ الگ قدیم ہیں
تو جس وقت ان دونوں میں تعلق ہوگا تو تعلق حادث ہوگا۔ اور اس کے لئے ابتدار
اور اوّل ہوگا متعلق ہوتے ہی وہ پہلی بار متعلق ہوا۔ اگر دونوں ملے ہوئے قدیم
ہیں۔ جیسے کہ اب انسان ہے۔ تو وہ شخص ازلی ہوگیا مرے گا نہیں - لیکن انسان
برابر مر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ روح اور بدن ازلی نہیں ہیں۔ اب اگر یہ کہا جائے
کہ روح قدیم ہے اور بدن فرداً فرداً تو حادث ہے لیکن بدنوں کا سلسلہ لا انتہا
ہے۔ یہ اصل مسئلہ آگیا کہ یہ بدن حادث اس سے پہلا بدن حادث اس سے پہلا بدن
حادث۔ اور یہ سلسلہ ماضی میں لا انتہا چلا چلا جا رہا ہے۔ یہی دہریہ کا عقیدہ ہے اور یہی آواگون والوں
کا ہے۔ ... [illegible]

یعنی سلسلہ حوادث لاانتہا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں اور یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر بدن میں قوام مٹی ہے خلق الانسان من طین ایک لفظ میں حل کر دیا کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ (سجدہ ۷) اگر قوام میں مٹی داخل نہ ہوتی تو مرنے کے بعد کبھی مٹی نہ بنتا۔ جب مٹی سے پیدا ہوا تو مٹی انسان پر مقدم ہو گئی۔ یہ بدنی انسان ازل میں کبھی کبھی لاانتہا نہیں جا سکتا۔ جب کبھی جائے گا سلسلہ زمین پر ٹھیر جائے گا۔ ہر شخص یہ دیکھ رہا ہے کہ میں زمین پر ہوں اور زمین مجھ سے پہلے ہے۔ یہ جو شخصیت ہے وہ اپنے آپ کو مٹی سے پیچھے بتا رہی ہے۔ کروڑوں برس پیچھے کبھی اگر ہمارا کوئی باپ ہو تو وہ اپنے کو زمین سے پیچھے ہی پائے گا۔ تو بدن کے لئے اوّل ہے۔ وہ سلسلہ لاانتہا نہیں جا سکتا۔ تو ہر صورت میں تناسخ باطل ہو گیا۔ تو اب یہ شکل کہ خالی روح کو جزا ملے گی یہ بھی باطل ہو گیا۔ خالی بدن کو یہ بھی باطل ہو گیا اور یہ شکل بھی باطل ہو گئی کہ بدن اس کا روح کوئی اور یہ شکل بھی باطل ہو گئی کہ

روح اس کی بدن کوئی اور جیسا کہ اہل تناسخ کہتے ہیں۔ تو اب ایک ہی شکل باقی رہ گئی کہ یہی بدن اور یہی روح ہو گی اور جب بدن مٹ جاتا ہے تو لابد اس بدن کو دوبارہ اٹھنا ہو گا۔ جزا کے لئے۔ جن معنی میں روز جزا کے ... دعوت بانّ الساعۃ ان لاتیتہ لاریب فیہا (۱۸) تم سب ایمان لاؤ کہ لابد روز جزا آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے ذلک الیوم الحق کے یہ معنی ہیں۔ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہو سکتی۔ ویسے مشہورات عامّہ کے طریقہ پر بہت کچھ بیان ہو سکتا ہے مگر اب وقت نہیں ہے۔ اس لئے میں نے دو تین براہین آپ کے سامنے بیان کر دیں

فمن شاء اتخذ الیٰ ربّہ مآبا آپ غور کریں کتنی ...

بہت غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ ظاہر میں کتنا سادہ ہے ۔ ہر شخص اس کے معنی جانتا ہے
من شاء جو شخص چاہے ۔ اتخذ الی ربہ مآبا ۔ بنالے اپنے رب کے پاس اکاؤنٹ
حساب ۔ بامحاورہ ترجمہ یہ ہے کہ جس کا دل چاہے اپنے رب کے پاس اپنا کھاتہ کھول
لے ۔ اب غور کریں ۔ یہاں جتنے بھی افعال ہو رہے ہیں
انسانوں کے اور جانوروں کے سب کی نوعیت مشترک ہے ۔ کھانا پینا ۔ اٹھنا بیٹھنا ۔
سونا جاگنا ۔ پیشاب پاخانہ وغیرہ وغیرہ کل اشیاء مشترک ہیں ۔ صرف یہ فرق ہے کہ
انسان کو اُن کے حاصل کرنے میں ذرائع اور اسباب کی ضرورت پڑ رہی ہے ۔
اور اُن کو بغیر اس کے حاصل ہیں ۔ اور یہ انسان کے لئے انتہائی بدنصیبی کی
بات ہے ۔ غور کریں ان مقصدوں کے حاصل کرنے میں کونسی شے داعی ہے ۔ کون
شے ہے جو ان مقاصد کی طرف لا رہی ہے ۔ جانوروں میں صرف دو چیزیں ہیں ۔
شہوت اور غضب ۔ شہوت کہتے ہیں مقصود کے حاصل کرنے والی قوت ۔ غضب ۔
مقصود کے حاصل کرنے میں جو مخل ہو اُس کو دفع کرنے کی قوت ۔ لفظوں کے معنی
بھی جاننے چاہئیں ۔ تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو ۔ اور انسان میں تین چیزیں ہیں ۔
شہوت ۔ غضب اور عقل ۔ اور انسان قادر ہے فعل کے کرنے پر اور نہ کرنے پر ،
دونوں پر قادر ہے ۔ اب کوئی نہ کوئی چیز ترجیح دے گی فعل کے کرنے کی طرف یا
فعل کے ترک کرنے کی طرف ۔ تو ترجیح دینے والی ان تینوں میں سے ایک یا دو یا
تینوں ہوں گی ۔ تو ان کے نتائج مثل حیوان ہوتے ہوئے یہاں ختم ہو جائیں گے ۔
جس طرح جانور کے ختم ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح آدمی کے ختم ہو جائیں گے ۔ اپنی بھوک نے
دعوت دی ۔ آپ کو کہ کھانے کے فعل کو ایجاد کرو ۔ بہت بڑے مضمون کو میں نے بہت آسان

طریقہ پر ادا کر دیا۔ کوئی بڑھیا فلسفی بھی اس طرح ادا نہیں کرے گا۔ پیاس نے
دعوت دی کہ پانی پی۔ تو دعوت دیتے ہی مدعو متحقق ہو گیا۔ اور تحقق ہو کر ختم ہو گیا
تو اگر غضب شہوت اور عقل داعی ہوں گے تمہارے افعال کے تو داعی کے ساتھ مدعو
ہوتا ہے۔ داعی کے ختم ہوتے ہی مدعو بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور اگر فعل کا داعی مرجع
جو ہے وہ امر الٰہی ہو گا۔ تو مرجع اور داعی کے ساتھ مدعو رہتا ہے۔ خدا جب داعی
ہو گا اور داعی کے ساتھ مدعو ہوتا ہے تو جتنے فعل تم کرو گے خدا کے پاس پاؤ گے۔
یہ معنے اُس کے پاس ٹھکانہ بنانے کے ہیں۔ یہ پہلا شخص میں ہوں جس نے یہ تفسیر کی۔
مجھ سے پہلے نہ کسی مفسر نے نہ کسی حکیم اور فلسفی نے یہ تفسیر کی ہے۔ یہ ایک دفتر ہے
اسے آپ خوب سمجھ لیں جس نے یہ دعوت دی تھی وہ ختم ہو گیا تو جس شے کی دعوت دی
تھی وہ بھی ختم ہو گیا۔ روزانہ فعل ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر دعوت دینے والا امر الٰہی
ہو گا تو امر الٰہی خدا کے پاس ہے۔ تو مرجع کے ساتھ وہ فعل ہو گا تو یہ جملہ فعل کھانے
پینے کے چلنے کے یہ کل وہاں موجود ہوں گے اور ان سب کو اپنے رب کے پاس دیکھ
لے گا۔ یہی معنی ہیں اُس کے پاس ٹھکانہ بنانے کے یہ تو نہیں ہے کہ خدا کوئی زمین
اور کمرہ ہے کہ وہاں جا کر یہ ٹھہر جائے گا۔ بلکہ یہ کھانا پینا اگر اپنی مرضی سے کیا تو یہ
فعل ایسے ہیں کہ جیسے جانور کے فعل اور اگر خدا کی مرضی سے کھایا پیا تو آپ کا یہ فعل
خدا کے پاس ہے۔ اُس کے حکم کے مطابق ہے۔ اپنی مرضی سے منہ دھویا۔ جانور بھی
پانی میں منہ ڈال کر ہلاتا ہے اُس کی کوئی جزا نہیں اسی طرح اس کی بھی کوئی جزا نہیں۔
وہ بھی ختم یہ بھی ختم۔ اور اگر خدا کے حکم سے منہ دھویا تو یہ عمل خدا کے پاس ہے۔
وہاں اس کی جزا پائے گا۔ اور اپنی مرضی سے کیا ہوا فعل یہیں ختم ہو گیا وہ مثل سراب

کے ہے۔ وہاں کچھ نہ پائے گا۔ وہ تو جو قوت اس فعل کو کرانے والی ہے وہ عمل اس کو لازم ہے وہ اس کو وہاں پائے گا وہ قوت امر الٰہی ہے۔ یہ عمل وہاں پائے گا جہاں امر الٰہی ہے۔ یعنی خدا کے پاس۔ اور امر الٰہی جو ہے وہ نام لسانِ رسولؐ کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ رسولؐ کے حکم کے مطابق فوراً قولاً اور فعلاً چلا جائے گا۔ جہاں وہ جائیں گے یہ بھی چلا جائے گا۔ یہاں آپ دیکھیں اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ یہاں سے اُٹھ کر جائے اور جدھر آپ مڑیں وہ بھی اُدھر ہی مڑ جائے تو جہاں آپ پہونچیں گے وہ بھی وہاں پہونچ جائے گا یا نہیں۔ سیدھی سی بات ہے۔ میرے خیال میں بہت وضاحت ہو گئی۔

انا انذرنا کم عذابًا قریبًا۔ انذار کے معنی بہت زیادہ ڈراتا۔ بے شک ہم نے تم کو عذاب قریب سے ڈرا دیا۔ قریب کے معنی ایک جماعت نے یہ فرمائے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں قریب۔ انھم یرونہ بعیدًا ونراہ قریبًا (معارج-۷) وہ اُس کو دُور دیکھتے ہیں اور ہم اُس کو قریب دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ اللہ کے نزدیک ہر شئے قریب ہے۔ بُعد کا سوال ہی نہ رہا۔ حالانکہ بُعد نقیض قرب کی ہے۔ اللہ کے نزدیک جب ہے وہ نہیں اس لئے اُس قریب کی نقیض بُعد نہیں ہے۔ یہاں ڈرایا جا رہا ہے اُس قریب سے جو بُعد کی ضد ہے۔ عام مفسرین رحمہم اللہ اجمعین نے یہ فرمایا ہے کہ جو شئے آنے والی ہے۔ وہ قریب ہے اور جو شئے گذر گئی وہ بعید ہے۔ یہ بات زیادہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آنے والے میں بھی ایک لمبا نام ہے آنے والی شئے لا انتہا ہے۔ اور بحیثیت لا انتہا کے قریب ہو نہیں سکتی۔ ورنہ وہ منتہا ہو جائے گی۔ غور کریں کہ جب آدمی عمل کرتا ہے تو کیا صورت ہوتی ہے۔ سب سے

پہلے عمل کی خوبی دماغ میں ذہن میں عقل میں آتی ہے۔ مثلاً ایک دوکان خریدی تو دوکان خریدنا مقصود نہیں ہے بلکہ وہاں کاروبار کرنے سے جو منافع ہوں گے وہ منافع پہلے خیال میں آئیں گے۔ اتنی آمدنی ہوگی۔ تو حسن کا جو تصور ہے وہ محرک ہوتا ہے فعل کا۔ اور جو غایت ہے حسن کی اس کا تحقق بعد میں ہوتا ہے وہ مطلوب ہوتی ہے۔ حسن کا تصور جو ہے وہ مبدا اور محرک ہوتا ہے فعل کا وہ پہلے ہوتا ہے اور فعل کا تحقق سب سے آخر میں ہوتا ہے وہ غایت ہوتی ہے۔ اچھائی کا تصور سب سے پہلے اور تحقق سب سے پیچھے۔ تو جب اچھائی کا تصور ہوا تو اس نے ارادے کو حرکت دی اور ارادے نے قدرت کو حرکت دی۔ قدرت کو کرنے یا نہ کرنے دونوں کی طرف نسبت برابر ہے۔ قدرت سے فعل نہیں ہوتا۔ اس کا محرک ارادہ ہوتا ہے قدرت نے عضلات کو اعصاب اور ان اعضاء کو حرکت دی۔ اعضاء نے آلات کے اوزار کے ذریعہ یا بغیر ان چیزوں کے فعل کو انجام دیا۔ تو جس وقت وہ ارادہ کرتا ہے اور ارادہ برانگیختہ ہوتا ہے تو ارادہ کا ایک رُخ تو قدرت و نما اُن اعضاء کی طرف ہوتا ہے اور دوسرا رُخ نفس میں ہوتا ہے۔ حرکت ہوتے ہی وہاں ایک نقطہ پیدا ہوتا ہے روح کے اندر۔ اگر وہاں نقطہ پیدا ہو تو کوئی اگر اچھی چیز ہو تو اس سے خوشی ہو اور اگر بری چیز ہو تو اس سے رنج ہو تو ارادہ کی دو جہتیں ہیں۔ ذوطرفین چیز ہے ارادہ کا ایک رُخ اندر ہے اور ایک باہر عمل کر رہا ہے۔ عمل جتنے بھی ہو رہے ہیں وہ مخصوص طریقہ پر نقطہ کی شکل میں نفس انسانی میں گڑھا تے ہیں وہ لکھا جاتا ہے جیسے شارٹ ہینڈ ہوتا ہے یا مثلاً کاربن کاغذ سے نقل کر لیتے ہیں۔ ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوپری لکھا جا رہا ہے لیکن دراصل جو ان کا متن جو نیچا ہے لکھا جا رہا ہے نیچے۔ اچھے اگر پھر کر کاٹ دیا تو وہ کٹتا ہے بھی

وہاں آجائے گا۔ جمع خرچ سب ہو جاتا ہے۔ اُس کے اندر تو جب تک یہ سامنے نظر آرہا ہے۔ اس وقت تک وہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جب اوپر کا پرچہ پھاڑ کر الگ کیا جاتا ہے تو نیچے سب کچھ نظر آجاتا ہے۔ تو جب یہ اوپر کا پرچہ جو بدن کا ہے پھٹ جائے گا تو اندر کا پرچہ جو رُوح ہے اُس پر سب منقش ظاہر ہو جائے گا۔ بیک آن۔ عشیۃً او ضحٰھا۔ (نزعت۔ ۴۶) بدن کا پردہ جب پھٹا روح میں منقش ہو گیا تھا وہ سب عرضِ حال ہو گیا۔

النار یعرضون علیھا غدوًا وعشیًّا صبح شام پیش کی جاتی ہے وہ دیکھی جاتی ہے کہ یہ حالت ہے۔ داخلہ اب آگے آئے گا۔ عروض میں کتنی دیر ہے عشیۃً او ضحٰھا۔ جیسے شام یا شام کی صبح تھوڑی گذرے گی۔ تو تھوڑی دیر میں وہ عذاب قریب نظر آجائے گا۔ اور اس کا عروض اس پرچے کے پھٹتے ہی آئے گا۔ ایک جھٹکا دیا۔ اُوپر کا پرچہ بدن کا الگ ہوا اور نیچے کا پرچہ ظاہر سامنے آگیا۔ صرف ایک جھٹکے کا وقفہ ہے۔ یہ ہیں معنیٰ عذاب قریب کے۔ یہ زیادہ عقل میں بات آتی ہے اور صحیح ہے۔ یہ بات اللہ پاک نے مجھے بتائی میں نے آپ کو سُنادی۔ اللہ آپ کو عذاب قریب سے پناہ میں رکھے اور مجھے بھی۔ برزخ کی کبھی میں نے تعریف کر دی وہ عذاب داخلہ کا نہیں ہے اور دلیل اُس کی النار یعرضون علیھا غدوًّا وعشیا و یوم تقوم الساعۃ ادخلوا ال فرعون اشد العذاب۔ (مومن۔ ۴۶) جب قیامت آئے گی تو آل فرعون کو سخت عذاب میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور قیامت سے پہلے عذاب کا عروض ہو گا۔ ایسا جیسے سامنے سانپ کھڑا پھنکار رہا ہے اور قریب ہے کہ وہ ڈس لے۔ بس وہ ننھا سا حصہ وقفہ کا گذرا اور اُس نے ڈس لیا۔

یعنی ابھی کاٹا تو نہیں لیکن گویا کہ کاٹ لیا۔ میں نے بڑی صحیح تشبیہ دے دی۔ یعنی معقول کو محسوس کر دیا اور محسوس کو بالکل بین کر دیا۔

اور یہ عذاب قریب کب ہوگا۔

یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ۔

جس دن کہ دیکھے گا جو کچھ اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ یا تو ہر شخص دیکھے گا یا مومن دیکھے گا یا کافر دیکھے گا تین معنی ہیں۔ اور یہاں تینوں لگتے ہیں۔ اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں نقلی چیز ہے جو مفسرین سے مجھے پہنچی میں نے آپ کو بتا دی۔ کیا شے دیکھیں گے۔ یہ بھی دو معنوں میں ہے۔ یعنی وہ شے جو اس نے اس جہان میں کیا۔ اور ما استفہامیہ بھی ہے۔ اُس نے اس جہان میں کیا کیا؟ دنیا کی زندگی میں سے اُس کے دونوں ہاتھوں نے کیا بھیجا یا جو اُس نے دنیا کی زندگی میں سے اُس نے بھیجا ہے۔ اُس کو دیکھ لے گا۔ اگر اچھے کام کئے ہیں۔ مومن ہے تو جنّت دیکھے گا۔ اور کفار، فساق اور فجار کا عمل کیا ہے تو دوزخ دیکھے گا۔ یا یہ معنی ہیں اس کے کہ مومن دیکھے گا۔ جو یہ کہتے ہیں اُن کی دلیل یہ ہے کہ یوم ینظر والمرء کے معنی یوم ینظر والمؤمن کے ہیں۔ کیونکہ کافر کے لئے ہے۔ یقول الکافر یٰلیتنی کنت تُرابا اور کافر کہے گا کہ افسوس میں مٹی کیوں نہ ہوا اور مومن اپنے اعمال کو دیکھ کر خوش ہو جائے گا۔ اور بعض کہتے ہیں مرء کے معنی یہاں مومن نہیں کافر ہے۔ کہ وہ اپنے اعمال کو دیکھے گا کیونکہ مومن جو ہے وہ صرف اپنا عمل ہی نہیں بلکہ اپنے رب کا عفو و کرم بھی دیکھے گا اور کافر عذابِ جہنم دیکھے گا۔ اور چیخے گا۔ یا لیتنی کنت ترابًا۔ اُن کی دلیل یہ ہے اے کاش میں مٹی ہوتا

تو مٹی ہونے کے کیا معنی ۔ جب کافر یہ دیکھے گا کہ مومنوں کو انعام واکرام اور بڑی بڑی جزائیں مل رہی ہیں اور میں عذاب میں مبتلا ہوں تو کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا یعنی پیدا ہی نہ ہوتا ۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ مرنے کے بعد مٹی میں ملا ہوا تھا تو میں مٹی ہی رہتا ۔ حساب دینے کے لئے نہ اُٹھتا یا اس کے معنے یہ ہیں کہ تمام جانوروں کا حساب کر کے قصاص دے کر اُن کو حکم ہوگا کہ مٹی ہو جاؤ تو اُن کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ کاش میں بھی ان کی طرح مٹی ہو جاتا یا اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطان نے شروع میں انسان کی تحقیر کی تھی اب جو وہ اس کی ایسی توقیر و عزت دیکھے گا تو کہیگا کاش میں بھی مٹی ہوتا یعنی انسان ہوتا ۔ یا صوفیائے کرام نے یہ معنیٰ بیان فرمائے ہیں کہ کافر کہے گا کہ کاش میں بھی عاجز ہی ہوتا ۔ تکبر نہ کرتا ۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی نہ کرتا ۔ نہ اکڑتا ۔ یہ پانچ معنی مفسرین رحمہم اللہ اجمعین نے بیان کئے ہیں ۔ یہ میں نے آپ کو بتلا دیئے ۔ اس میں عقلی کوئی چیز ہے نہیں جو میں کاٹ چھانٹ کر کے اپنی کچھ رائے بتا دیتا ۔ سورہ النبا مکمل ہوئی ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ○ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ○ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ○
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ○ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ○ يَوْمَ تَرْجُفُ
الرَّاجِفَةُ ○ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ○ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ○
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ○ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى
الْحَافِرَةِ ○ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ○ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا
كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ○ فَاِنَّمَا هِىَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ○ فَاِذَا
هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ○ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ○ اِذْ
نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ اِذْهَبْ اِلٰى
فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ○ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ○
وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ○ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ
الْكُبْرٰى ○ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ○ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ○
فَحَشَرَ فَنَادٰى ○ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ○
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ○ اِنَّ فِىْ
ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا
اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ○ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ○ وَ

اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ
ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ مَرْعٰهَا ۝
وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ فَاِذَا
جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ
الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝
فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ
هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى
النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ يَسْئَلُوْنَكَ
عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ۝
اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۝ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ
يَّخْشٰهَا ۝ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا
عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا ۝

(۱ النّزعٰت - ۸۹)

⁂ ⁂ ⁂

⁂

نازعٰت

اشعریہ کے علاوہ تمام علمائے فلاسفہ اور ائمہ مسلمین بھی اس کے قائل ہیں
کہ اعادہ معدوم کا جائز نہیں ہے۔ جب انسان ایک مرتبہ معدوم ہوگیا تو اب
جو دوبارہ وہ پیدا ہوگا تو وہ یہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا مثل ہوگا۔ عین نہیں ہوگا۔
یہ بات سمجھنی ہے۔ غور کرلے ہے۔ ان کو اس آیت سے دھوکا لگا ہے۔ اَوَلَیسَ الذی
خلق السموٰت والارض بقٰدرٍ علٰی ان یخلق مثلھم کیا ایک ذات جس نے زمین و
آسمان کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان کی مثل بنادے۔ (یٰس-۸۱) یہ شبہ دراصل
یہ ہے کہ شیخ کے ایک شاگرد نے سوال کیا کہ شخص کی شخصیت میں زمانہ شامل ہے
اور جو زمانہ گزر گیا وہ واپس نہیں آسکتا لہٰذا اب جو شخص دوبارہ پیدا ہوگا وہ
یہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اس جیسا ہوگا۔ کیونکہ اس کی شخصیت میں یہ زمانہ شامل نہ ہوگا۔ تو
شیخ نے اس کو پہلے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ سمجھا تو شیخ نے کہا کہ کل آنا جب
وہ پہنچا دوسرے دن تو شیخ نے کہا کہ جس شخص نے کل سوال کیا تھا اس کی شخصیت
میں آج کا زمانہ شامل نہ تھا۔ اور تیسری شخصیت میں آج کا زمانہ شامل ہے لہٰذا
تو وہ شخص نہیں ہے۔ جس نے سوال کیا تھا میں تجھ سے بات نہیں کرتا۔ شاگرد
سے جواب نہ بن پڑا۔ خاموش ہوگیا۔ مگر شیخ نے صحیح جواب نہیں دیا۔ صحیح جواب
ہے کہ زمانہ ظرف ہے مظروف کی شخصیت میں داخل نہیں ہے۔ اکثر علمائے جواب

ہوا۔ اس وقت بھی 'میں' تھا۔ جوان ہوا تب بھی 'میں' تھا۔ بوڑھا ہوا تب بھی 'میں' رہا۔ برخلاف جسم کے بڑھاپے کا جسم اور ہے۔ اور بچپن کا جسم اور۔ اس جسم کو اس جسم سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بدلنے والی شے اور ہے اور نہ بدلنے والی شے اور ہے۔ اعادہ 'میں' کا ہوگا۔ تمام علما اس پر متفق ہیں۔ مگر اس میں مغالطہ ہے۔ اگر معدوم کا اعادہ جائز نہیں ہے۔ تو جس طرح جسم فنا ہوگا۔ اس کا اعادہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح 'میں' یعنی روح بھی فنا ہوگی۔ کلِ شیئٍ ھالکٌ الا وجھہ (قصص ۸۸) اللہ تعالےٰ کے سوا تمام اشیاء ہالک ہیں۔ تو روح کا اعادہ بھی ناجائز ہے۔ تو یہ جواب بھی صحیح نہیں ہے۔ اصل میں یہ کلیہ کہ معدوم کا اعادہ جائز نہیں ہے یہ غلط ہے یہ فلسفیوں نے کلیہ گھڑا اور مسلمانوں نے بغیر غور کئے اس کو تسلیم کر لیا۔ اس وجہ سے الجھن میں پڑ گئے۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ انسان کا جسم برابر منقلب ہو رہا ہے۔ اور وہ نہیں جانتا کہ کتنے اجزا باہر سے آکر اس میں مل رہے ہیں۔ جانور نباتات جمادات کے کتنے اجزا ہیں جو برابر اس میں منقلب ہو کر شامل ہوتے ہیں۔ اور انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ 'میں' ہوں بس یہی راز اور بھید کی بات ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اعتبار صرف شعور کا ہے۔ یعنی جس طرح انسان اس وقت یہ پہچانتا ہے کہ یہ میرا بدن ہے اسی طرح قیامت میں بھی پہچان لے گا کہ یہ میرا بدن ہے۔ دارومدار صرف شعور پر ہے۔ انسان اچھی طرح جان جائیگا کہ میں وہی ہوں اور یہ ہاتھ پیر میرے ہیں

[illegible]

بچہ ہے جس کو میں نے گودوں میں کھلایا اور دودھ پلایا ہے۔ اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی کہ اعادہ معدوم کا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ جواب اس شبہ کا صحیح نہیں دیا گیا۔ صحیح جواب یہ ہے جو میں نے دیا۔ وضرب لنا مثلا ونسی خلقہ قال من یحیی العظام وھی رمیم (یس-۷۸) ہمارے لئے مثالیں گھڑتا ہے اور اپنی حیثیت کو بھول گیا۔ کہتا ہے کہ کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب وہ مٹی ہو جائیں گی قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ (یس-۷۹) کہہ دے کہ وہی جس نے پہلے پیدا کیا تھا۔ دوبارہ بھی وہی پیدا کرے گا۔ پہلی مرتبہ اجزاء کا تعین کہاں تھا۔ دوسری بار بھی اس کی ضرورت نہیں ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا (دہر-۱) وہ شے قابل ذکر ہی نہیں تھی۔ لاشئ محض تھی۔ جب لاشئ محض کو شے معین کردی۔ اب خاکستر ہونے کے بعد۔ پھر وہ لاشے محض ہو گیا۔ تو پھر شے معین کرنے میں کیا دقت ہے۔ ذلک حشر علینا یسیر (ق-۴۴) بلکہ اب وہ ہمارے لئے آسان ہے کیونکہ ایک بار بنانے کے بعد دوسری بار بنانے میں دقت نہیں وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ (واقعہ-۶۲) پہلے زندگی کو نہیں جانا کہ وہ کس طرح سے بنا ہے۔ اسی طرح سے ابدن جائے گا قد علمنا ما تنقص الارض منھم (ق-۴) ہم کو خوب معلوم ہے کہ زمین کے کتنے اجزاء اس پتلے میں خرچ ہوئے ہیں۔ وہ مندرج ہیں کتاب عظیم میں اور وہ ہمارے پاس کتاب ہے۔ اس میں اس نسخے کو درج کردیا ہے۔ اسی نسخے سے اس کو بنا دیا جائے گا۔ اور ہر شخص اپنے آپ کو پہچان لے گا۔ آج اس کی نگاہ کتنی تیز ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ جواب ہے۔ جواب مکمل ہوگیا۔ اللہ پاک انسان

کو قیامت کے دن اٹھائے گا۔ اس کو غور سے سمجھ لیں۔ یہ مبنی ہے اس بات پر۔ متعدد دلائل بیان کئے ہیں۔ اصل طریقہ تو وہی ہے۔ جو اہل سنت والجماعت کا ہے۔ کہ نبی صلعم کی جب تصدیق ہو گئی۔ اور نبوت سے معجزہ سے ثابت ہو گیا تو اب انہوں نے جس جس چیز کی خبر دی ہے۔ ہم نے اس کی تصدیق کر دی۔ نبی نے جتنے عقائد اور اعمال بتائے ہیں وہ عقل سے کبھی نہیں معلوم ہوں گے سب سے صحیح اور سب سے آسان تو یہ ہے۔ باقی علماء نے کچھ باتیں بیان کیں ہیں جن میں سے کچھ عقل میں آتی ہیں۔ انسان اور حیوان میں ما بہ الامتیاز عقل ہے۔ عقل کے علاوہ تمام اجزاء مشترک ہیں۔ جانور کو جو تکلیف ہوتی ہے اسی وقت ہوتی ہے۔ نہ گزشتہ تکلیف اس کو یاد آتی اور نہ آئندہ تکلیف کا اس کو خیال آتا ہے۔ حیوان کو حزن اور خوف نہیں ہوتا۔ گزشتہ تکلیف کو حزن آئندہ کو خوف کہتے ہیں۔ اور انسان کو ماضی اور مستقبل دونوں تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ عقل ہے۔ اگر عقل نہ ہو تو انسان کو بھی تکلیف نہیں ہوتی جیسے چھوٹا بچہ۔ عقل کی بنا پر انسان ہر وقت تکلیف میں مبتلا رہتا ہے اور پریشان رہتا ہے۔ تو عقل سبب ہوا دکھ اور پریشانی کا۔ تو گویا عقل بدترین چیز ہو گئی۔ تو انسان تمام جانوروں سے بدتر ہو گیا۔ لیکن انسان تمام جانوروں سے بہتر ہے۔ اور اس جہاں میں اس کا بہتر ہونا جانوروں سے ثابت نہیں ہے لہٰذا ایک دوسرا جہان چاہیئے۔ جہاں اس کی بہتری ثابت ہو۔ اسی طرح وہ یہ کہتے ہیں کہ حکمت اور رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ ظالم سے انتقام لیا جائے گا۔ مظلوم کا اور اگر ظالم سے انتقام نہیں لیا جائے گا۔ تو حکمت باطل ہو جائے گی

یہاں انتقام نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظلم ہوتا ہے۔ اور ظلم کا انتقام نہیں لیا جاتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی دار انتقام ہونا چاہیئے۔ اور اسی دار انتقام کا نام دار الجزاء ہے۔ اور وہ ہونا چاہیئے۔ اسی قسم کی دلیلیں انہوں نے بیان کی ہیں میرے خیال میں ایک باریک بات آئی ہے۔ وہ بیان کر دیتا ہوں کہ انسان کا جو عمل ہے وہ حرکت ہے۔ حرکت کہتے ہیں ایک مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں جانا اور سکون یہ ہے کہ جسم ایک مکان میں رہے اور دوسرے مکان میں منتقل نہ ہو۔ تو حرکت کا کوئی جز بھی برا نہیں ہے۔ اگر ایک جزا چھا ہے تو سب اچھے ہیں۔ اور ایک اگر برا ہے تو سب برے ہیں۔ اور اسی حرکت کا نام عمل ہے۔ تو عمل کی اچھائی اور برائی عمل کی ذات میں نہیں ہے۔ عمل کے اجزاء آپ الگ الگ کریں تو کہیں ان میں اچھائی برائی نظر نہیں آئے گی۔ حرکت جہاں جا کر ختم ہوتی ہے اس کو جہت کہتے ہیں۔ اس جہت میں جہاں یہ حرکت ختم ہوگی اس میں کوئی اچھائی یا برائی ہوگی۔ اور اسی کے اعتبار سے اس عمل یا حرکت کو اچھا یا برا کہا جائے گا اگر صدقہ۔ خیرات۔ نماز ان کا نتیجہ اگر اچھا ملے تو یہ اچھے ہیں ورنہ یہ کچھ بھی نہیں اسی طرح زنا۔ چوری۔ دھوکہ دہی اگر ان کے انجام برے نہ ہوں تو ان میں بھی کوئی برا نہیں ہے۔ چنانچہ جانور یہ سارے فعل کرتے ہیں۔ مگر ان کا انجام برا نہیں ہے۔ نہ یہاں نہ دوسری دنیا یعنی عقبیٰ میں۔ تو ان کے فعل کو کوئی برا نہیں کہتا۔ کہ نہایت گندے اور ناپاک ہیں کہ نالی کا گندہ پانی پیتے ہیں۔ تو فعل کا حسن و قبح انجام کے اعتبار سے ہے۔ نفس فعل میں کوئی اچھائی برائی نہیں ہے۔ یہاں سے عقل

کے مسئلہ کا بھی پتہ چل جائے گا کہ عقل کی کمالات کی دخل [illegible]

سے کہ عقل سے کام لو وہاں تو عقل مفید ہو گی۔ اس کے علاوہ عقل کو دخل دینا غلط ہے۔ عقل سے کچھ بھی پتہ نہیں چلنے کا۔ عقل کچھ نہیں جان سکتی حرکت کے نتیجہ کو۔ حرکت کے اندر کوئی انجام نظر نہیں آتا کہ اس کو دیکھ کر ڈرے۔ اچھائی برائی عمل کے بعد ہو گی اس کا پہلے سے کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ عمل میں کچھ اچھائی برائی نہیں ہے۔ وہ تو صرف خدا کے حکم پر ہے۔ کہ یہ فعل کرو گے تو اس کا یہ اچھا انجام ملے گا۔ اور اگر یہ فعل کرو گے۔ تو اس کا یہ برا انجام تم کو ملے گا۔ یہ لوگوں کو مغالطہ ہے۔ کہ چوری بری چیز ہے زنا بری چیز ہے۔ یہ سب خدا کے کہنے سے بری ہے۔ اگر خدا ان کو برا نہ کہتا تو ان میں کوئی برائی نہ ہوتی۔ چوری کیا ہے۔ تین شرطیں ہیں کسی کا مال بغیر اس کی اجازت کے، بغیر بدلے کے چپکے سے لے لینا یہ چوری ہے۔ یہ تینوں چیزیں مال کے لے لینے میں مفید ہیں۔ کیونکہ اجازت لینا۔ بدلہ دینا۔ اور شور مچانا یہ تینوں مشقتیں ہیں۔ اس میں مشقت ہے۔ اس میں سہولت ہے۔ تو عقلی لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اسی طرح زنا ایسے فعل کو کہتے ہیں۔ جو مشترک ہے نکاح میں۔ ان میں جو فرق ہے۔ وہ اس فعل سے خارج ہے۔ یعنی یہ کہ ایک AGREEMENT ہو دو گواہوں کے ساتھ۔ ایک اقرار نامہ ہو۔ اس پر دو گواہ ہوں۔ اس کا نام نکاح اور اگر یہ بات نہ ہو تو اس کا نام زنا اور نفس شے جو ہے وہ نکاح اور زنا ایک ہے۔ اس کے اندر کوئی بھی خرابی نہیں ہے۔ اب جو خرابی آئی قبح اور برائی آئی وہ باہر سے آئی کسی کے کہنے سے آئی وہ کس نے کہا۔ انسان نے کہا۔ حیوان نے کہا۔ ملائکہ نے کہا۔ خالق کائنات نے کہا۔
[illegible]

جانوروں کے مقابلہ میں کائنات میں ایسا ہے۔ جیسا بحر میں قطرہ۔ اور جانور تمام ایک دوسرے کو قتل کررہے ہیں۔ انسان خود اپنے مفاد کے لئے بے قصور بے گناہ جانوروں کو ذبح کر رہا ہے۔ تو اگر اپنے فائدہ کے لئے ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرے تو عقل جیسے جانوروں کے ذبح کو برا نہیں کہتی۔ اس کو بھی برا نہیں کہتی۔ اگر ان فعلوں میں قباحت ہوتی تو ہر جگہ قبیح ہوتا۔ مگر کہیں قباحت نہیں ہے۔ قباحت صرف انسانوں میں ہے۔ دنیا قاتل کو برا کہتی ہے۔ کہ عقل کے خلاف کیا یہ غلط ہے۔ قاتل نے مقتول کو قتل کیا اور قاتل کو جلاد نے قتل کیا۔ تو قتل قاتل اور جلاد دونوں میں مشترک ہے۔ جلاد اور قاتل دونوں کا فعل ایک ہے۔ مگر قاتل کو برا کہا جاتا ہے جلاد کو انعام دیا جاتا ہے۔ اس کو کوئی برا نہیں کہتا۔ اگر قتل کرنا برا ہوتا تو جلاد کو بھی برا کہا جاتا۔ تو معلوم ہوا کہ قتل میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ اب دونوں میں فرق کیا ہے۔ قاتل نے اپنی مرضی سے قتل کیا اور جلاد نے مجسٹریٹ کے حکم سے قتل کیا۔ تو اچھائی برائی یہ ہوئی کہ اپنی رائے سے کرنا برا ہے اور حاکم کے حکم سے کرنا اچھا ہے۔ تو اب برا کیا ہوا۔ اپنی عقل سے فعل کرنا ہی برا ہے۔ تو عقل بری چیز ہوئی۔ اب حاکم کو دیکھیں۔ اس نے بھی اپنی عقل سے حکم نہیں دیا۔ اس نے کسی دفعہ کے تحت حکم دیا ہے۔ اس کا حکم قانون کے تابع ہے۔ اب قانون کو دیکھئے قانون مقنن نے بنایا۔ اور اس نے کسی قانون کے تحت نہیں بنایا۔ قانون لاقانون سے وہ کسی قانون کے تحت نہیں تجویز ہوا۔ تو اس لاقانون ہی کے مصداق کا نام خدا ہے کہ اس نے بغیر کسی دفعہ قانون کے قاعدہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح حکم تو لنا

خلاف قانون ہے. قانون کیا ہے. بٹّے کے برابر تولنا. مگر بٹہ کس قانون کے تحت بنا. وہ کسی قانون کے تحت نہیں بنا. بس خدا کے حکم سے رسولؐ نے یونہی ایک وزن کو کہہ دیا کہ میں نے اس کا نام سیر رکھ دیا. کیونکہ ہر سیر کے پہلے ایک سیر ہے. جس کے مقابل یہ بنا. یہ سلسلہ دور تک چلا جائے گا. آخر میں ایک سیر ایسا آئے گا. جس سے پہلے کوئی سیر نہ تھا. بس وہی سیر ہے. جس کو خدا نے سیر کہہ دیا لہٰذا یہ سیر میں بھی عقلی نہیں ہے. نبی نے کہہ دیا کہ یہ سیر ہے. یہ تولہ ہے یہ ماشہ ہے. یہ ترازو ہے. کوئی بھی عقلی نہیں ہیں. آپ کہاں عقل عقل لئے پھر رہے ہیں. آپ کہتے ہیں کہ یہ میرا مکان ہے. سوال ہوگا وہ کیسے آپ قبالہ دکھائیں گے کہ میں نے فلاں سے خریدا. وہ کہے گا میں نے فلاں سے خریدا. اسی طرح ایک کے اوپر ایک خریدار ملتا جائے گا. آخر میں ایک ایسا شخص آجائے گا کہ اس نے کسی سے نہیں خریدا. یوں ہی زمین پر قبضہ کر لیا. تو یہ سارا ماحول چوری کا ہے جس کے آپ مالک بنے بیٹھے ہیں. تو نبی نے آکر کہہ دیا کہ یہ زمین کا ٹکڑا میں نے تجھ کو بغیر قیمت کے دیدیا. عقل تو دستاویز چاہتی ہے. وہاں سب بغیر دستاویز کے ہے. سب خلاف عقل ہے سب خدا نے بتادیا. اس کا نام اچھا اس کا نام برا. اور بتلانے کا طریقہ یہ رکھا کہ مزاج کو اعتدال پر رکھدیا. اور بتادیا کہ اس کو برتو اور اس کو نہ برتو. اگر مزاج کو بدل دے جیسے بخار ٹائیفائڈ وغیرہ میں تو میٹھی چیزیں کڑوی معلوم ہونے لگتی ہیں. اس میں اجازت نہیں دی. تو جتنی اچھائیاں برائیاں حقائق میں ہیں. عقلی نہیں ہیں. سب غلط ہے. اور احکام ہیں تو ہیں ہی نہیں کیونکہ احکام کے نتائج تو آگے آئیں گے. اس میں پہلا

عقل کو کیا دخل ہو گا.

اب جو قرآن شریف میں عقل کی تعریف ہے. جیسے افلا تعقلون۔ (انبیاء-۱۰) یتفکرون (زمر-۴۲) افلا یتدبرون (محمد-۲۴) یہ خدا کے قول ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ عقل کو کام میں لاؤ. میرے کہنے سے جس طرح میں بتاؤں اور جس جگہ بتاؤں. اپنے آپ نہیں اپنی رائے سے اپنی عقل پر نہ چلو. جس حد تک میں بتاؤں ہاں تک دخل دو اور جہاں میں منع کر دوں. وہاں مت دخل دو. جہاں خدا کہے وہاں عقل کو استعمال کرو اور جہاں منع کرے وہاں مت دو. اس کی دلیل یہ ہے ثم اوحینا الیک ان اتبع ملت ابراهیم حنیفا ہم نے تجھ کو وحی بھیجی کہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کر. (نحل-۱۲۳) تو محمد صلعم خاتم النبین ہیں وہ شرائع کے ناسخ ہیں انہوں نے دین ابراہیم کو منسوخ کر دیا. اب اس پر وہ کیا عمل کریں گے کتنی بین دلیل ہے بس جہاں ہم حکم دیں وہاں منسوخ شریعت پر عمل کرو. اسی طرح جہاں ہم حکم دیں. وہاں عقل کو استعمال کرو. جہاں منع کر دیں. وہاں مت دخل دو. اب عقل کی حد کیا ہے. خدا اور رسولؐ دونوں کو عقل سے پہچانا جائے گا۔ کہ خدا بھیجنے والا ہے اور رسولؐ بھیجا گیا ہے. اور یہ ثابت ہو گا. معجزہ سے۔ نبی معجزہ دکھائے گا اور معجزہ دیکھ کر قوم عقل سے اس کو نبی پہچانے گی. جب معجزہ کی دلیل سے نبی کا ثبوت مل گیا بس یہاں عقل کا کام ختم ہو گیا. اب جو کچھ نبی کہے گا وہ خدا کا حکم ہے اس کو تسلیم کیا جائے گا. اور وہ حکم ضروری نہیں ہے. کہ عقل کے مطابق ہو. وہ صرف اس کے کہنے پر تسلیم کیا جائے گا عقل کو اس میں دخل نہیں دیا جائے گا. کیونکہ اگر حکم عقل کے مطابق ہو گا. تو

پھر نبی کی ضرورت نہیں رہے گی۔

ایک اور بین دلیل میں دیتا ہوں اور بڑی اچھی دلیل ہے کہ اگر کوئی حاکم کسی کو حکم دے گا۔ تو اُس کو دے گا جس میں شعور ہو۔ بے شعور کے لئے کوئی حکم نہیں ہے۔ اگر قاتل قتل کر کے مر جائے تو مردے کو کبھی پھانسی پر نہیں چڑھایا جائے گا۔ جب تک شعور نہ ہو۔ حکم نافذ نہیں ہوگا۔ تو اگر عقل حاکم ہوگی تو حکم کس کو کرے گی۔ عقل کے نیچے حواس ہیں۔ شہوت ہے۔ غضب ہے۔ جسم ہے۔ سب بے عقل ہیں۔ انسان میں سے جب عقل نکل جائے گی۔ تو باقی سب بے عقل ہی رہ جائیں گے۔ تو ان پر حکم کیا چلے گا۔ یہ تو قابل خطاب ہی نہیں۔ حکم کس پر چلائے گی۔ تو معلوم ہوا کہ عقل حاکم نہیں ہے۔ بلکہ چونکہ باشعور ہے۔ اس لئے قابل خطاب ہے۔ حکم اسی پر چلے گا۔ اور حاکم خالق عقل ہے۔ اور عقل محکوم ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰٓی ۝ اَوْ یَذَّكَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ۝ وَمَا
عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ۝ وَهُوَ یَخْشٰی ۝
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝
فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۝
كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ
خَلَقَهٗ ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۝ ثُمَّ السَّبِیْلَ
یَسَّرَهٗ ۝ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۝ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ۝ كَلَّا لَمَّا
یَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ۝ فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ
صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝
وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ
وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ۝
وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ ۝
وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْهَا
غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی۔ تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ کس بات سے۔ اِنْ جَاءَہُ الْاَعْمٰی۔ ایک اندھے کے اپنے پاس آنے پر۔ ایک شخص آنکھوں سے اندھا حضور کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اللہ پاک نے جو آپؐ کو سکھایا ہے مجھے تعلیم کریں۔ اس وقت اکابر قریش کا ایک وفد آیا ہوا تھا۔ آپؐ ان سے گفتگو میں مصروف تھے تو اس وقت اس اندھے کا دخل دینا آپؐ کو کچھ اچھا نہ معلوم ہوا تو آپؐ کی تیوری پر بل آیا اور آپؐ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس پر اللہ پاک نے یہ سورہ نازل فرمائی بطور تنبیہ کے۔ یہ جو تنبیہ ہوئی ہے۔ یہ بہت باریک بات ہے۔ اس کو آپ توجہ سے سُنیں۔ اندھے کو نظر تو نہیں آتا تھا مگر سنائی سب دے رہا تھا۔ جو آپؐ فرما رہے تھے اور اس علم کے ہوتے ہوئے نبیؐ کے کلام کو قطع کر دیا اور آپؐ کے دُکھ اور ایذا کا سبب بنا تو یہ اندھے کی معصیت ہے ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون (حجرات ۴) جو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں۔ وہ بے عقل ہیں اِنَّ الذین یؤذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ جو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو دُکھ دیتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ (احزاب - ۵۷)

اندھے کی گفتگو سے نبیؐ کو دکھ ہوا اور جو اہم کام کر رہے تھے۔ اس میں خلل ہوا۔ یہ تو سخت ترین معصیت تھی۔ اس کے باوجود خدا نے تنبیہ کی اور عتاب کیا۔ اس بات کو سمجھنا ہے۔ اتنا خلیق انسان جس سے زیادہ خلیق کوئی پیدا نہیں

ہوا۔ اس نے تیوری چڑھائی تو کتنا دکھ ہوا اس کو۔ نبی کو دکھ دینا گناہ کبیرہ ہے بدنیتی سے کیا تو کفر کیا۔ اگر بھول سے کیا تب بھی بہت بڑا گناہ کیا۔ یہ اعتراض ہے اور یہ بہت مشکل بات ہے، مفسرین کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نبیؐ نے امرار کی طرف رجحان کیا اور غربا کی طرف نہیں کیا۔ اسی رجحان کی بنا پر آپؐ کی تنبیہ کی۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ آپؐ کے دل میں امرار کی وقعت تھی اور اندھے کی بے دقعتی تھی۔ اس وجہ سے تنبیہ ہوئی۔ یہ دونوں جواب غلط ہیں۔ نبیؐ کا رجحان امرار کی طرف ہو یہ کیونکر ممکن ہے۔ جبکہ انؐ کے غلاموں کا بھی ایسا رجحان نہیں ہوتا۔ نبیؐ کے دل میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی۔ ظاہر میں جو وہم ہو رہا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اگر وہ قاعدہ کے اندر ہے اور امرار کا اعزاز مقصود ہے تو وہی فعل صحیح ہے اور حق ہے۔ یعنی امرار کی طرف متوجہ ہونا خدا اور اس کے رسولؐ کے نزدیک صحیح ہے۔ اور غربار کی طرف متوجہ نہ ہونا خدا اور اس کے رسولؐ کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ تو امرار کی طرف متوجہ ہونا بحکم الٰہی بہتر ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ وہ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ امیروں کی تعظیم کرو۔ انکی طرف متوجہ ہو تو وہی حق ہے جیسے اس نے کہا کہ نیکوں کی تعظیم کرو۔ اور بدوں کی نہ کرو۔ اگر اسکا حکم ہوتا اور کہتا کہ بدوں کی تعظیم کرو اور انکی عزت کرو تو وہی شریعت ہوتی نیک و بد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسیطرح امیر غریب کا کوئی سوال نہیں اسلئے کہ غریب امیر سے بہتر ہے۔ کیونکہ امیر کو تو فکر ہوتا ہے۔ اپنی امارت کے زوال کا۔ اور غریب کو امارت اور دولت کے حاصل کرنے کا فکر ہوتا ہے ایک کو فکر ہے روٹی ملے۔ دوسرے کو فکر ہے اس کی روٹی جاتی نہ رہے اسے

فکر زوال ہے اور غریب کو فکر حصول ہے اور حصول زوال سے بہتر ہے۔
اس لئے غریب امیر سے بہتر اور افضل ہے۔ یہ بات عقلاً تو ہے لیکن عقلی حسن
شریعت میں معتبر نہیں ہے۔ اللہ جس کو چاہے بہتر کہے جس کو چاہے بُرا کہے۔ اس
باریک بات کو سمجھ لیں کہ اللہ اور رسولؐ کا معاملہ ایسا ہے۔ کہ رسولؐ جو کہتا ہے
وہ اللہ ہی کا کہنا ہے اور رسولؐ کو یہ اجازت دیدی گئی ہے کہ تم اپنے اصحاب
کی تادیب کرو، تنبیہ کرو۔ تو اگر آپؐ نے ڈانٹا اور زجر کیا تو باذن الٰہی ڈانٹا،
اجازت دی گئی تھی اس لئے یہ فعل قبیح نہیں ہو سکتا مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ
عَنِ الْهَوٰى (نجم ۲-۳) نہ تمھارا صاحب گمراہ ہے نہ کج راہ ہے۔ اور نہ اپنی خواہش
اور ارادہ سے بولتا ہے۔ تو عمل کی بھی صفائی کر دی اور اعتقاد کی اور قول کی
بھی صفائی کر دی۔ تو یہ فعل بالکل صحیح تھا اور اس کی اجازت تھی کہ وہ قریش کو
سمجھا رہے تھے۔ اگر اب ممانعت آتی کہ امیروں سے محبت نہ کرو، غریبوں سے
محبت کرو۔ اور پھر آپؐ کرتے تب آپؐ کا یہ فعل غلط ہوتا اور قابل اعتراض ہوتا
جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انبیاء سے غلطی ہوتی ہے۔ ان کے دلائل میں سے ایک
آیت یہ بھی ہے۔ کہ اتنی سخت تنبیہ ہے اور تنبیہ غلطی پر ہی ہوتی ہے اگر غلطی نہ ہوتی
تو کبھی اتنی سخت تنبیہ اور ڈانٹ اور عتاب نہ ہوتا۔ اب ایک جماعت یہ کہتی ہے
انبیاءؑ سے غلطی نہیں ہوتی۔ دو جماعتیں ہیں۔ پھر ان کی کئی شاخیں ہیں بعض
کسی میں بتاتے ہیں۔ بعض کسی میں بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں خطرہ میں غلطی ہوتی
ہے بعض احکام میں بعض اعمال میں بعض سیرۃ میں بعض افعال میں بتاتے ہیں۔
اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں۔ جو کفر تک بتاتے ہیں۔ یعنی نبی کفر بھی کر سکتا ہے۔

اور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ نبی سے غلطی نہیں ہوتی۔ کچھ غیر اہل سنت کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ جگہ جگہ قرآن شریف میں ایسی آیات ہیں جن سے نبی کی لغزش ثابت ہوتی ہے۔ جیسے آدمؑ سے وَلَا تقربا هٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین (بقرہ ۳۵) اگر تو اس درخت کے پاس گیا تو گناہ گار ہو جائے گا۔ وعصٰی آدم ربہ فغوٰی۔ آدم نے رب کی نافرمانی کی اور وہ گناہ گار ہوگیا۔ یہ سب نبی کی غلطی اور گناہ پر دلالت کر رہی ہیں۔ (طٰہٰ ۱۲۱) اسی طرح ابراہیمؑ اور نوحؑ کی بابت آیات ہیں انہوں نے فرمایا فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ (ہود ۴۵) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ فرمانے لگا کہ یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اِنِّیْ اعظك ان تکون من الجاہلین (ہود ۴۶) میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ناداں ہو جائے فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم (ہود ۴۶) جس چیز کا تجھے علم نہیں اسکے پیچھے مت پڑ اور درست کہہ میں تجھے سمجھائے دیتا ہوں ایسا نہ ہو کہ تو ناداں ہو جائے حالانکہ نوحؑ نے جو کہا تھا کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے یہ صحیح تھا اور جو لوگ کہتے ہیں کہ انبیاؑ سے غلطی نہیں ہوتی ان کے مضمون کی بھی بے شمار آیات ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حتی یحکموک فِیْ مَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ (نساء ۶۵) قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ ان میں سے میں کسی کو بھی مومن تسلیم نہیں کرونگا۔ یہانتک کہ یہ تجھے کل کلاں حکم نہ مان لیں تو حکم اسی کو مانا جائے گا جو غلطی نہ کرے۔ وما ارسلنا من رَسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ ہم نے جو رسول بھیجا ہے۔ (نساء ۶۴) اسے مطاع بنایا ہے۔ ساری قوم اس کی مطیع ہوگی اور وہ مطاع ہوگا۔ مطاع وہ جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ وہ غلطی نہ کرے۔ اس کے علاوہ اگر لوگوں کو یہ پتہ چل جائے کہ یہ خود گناہ کرتا ہے اور پھر وہ نصیحت بھی کرے کہ یہ گناہ نہیں کرنا چاہئے۔ تو ایسے

صورت میں تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور پھر پوری قوم کو حکم دیدیا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب ۲۱) تمہارے لئے نبی میں بہترین نمونہ ہے۔ اس کی اقتداء کرو۔ اب اگر نبی نے گناہ کیا اور اس کی اقتدا کی تو تناقض لازم آیا۔ ان کا جواب جو انھوں نے دیا یہ ہے کہ یہ جو آیات آئی ہیں یہ ترک اولی پر مبنی ہیں۔ گناہ صغیرہ یا کبیرہ نہیں ہے۔ مگر یہ جواب ان کا غلط ہے۔ کیونکہ جب نبی بھی تارک اولی ہوگا تو پھر فاعل اولی کون ہوگا۔ کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ترک اولی ہونا نبی کی نبوت کے منافی ہے۔ نبی ہمیشہ اولی کریگا اور یہ فعل بھی اولی ہی تھا عفا اللہ عنک لم اذنت لھم (توبہ ۴۳) اللہ نے معاف کردیا۔ لم اذنت لھم جو ان کو حکم دیا۔ یعنی اجازت دیدی۔ تو جو اجازت دی وہ اولی ہی تھی۔ ترک اولی تو نبی کرے گا ہی نہیں کیونکہ آیات میں جو چیزیں ہیں۔ مثلاً آدم ؑ کا معاملہ۔ تو وہ ضلالت۔ ظلم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ترک اولی کے نہیں۔ اور ترک اولی ظلم و ضلالت نہیں ہوتی اور اگر اسکو ترک اولی سمجھ بھی لیا جائے تو مباشر اولی فاعل اولی نہیں رہے گا۔ اب میں آپ کو صحیح بات بتاتا ہوں اور رائے ظاہر کردیتا ہوں کیونکہ زیادہ بحث کا وقت نہیں ہے پہلے تو آپ یہ سمجھ لیں کہ نبی کہتے کسے ہیں نبی کہتے مخاطب رب العالمین کو جو انسان اس قابل ہو کہ خدا اس کو خطاب کرے۔ چاہے وہ بوڑھا ہو۔ جوان ہو۔ بچہ ہو مرد ہو یا عورت ہو بس وہی نبی ہے اور خطاب نبوت ہے اور اس خطاب کے تین طریقے ہیں۔ ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من ورای حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء (شوری ۵۱)۔ کوئی بشر اس قابل نہیں جس سے اللہ کلام کرے اگر کلام کریگا تو وحی کے ذریعہ سے یعنی اس کے دل میں ایسے معانی ڈال دے گا جس کے لئے الفاظ

نہیں ہوں گے اَوْمِنْ وَّرَاۤئِ حِجَابٍ یا پردہ کے پیچھے سے بولے گا۔ آواز سنائی دے گی۔ نظر نہیں آئے گا۔ جیسے حضرت موسیٰؑ سے کلام ہوا۔ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی سن جو تجھ کو وحی کی جا رہی ہے تو وہ سمعی کلام بھی وحی ہے اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا یا وہ ایک فرشتے کو بھیجدیتا ہے۔ تو وہ اس کی مرضی کے مطابق اس کی اجازت سے اس پر وحی کر دیتا ہے۔ اور وہ وحی کیا ہے وہی خطاب اور کلام ربانی۔ نبی مجبور ہے اس خطاب اور کلام کے سننے پر۔ اس کے خلاف نہیں کر سکتا کہ نہ سنے۔ عصمت کے معنی یہ ہیں کہ خطاب ہو اور وہ خطاب کو فوراً سنے۔ اگر خطاب نہ سنے تو یہ غیر عصمت ہوگی۔ تو نبوت اور عصمت ایک ہی چیز ہے۔ تو نبی کو معصوم ہونا ہی ہے کیونکہ جو خطاب ہوگا اس کو نبی ضرور سنے گا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس خطاب کو نہیں سنتا۔ خطاب کا سننا ہی نبوت ہے۔ اور یہی معنی عصمت کے ہیں۔ عصمت کے معنی یہی ہیں کہ خدا کے حکم کے خلاف نہ کرے۔ خدا نے سنایا اس نے سن لیا۔ اور غور کرنے کی بات ہے کہ یہ جو دو طریقے اختیار کئے ہیں کہ ایک فریق ایک قسم کی آیات پڑھتا ہے اور دوسرا فریق دوسری قسم کی آیات پڑھتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ جیسے یوسفؑ نے کہا کہ یَاۤ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ. اے قافلے والو تم چور ہو۔ یہ صرف جھوٹ ہی نہیں بلکہ بہتان ہے۔ جھوٹ سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ یہ ان کے نزدیک گناہ پر دلالت کرتی ہے۔ یہاں ایک اصولی بات یہ بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ جو چاہے سو کہہ دے۔ اس لئے کہ اس کا قول واقع کے مطابق نہیں ہے۔ ہمارے یہاں صدق اور سچ اس چیز کو کو کہتے ہیں جو واقع کے مطابق ہو۔ واقع کہتے ہیں قول کے مصداق کو۔ دو دو

سفید ہے۔ یہ سچ ہے۔ یہ قول واقعہ کے مطابق ہے۔ تو واقع کی مطابقت کو صدق کہتے ہیں۔ تو صدق واقع کے تابع ہوگا۔ جھوٹ کیا ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو۔ مثلاً دودھ سیاہ ہے۔ یہ کذب ہے۔ کیونکہ یہ واقع کے خلاف ہے۔ تو واقع کی مطابقت اور عدم مطابقت یا مخالفت کا نام صدق و کذب ہے۔
اللہ پاک نے اس جہان میں یہ قانون نافذ کیا مکلفین کے لئے۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ خود اس قانون کے تابع نہیں ہے۔ یعنی اس کا قول واقع کے تابع نہیں ہوگا۔ کیونکہ آگ ہے گرم، ہر شخص جانتا ہے مگر اللہ نے کہا یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا (انبیاء - ۶۹) اے آگ تو ٹھنڈی ہو جا۔ اس کے کہتے ہی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے واقع کے خلاف ایک بات کہی اور فوراً واقعہ اس کے قول کے مطابق ہو گیا۔ تو اللہ کا قول واقعہ کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ واقعہ اس کے قول کے مطابق ہوتا ہے۔
یہ اصولی چیز سمجھ لیں۔ تو جتنے بھی اعتراضات دنیا کے ہیں سب رفع ہو جائینگے کیونکہ اللہ کے احکام، کلام وغیرہ الٰہی علوم کو اگر عقلی علوم پر پرکھا جائے گا۔ تو ہمیشہ غلطیاں ہونگی، کوئی بات بھی صحیح نہیں ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ سچ نہیں کہتا بلکہ جو کہتا ہے وہی حق ہے وہی سچ ہے وہی صدق ہے۔ اس نے موسیٰ کی لکڑی کو کہدیا سانپ ہے وہ سانپ ہو گئی فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ٥ (طٰہٰ - ۲۰) کل واقعات اس کے قول کے تابع ہیں۔ تو نبی جو بات حق کہہ رہا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے کہ پوچھے یہ تو نے کیوں کہا؟ نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حق بات ہے اس لئے میں کہہ رہا ہوں۔ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ اللہ کہہ رہا ہے کہ کیا تو نے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود قرار دو۔ اللہ کے

علاوہ۔ حالانکہ مجھ کو آپ کو سب کو علم ہے کہ انھوں نے نہیں کہا تو کیا اللہ کو معلوم نہیں ہوگا۔ خدا کو پورا علم ہے کہ انھوں نے نہیں کہا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے پوچھا اور وہ چونکہ بہت بڑے آدمی تھے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا۔ بلکہ کہا قَالَ سُبْحَانَكَ تو پاک ہے مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ (مائدہ ۱۱۶) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ناحق بات کہوں۔ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ (مائدہ ۱۱۶) اگر میں نے کہا ہے تو تیرے علم میں ہے تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ (مائدہ ۱۱۶) تو میرے دل کا حال جانتا ہے۔ میں تیرے دل کا حال نہیں جانتا۔ تیرے اس سوال سے کیا مراد ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ٥ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ٥ وَاِذَا الْجِبَالُ
سُيِّرَتْ ٥ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ٥ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ٥
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ٥ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ٥ وَ
اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ٥ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ٥ وَاِذَا
الصُّحُفُ نُشِرَتْ ٥ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ٥ وَاِذَا
الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ٥ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ٥ عَلِمَتْ
نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ٥ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ٥ الْجَوَارِ
الْكُنَّسِ ٥ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ٥ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ٥
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ٥ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ
مَكِيْنٍ ٥ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ٥ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ٥
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ٥ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ
بِضَنِيْنٍ ٥ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ٥ فَاَيْنَ
تَذْهَبُوْنَ ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥ لِمَنْ
شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ٥ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ
اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

بارہ علامتیں بتائیں چھ قیامت سے پہلے اور چھ قیامت کے بعد (۱)
اذا الشمس کورت۔ جس وقت سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے گی تکویر کے معنی گول لپٹینا۔ یہ سورج کی روشنی جو پھیلی ہوئی ہے۔ اس کو لپیٹ دیا جائے۔ ایک تفسیر اس کی یہ بھی ہے کہ ٹوٹ کر گر پڑے۔ تکویر کے دو معنی ہیں۔ بعض متقدمین نے یہ کہا ہے کہ یہ فارسی لفظ کور سے ماخوذ ہے کور اندھے کو کہتے ہیں یعنی سورج اندھا ہو جائے۔ اس کی روشنی جاتی رہے۔ یہ تین تفسیریں ہیں۔ لپٹنے کے یہ معنی ہیں۔ کہ جو چیز لپیٹی جاتی ہے وہ آنکھوں سے غائب ہو جاتی ہے۔ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ شمس و قمر دونوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ جس راوی نے نقل کیا انھوں نے پوچھا کس گناہ میں۔ تو انھوں نے کہا کہ میں حضورؐ کی حدیث نقل کر رہا ہوں اور تم یہ پوچھتے ہو کیوں کس گناہ میں۔ تو انھوں نے توبہ کی۔ باقی بات یہ ہے۔ کہ ضروری نہیں کہ گناہ کی وجہ سے ہی جہنم میں ڈال دیا جائے۔ انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم۔ (الانبیاء ۹۸) اللہ کے علاوہ جن کی تم کافر و مشرک لوگ عبادت کرتے ہو وہ سب جہنم کے ایندھن ہیں۔ تم اور تمھارے معبودان باطل سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو اس لئے جہنم میں ڈالدیا جائے کہ ان کی تیزی سے جہنم اور بھڑکے۔

۲۔ واذا النجوم کدرت۔ اور جس وقت تارے مکدر ہو جائیں۔ دھندلے ہو جائیں۔ روشنی جاتی رہے یا ٹوٹ کر گر پڑیں۔ انکدار کے معنی بھی یہی ہیں۔ ٹوٹ کر گر پڑیں۔

۳۔ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ ۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے یعنی بادلوں کی طرح اڑائے جائیں گے اور زمین چٹیل میدان ہو جائے گی۔

۴۔ واذا العشار عطلت ۔ اور جب دس مہینے کی اونٹنی بے کار ہوجائے دس ماہ کے حمل والی اونٹنی عرب کے نزدیک بہت قیمتی ہوتی ہے ۔ وہ وقت ایسا ہوگا کہ اونٹنیاں پھرتی ہوں گی اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہ ہوگا۔ لوگوں کو اپنی جان کی پڑی ہوگی۔ مال کی طرف خیال بھی نہ ہوگا۔

۵۔ واذا الوحوش حشرت ۔ اور جب جنگلی جانور جمع ہوجائیں. حشر کے معنی جمع ہوجانا یا بعث یعنی اٹھائے جانے کے بھی ہیں۔ وہ حساب اور عدل کے لئے اٹھائے جائیں گے تاکہ ان کو قصاص جانوروں سے دلوا دیا جائے۔ اور پھر وہ مٹی ہوجائیں گے۔ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔ اور معتزلہ یہ کہتے ہیں۔ کہ ان کو جو تکلیف پہنچی ہیں۔ ان کا بدلہ ان کو دلوایا جائے گا۔ اور معاوضہ اللہ پر واجب ہے مگر ہم لوگوں کے یہاں اللہ پر کچھ واجب نہیں ہے۔ وہ مالک ہے جو چاہے سو کرے

۶۔ واذا البحار سجرت اور جب سمندر خشک ہوجائیں گے جہنم کی آگ ان کے نیچے سلگائی جائے گی۔ اس سے وہ خشک ہوجائیں گے۔ اور ایک تفسیر یہ بھی ہے سجرت کے معنی فجرت کے ہیں۔ کہ وہ بہہ نکلیں اور سب سمندر مل کر ایک ہوجائیں۔

۷۔ واذا النفوس زوجت ۔ اور جب روحوں کا جوڑا لگایا جائے گا۔ ملایا جائے گا یا تو اس کا مطلب یہ کہ روح کو بدن سے ملایا جائے یا نیک روح نیک روح کے ساتھ اور شقی روح شقی روح کے ساتھ ملا دی جائے۔ یا یہودی یہودی سے اور عیسائی عیسائی سے ملے۔ یا ایسے ہی اور جتنے معنی چاہیں نکالیں۔ اصل معنی ملانے کے ہیں۔ ایک تفسیر میں مومنین کو حور العین سے ملانے کے بھی آئے ہیں۔ اور کافروں کو شیاطین سے ملانے کے بھی آئے ہیں متعدد معنی آئے ہیں۔

۸۔ واذا الموءودت سُئِلت ۔ اور جب زندہ درگور لڑکیوں سے پوچھا جائے گا کیا پوچھا جائے گا۔ بای ذنب قتلت۔ تم کس گناہ میں قتل کی گئیں۔ یہ زجر اور ڈانٹنے کے معنی ہیں دراصل قاتلوں سے پوچھا جائے گا۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ زندہ درگور لڑکیوں کے حال کے بارے میں ان کے قاتلوں سے پوچھا جائے گا۔ کہ کس گناہ میں تم نے ان کو قتل کیا۔ قبل اسلام عرب میں دستور تھا کہ اگر لڑکیوں سے اونٹوں کے چرانے وغیرہ کا کام لینا ہوتا تو اس کو بالوں کی اون کی ٹوپی پہنادی جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو زندہ رکھنا ہے ورنہ چھ سال تک وہ ایسے ہی رہتی تھی پھر ایک روز باپ اپنی بیوی سے کہتا کہ اس کو کپڑے پہنادے خوشبو وغیرہ لگادے تاکہ میں اس کو رشتہ داروں سے ملالاؤں اور جنگل میں لے جاکر گڑھا کھود کر اس لڑکی سے کہتا کہ اس میں جھانک۔ جب وہ جھانکتی تھی تو اس کو اس میں دھکا دے کر اوپر سے مٹی ڈال دیتا تھا۔ تو جس وقت اس زندہ درگور لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس گناہ میں قتل کردی گئی۔

۹۔ واذا الصحف نشرت ۔ اور جب صحیفے یعنی نامۂ اعمال پھیلادئیے جائیں۔

۱۰۔ واذا السماء کشطت ۔ اور جب آسمان کی کھال کھینچ دی جائے یا پردہ آسمان کا بیچ سے ہٹادیا جائے کہ جنت اور عرش نظر آنے لگے گا۔ آسمان ہٹادیا جائے گا۔

۱۱۔ واذا الجحیم سعرت ۔ اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے۔ جیسے یہاں گھاس پھوس ہلکی آگ پر ڈالتے ہیں تو ایک دم تیز ہوجاتی ہے۔ سعیر بھڑکانا بولتے ہیں۔

۱۲۔ واذا الجنت ازلفت ۔ اور جب جنت کو قریب کردیا جائے گا۔ وہ مومنوں کے قریب آجائے گی۔ اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش و خرم ہوں گے۔ جب یہ سب بارہ علامتیں ہوں گی تو کیا ہوگا اس کی جزا کیا ہے۔

علمت نفس ما احضرت - ہر شخص جان لے گا جو کچھ اس نے حاضر کیا ہے۔ تو اب عمل ایسی چیز نہیں ہے جو حاضر کی جا سکے کیونکہ یہ تو عرض ہے۔ بلکہ نامۂ اعمال جس میں عمل لکھا ہوا ہے اور استحقاق کہ اس کو جنت ملے گی۔ یا جہنم۔ اس کو جان لے گا۔ اس میں کوئی عقلی بات تو تھی نہیں۔ میں نے تفسیر مختصر تقریباً پوری آپ کے سامنے بیان کر دی کچھ اور بھی زائد باتیں ہیں ان کی ضرورت نہیں۔

فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس والیل اذا عسعس والصبح اذا تنفس

میں قسم کھاتا ہوں ان سیاروں کی جو دوڑتے ہیں سورج کے ساتھ اور پھر چھپ جاتے ہیں۔ یا تو یہ ۵ سیارہ ہیں۔ سورج اور چاند کے علاوہ جن کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ عطارد مشتری۔ زحل مریخ۔ شمس یا بعض مفسرین کے نزدیک تمام تارے مراد ہیں۔ ثوابت اور سیارہ سب تو اس کے معنٰی یہ ہوئے میں تمام تاروں کی قسم کھاتا ہوں جو چلتے ہیں۔ اور جب سورج نکلتا ہے۔ تو چھپ جاتے ہیں۔ جوار وہ تارے جو سیدھے چلتے ہیں۔

واللیل اذا عسعس اور قسم ہے رات کی جب اس کی تاریکی شروع ہو یا جب اس کی تاریکی ختم ہو عسعس کے دونوں معنی ہیں اور والصبح اذا تنفس۔ صبح کی قسم جب وہ دم لے سانس لے یعنی اس کے آثار کامل ہو جائیں۔ روشنی نمایاں ہو جائے۔ یہ قسم کھائی کس بات پر انہٗ لقول رسول کریم۔ بے شک یہ قرآن کریم رسول کریم کا قول ہے ذی قوۃ عند ذالعرش مکین مطاع ثم امین جو ذی قوۃ ہے اور اللہ کے نزدیک ٹھہرا ہوا مطاع۔ اس جگہ وہ مطاع ہے۔ تمام ملائکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ ثم امین امانت دار ہے۔ جو بات جہاں پہنچانی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچا دیتا ہے۔

وما صاحبکم بمجنون۔ اور تمہارے صاحب ساتھی یعنی نبیؐ دیوانے نہیں

ہیں۔ ولقد رآہ بالافق المبین اور یقیناً تمہارے صاحب نے جبریل کو آسمان کے کنارہ پر دیکھا ہے یعنی مطلع کے اوپر ان کو اصلی ہیئت میں دیکھا ہے۔ حضور نے دو مرتبہ ان کو دیکھا ہے ایک دفعہ یہاں اور ایک مرتبہ دوسری جگہ وماھو علی الغیب بضنین اور وہ بخیل نہیں ہے۔ اس کا املا ’ظ‘ سے بھی آیا ہے یعنی اس پر کوئی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ قرآن اور احکام الٰہی کے بیان کرنے پر بخیل نہیں ہیں۔

ماھو بقول شیطٰن رجیم اور وہ شیطان مردود کا بیان نہیں ہے۔ فاین تذھبون۔ کہاں بھٹکے ہوئے چلے جا رہے ہو۔ ان ھو الا ذکر للعٰلمین۔ یہ تو ذکر اور نصیحت ہے تمام جہاں کے لوگوں کے لئے۔ لمن شاء منکم ان یستقیم۔ اور یہ ان لوگوں کے لئے خاص ہے جو چاہیں استقامت اور نیک روی۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العٰلمین۔

اور تم توفیق الٰہی کو کیا چاہ سکتے ہو تم نہیں چاہ سکتے لیکن ہاں اللہ رب العالمین اگر تم کو توفیق دینی چاہے تو تم چاہ سکتے ہو۔

یہاں کئی مضمون بہت مشکل اور دقیق ہیں۔ اب آپ غور سے سنیں قسمیں کھا کر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن رسول کریم کا قول ہے۔ رسول کریم سے مراد جبریلؑ ہیں۔ اب اس قسم کی تصدیق چاہیئے اور جب اس کی تصدیق کی جائے گی۔ تو اس کی مراد یہ ہوئی کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ جبریلؑ کا کلام ہے۔ جب جبریل کا کلام ہوا تو غیر اللہ کا کلام ہوا۔ اور جب غیر اللہ کا کلام ہوا تو معجز نہیں ہو سکتا۔ اور جب معجز نہیں ہو سکتا تو یہ ہادی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ جبریلؑ نے گمراہی کے لئے یہ کلام رسول اللہؐ پر نازل کر دیا ہو۔ یہ بہت قوی شبہ ہے جس کی آئمہ متقدمین میں بڑی شہرت ہے۔ اس کے لئے کہا گیا ہے اشکال قوی بہت مشکل اعتراض ہے۔

قرآن شریف کے معجز ہونے کی جو دلیلیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک وجہ
تو فصاحت و بلاغت ہے۔ تو اس سلسلہ میں تو یہ ممکن ہے کہ غیر اللہ کا کلام بھی
فصیح و بلیغ ہو۔ تو اس سے بچنے کے لئے یہ کہا کہ جب ایک شخص معارضہ لکھنے بیٹھے گا تو
اس کی تمام طاقت اور علوم سلب ہو جائیں گے۔ اور لکھ نہیں سکے گا۔ اس کو صرف کہتے
ہیں۔ کہ لکھ نہیں سکے گا۔ اور دل پھر جلئے گا۔ تو دل کا پھیر دینا یہ خدا ہی کا کام ہے۔ تو
جب یہ ثابت ہو گیا کہ دل کا پھیرنا یہ خدا ہی کا کام ہے۔ تو یہ معجزہ ہو گیا۔ اور گمراہی کے
لئے نازل نہیں ہوا۔ بلکہ ہدایت ہی کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض لوگوں نے یہ جواب دیا کہ جبریل گمراہی کے لئے یوں نازل نہیں کر سکتے
کہ جبریل معصوم ہیں۔ لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جبریلؑ کا معصوم ہونا اس
بات پر موقوف ہے۔ کہ رسول صلعم کی صداقت ہو۔ اور رسول اللہؐ کی صداقت
اس بات پر موقوف ہے کہ ان سے معجزہ ہو۔ اور معجزہ جبریل کی جانب سے ہے
تو جبریل کی طہارت اور عصمت جبریل کی طہارت اور عصمت پر موقوف ہو گئی اور دور
لازم آیا۔ لہٰذا یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے یہ جواب دیا۔ معجزہ کے لئے اخبار
بالغیب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ فصاحت اور بلاغت کی بھی ضرورت
نہیں ہے بلکہ صرف کی یعنی جس کام کا ارادہ کیا ہے اس سے دل کو پھیر دینے کی
ضرورت ہے۔ تو جب کوئی شخص قرآن شریف کا معارضہ کرنے بیٹھے گا اور مقابلہ کے
لئے لکھنے بیٹھے گا۔ تو اس کی ساری طاقتیں اور علوم سلب ہو جائیں گی۔ اور وہ لکھ نہیں سکے
گا۔ تو تیرہ سو سال تک یہی ہوتا رہا کہ جس نے کوشش کی اس کا دل پھر گیا اور ساری
طاقتیں سلب ہو گئیں اور یہ طاقت کہ دل کو پھیر دے یہ صرف خدا ہی کا کام ہے

جبریل کا یا کسی اور کا کام نہیں ہے۔ تو معجزہ جو ہے وہ خدا ہی کا ہوا اور کلام جو ہے وہ خدا ہی کا ہوا۔ اور اضلال کے لئے نہیں ہوا ہدایت ہی کے لئے ہوا میں کہتا ہوں بہت غور کرنے کی اور اچھی بات ہے۔ یہ مجھے خدا نے سمجھائی۔ یہ بالکل سیدھی بات ہے۔ بحث کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک نے قسم کھائی ہے کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے۔ اور قسم کی تصدیق کرنا واجب ہے۔ یا کم سے کم درجہ میں اس کا احتمال ہو گیا یہ کلام خدا کا نہیں بلکہ جبریل کا کلام ہے۔ اس میں ذرا سی باریکی ہے۔ پس سوال یہ کرنا چاہیئے تھا کہ اس کا کیا جواب ہے۔ جب قسم کی تصدیق کر دی تو ظاہر ہے کہ کلام اللہ نہ رہا بلکہ رسول کریم کا کلام ہے۔ اس کا جواب میں یہ دیتا ہوں کہ جس کی قسم کو آپ نے تصدیق کیا ہے۔ وہ معتبر ہے؟ آپ جو کہتے ہو کہ حلفیہ بیان دیا۔ تو یہ بیان کس نے دیا۔ اگرچہ یہ جبریل کا قول ہے تو جو قسم ہے وہ بھی تو جبریل کا قول ہوا یعنی محمدؐ تک جو پہنچا یا وہ سب ہی تو جبریل کا قول ہوا ـــــ فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس تنفس تو یہ بھی پورا کا پورا جبریل کا قول ہے۔ اور تصدیق جب ہوگی جب یہ خدا کا قول ہو۔ خدا کہے کہ یہ جبریل کا قول ہے تو خدا کے قول کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ اور قسم کا اعتبار کرنا پڑے گا۔ اور پھر یہ دقت پیش آئے گی کہ یہ کلام اللہ نہیں رہا۔ بلکہ تصدیق کے ماتحت یہ کلام جبریل ہو گیا۔ تو اس وقت جواب دیا جائے گا۔ جو کچھ یوں ہوگا۔ یہ تو آپ نے یہ سمجھ کر اس کی تصدیق کی ہے۔ حلفیہ بیان کی کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو سوال ہی ختم ہو گیا۔ اس میں انوکھا پن یہ ہے کہ ادھر تو تصدیق کی کہ یہ خدا کا کلام ہے اور ادھر یہ اعتراض کر دیا کہ یہ خدا کا قول نہیں جبریل کا قول ہے۔ اگر یہ خدا کا کلام نہیں ہے تو قسم بھی خدا کا قول نہیں رہا۔ وہ قسم بھی غیر معتبر ہو گئی۔ وہ سارا ہی غیر معتبر ہو گیا۔ یہ شبہ یوں ہوا کہ قسم کھانے کو تو خدا کا فعل سمجھا۔

اور آگے جس چیز پر قسم کھائی ہے۔ اس کو جبریل کا قول سمجھا۔ اگر خدا الگ آکر براہ راست قسم کھالیتا اور وہ بات اس میں نہ لکھی ہوتی تب اس قسم کی تصدیق کی جاتی کہ بیشک یہ کلام اللہ نہیں جبریل کا کلام ہے۔ وہ قسم بھی تو اسی قرآن کی آیت اور ٹکڑے ہی میں کھارہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کلام اللہ ہے۔ اور کلام الجبریل نہیں بلکہ اعزاز ہے۔ یہ صرف اعزازاً کہا ہے۔ فاذا قرانٰہ فاتبع قرانہ (قیامہ-۱۸) جب ہم قرآن پڑھائیں تو اس پڑھائے ہوئے کی تصدیق اور اتباع کر۔ جب جبریل قرآن پڑھتے تھے تو آپ بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ خدائے تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم چپ چاپ سنتے رہو۔ آپؐ اس خیال سے پڑھتے تھے کہ بھول نہ جائیں تو اس کا جواب اللہ پاک نے دیا انّا علینا جمعہٗ وقرانہٗ ہم اس کو تمہارے دل میں جمع کر دیں گے۔ اور اس کو پڑھا دیں گے انّا علینا بیانہٗ (قیامت-۱۷) اس کا سمجھانا ہمارے ذمہ ہے تم اس کی فکر نہ کرو تو فاذا قرانٰہ جبریل کی قراءت کو اپنی قراءت فرمایا (قیامت-۱۹) تو گویا اس کی قراءت ہماری ہی قراءت ہے۔ یا ہماری قراءت اس کی قراءت ہے۔ تو اسی طرح سے یہاں ہے کہ قول رسول قول جبریل جو ہے۔ وہ دراصل ہماری قراءت ہے اِنّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ کے معنی ہیں انہ لقول جبریل کا کہنا میرا ہی کہنا ہے (تکویر-۱۹)۔ جس طرح جبریل کی قراءت میری قراءت ہے یا میری قراءت جبریل کی قراءت ہے اسی طرح میرا قول جبریل کا قول ہے اور جبریل کا قول میرا قول ہے۔ یہ تو اعزازاً کہا ہے۔ جیسے کہا گیا یٰیھا الذین اٰمنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہٖ اے ایمان والو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے آگے مت چلو۔ تو اللہ کے آگے کیا چلے گا (حجرات-۱) اعزاز کے لئے اللہ کا لفظ آیا کہ رسولؐ کے آگے چلنا اللہ کے آگے چلنا ہے۔ فرمایا

یٰیھا الذین اٰمنوا ... اے ایمان والو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اقتدا

کرو تو اللہ کی کیا اقتدا کرے گا۔ رسولؐ ہی کی اقتدا کو اعزازاً اللہ کی اقتدا قرار دیا۔ اسی طرح رسول کریم کے قول کو اپنا قول قرار دیا۔ یا اپنے قول کو رسول کریم کا قول قرار دیا۔ کیونکہ وہ یہ کہا کرتے تھے۔ کہ یہ شیطان ان کو آکر سکھایا کرتا ہے۔ یا کاہن اور جن اور جادوگر بتاتے ہیں۔ تو کہا کہ نہیں یہ سکھلانے والا رسول کریم ہے جس کی یہ یہ خصوصیات ہیں۔ شیطان جن اور کاہن وغیرہ کوئی نہیں بتاتا۔ یہ غلط بات ہے یہ میرا ہی قول ہے۔ دمن یطع الرسول فقد اطاع اللہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ اللہ کی اطاعت کی۔ بالکل یہی صورت یہاں ہے۔ (النساء - ۸۰) رسول کریم کا کہنا خدا کا کہنا ہے۔ اعزازاً یہ کہا ہے۔

اب جبریل علیہ کی چھ خصوصیتیں یا کمال بیان کئے ہیں۔ رسول کریم ذی قوت اور مطیع عند ذی العرش مکین۔ مطیع یہاں مطاع ہے اور ثم آمین۔ امانتدار ہے۔ اللہ کے پاس مطیع اور ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں اور چھٹی خصوصیت یہ کہ امانت دار ہیں۔ اور رسول اللہ صلعم کی بابت فرمایا کہ تمہارا صاحب مجنون نہیں ہے۔ تو یہ کوئی کمال نہیں ہے۔ جو لوگ موازنہ کرتے ہیں اور جبریلؑ کو آں حضورؐ سے افضل بتاتے ہیں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو جبریل کی شان میں یہ فرمایا اور محمد صلعم کی شان میں یہ فرمایا تو مجنون نہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ غیر نبی بھی اس میں شریک ہیں۔ اس لئے جبریلؑ افضل ہیں۔ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ انھوں نے ایک دلیل یہ بیان کی جو اوپر بیان ہوئی۔ مگر یہ غلط ہے۔ اور ہمارے یہاں کے علماء نے کوئی غلطی اس میں نہیں پکڑی۔ اور یہ کہا کہ یہ چھ باتیں مشترک ہیں۔ وہ ملکی رسول، یہ ملکی رسول، ان دونوں رسولوں میں کیا فرق ہے یہ میں آگے بیان کروں گا۔ دوسری بات کہی کریم۔ تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق کہیں کریم آیا ہے۔ اور محمد صلعم کے متعلق رؤف اور رحیم

کبھی آیا ہے۔ یہ بھی مشترک ہے۔ اب ذی قوت، قوت دار۔ تو اسے سمجھ لیں۔ قوت دار کے کیا معنی۔ قوت تدبیر۔ تو یہ کمال جو ہے۔ وہ درحقیقت قابل مدح نہیں ہے۔ مدبرات امر ہیں۔ لوطؑ کی قوم کو اشارہ پاتے ہی۔ اتنا بلند کیا کہ عرش والوں نے کتے بلی کی آواز جو اس زمین پر تھے سنی اور ایک سیکنڈ میں ان کو پلٹ دیا۔ اتنی قوت ہے ان میں۔ مگر یہ مادی قوت موجب انفضلیت نہیں ہے۔ جانوروں میں انسان سے بہت قوت زیادہ موجود ہے مگر وہ افضل نہیں ہیں۔ تو محض قوت کی زیادتی موجب انفضلیت نہیں ہے۔ تو قوت سے یہاں کیا مراد ہے۔ یہ تدبیر اور تصرف تو یہ تو موجب انفضلیت ہے نہیں۔ گدھا ہے۔ اونٹ ہے۔ انجن ہے۔ کتنا کتنا بوجھ گھسیٹ کرلے جاتے ہیں۔ تصرف کرتے ہیں۔ یہ سب مدبرات امر ہیں۔ اس سے گدھا اونٹ اور ریل کا انجن افضل نہیں ہو جاتے۔ ایک جماعت نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ قوت اطاعت الٰہی مراد ہے ٹھیک ہے وہ اللہ کے امر کے مطیع ہیں۔ نہیں بلکہ خدا کی تجلی کی برداشت کی بھی قوت ان میں ہے یا نہیں۔ جبریلؑ نے معراج کے موقعے پر کہا کہ اگر میں ایک قدم بھی آگے جاؤں گا تو جل جاؤں گا آپؐ آگے تشریف لے جائیں۔ تو خدا کی تجلی کی برداشت کی قوت محمد صلعم میں زیادہ ہے۔ تو اُن کا ذی قوت ہونا۔ ان کے لئے افضلیت کا موجب نہیں ہے ورنہ مشقت کے کام کرنے والے سب ذی حیات۔ غیر ذی حیات سب افضل ہو جائیں۔ لیکن نہیں یہ مدبرات امر ہیں۔ عندذی العرش مکین۔ اللہ کے پاس رہتے ہیں۔ یہ صفت بھی مشترک ہے عند ملیک مقتدر مومن جو ہے وہ بھی قادر بادشاہ (قمر۔ ۵۵) کے قریب ہیں۔ عندیت ان کو بھی حاصل ہے اور صحیح حدیث میں آیا ہے عندالمنکسرۃ قلوبہم میں ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوں عنداللہ ہونا اتنا

بڑھیا کمال نہیں ہے۔ جتنا عند العبد ہونا بڑھیا کمال ہے۔ اللہ بندہ کے پاس ہو یہ زیادہ کمال ہے۔ اس کے مقابلے میں کہ بندہ اللہ کے پاس ہو۔ تو یہ بھی ان کا کمال نہیں ہوا اب رہ گیا مطاع۔ تو ہر نبی جو بھیجا گیا ہے۔ وہ مطاع بننے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ فرمایا وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع ہم نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا الا یہ کہ وہ مطاع ہو۔ تو (نساء-۶۴) مطاع ہونا بھی ان کی کوئی خصوصیت نہیں۔ سب رسول مطاع ہیں۔ اب رہ گیا امین توانی لکم رسول امین۔ ہر نبی یہ کہتا چلا آیا ہے کہ میں اللہ کے احکام پہنچانے میں امانتدار (دخان-۱۸) ہوں خیانت نہیں کرتا۔ تو کہاں ثابت ہوئی فضیلت۔ چھ کمال بیان کئے ہیں سب مشترک۔ یہ تفصیل اور جرح کسی نے نہیں کی۔ انھوں نے اور دلائل بیان کئے ہیں وہ سب غلط ہیں میں نے ہر ایک کی تردید کر دی ہے۔ اہل سنت والجماعت علماء نے "انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں"۔ اس کی ایک دلیل یہ بیان کی ہے ان کے بھی دلائل غلط ہیں۔ دلیل یہ بیان کی کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ آدم مسجود ہے فرشتہ ساجد ہے اور مسجود ساجد سے افضل ہے۔ ملک نے سجدہ کیا۔ فاسجدوا لآدم فسجد الملائکہ سے ثابت ہے۔ اور مسجود ساجد سے افضل ہے۔ یہ بین بات ہے سب جانتے ہیں ان دونوں مقدموں سے معلوم ہو گیا کہ آدم فرشتوں سے افضل ہیں اور فسجد الملائکة کلهم اجمعون کل اور اجمع دونوں تاکید کے لئے آئے ہیں۔ تو کل میں جبریلؑ بھی آ گئے۔ کوئی باقی ہی نہیں رہا۔ تو جبریلؑ سے بھی افضل ہو گئے۔ مسجود ساجد سے افضل ہے۔ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جو ملائکہ سے انسان کو افضل مانتے ہیں۔ یہ غلط ہے اس دلیل سے یہ ثابت نہیں ہوتا اور ان کی مخالف کی جو دلیل ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اس پر ابن حزم نے یہ اعتراض کیا۔ بڑی عجیب بات ہے۔ آپ غور کریں۔ انھوں

نے کہا نہیں مسجود کا ساجد سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ تو سجدۂ تعظیم تھا۔ اور مسجود کی افضلیت جب ثابت ہوگی۔ جب مسجود سے افضل اس کی تعظیم کرے۔ اگر ادنیٰ تعظیم کریں گے تو ظاہر ہے وہ بے کار ہے۔ ادنیٰ کی تعظیم سے تو عظمت حاصل ہی نہیں ہوگی اگر فرشتے آدم سے ادنیٰ تھے تو آدم کو کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوگی۔ مقصد آدم کی تعظیم کرانی تھی تو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ گو وہ سنی عقیدہ کے ہیں لیکن وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ملائکہ افضل ہیں۔ انسان سے میں نے اس کو کاٹ دیا۔ یہ دلیل ان کی غلط ہے۔ اس میں دھوکا یہ لگا ہے کہ ملک افضل تھے جبھی تو ان سے سجدہ کرایا تو کب افضل تھے۔ سجدہ کرنے سے پہلے افضل تھے۔ جب تک آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اور آدم پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک فرشتے افضل تھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے کتنی باریک بات نکالی ہے۔ جب سجدہ کرا دیا تو افضلیت کا کمال ختم ہوا۔ اب یہ افضل ہے۔ تو سجدہ سے پہلے افضل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سجدہ کے بعد بھی افضل ہوں۔ جس نے سجدہ کیا وہ ادنیٰ ہوا اور جس کو سجدہ کیا وہ اعلیٰ ہوا۔ یہ میں نے سمجھا اور بیان کر دیا۔ اصل دلیل پر اعتراض یہ ہے کہ تعظیم جو ہے وہ موجب سجدہ نہیں ہے۔ تعظیم نہیں چاہتی کہ سجدہ کیا جائے۔ تعظیم کی بناء پر سجدہ نہیں ہوا۔ سجدہ تعظیم غلط ہے بالکل۔ یہ بھول ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں ایک خواجہ حسن نظامی تھے انھوں نے سجدہ تعظیم پر ایک رسالہ لکھا۔ جو ملا واحدی میرے شاگرد ہیں ان سے میں نے کہا کہ تم ایک رسالہ لکھ دو اور ایک یہاں مفتی صاحب ہیں زاہد القادری ان کا شاید انتقال ہو گیا ہے۔ ان سے رد کرا دیا تھا۔ یہ چالیس سال کا واقعہ ہے کہ غلط ہے۔ اگر پرانے اماموں نے یہ بات لکھ دی ہے۔ تو یہ کوئی اچھی بات نہیں کی۔ ان سے بھول ہوئی۔ نماز کے سامنے سے جو آدمی گزرے گا۔ سینہ دو فٹ سے زیادہ

چوڑا نہیں ہے۔ دو فٹ کی مسافت پونے دو گز کا آدمی کتنی جلدی طے کرے گا۔ سیکنڈ کے ننھے حصے میں گزر جائے گا۔ تو سیکنڈ کے ننھے حصے نماز کے سامنے کھڑے ہونے کی حالت میں گزرنا سب کے نزدیک ممنوع ہے۔ اس کی علت کیا ہے، تاکہ وہ معبود نہ سمجھا جائے قیام کی حالت سجدہ سے قطعی گھٹیا ہے۔ قیام یعنی گھٹیا عبادت کے سامنے ہونا ..ہر سیکنڈ کے لئے ممنوع قرار دے دیا جائے کہ سجدہ کیا جائے۔ اس کے سامنے یہ بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔ عظمت اگر موجب سجدہ ہوتی تو اللہ پاک ازل سے ابد تک ہر وقت اس کی عظمت جوں کی توں ہے تو اللہ پاک کو سجدہ ہر آن لازم اور واجب ہو جاتا حالانکہ اوقات مکروہہ میں سجدہ حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ عظمت علت سجدہ نہیں ہے کیونکہ سجدہ کی علت اگر عظمت ہوتی۔ تو جس وقت اوقات مکروہ ہوتے ہیں اللہ پاک کی عظمت اس وقت میں موجود ہے۔ اگر عظمت متقاضی سجدہ ہوتی تو اوقات مکروہہ میں بھی اللہ کو سجدہ جائز اور صحیح ہوتا۔ تو اب علت سجدہ جب عظمت نہیں ہے۔ تو کیا ہے۔ وہ امر الٰہی ہے۔ اس کا امر ہوا کہ سجدہ کرو سجدہ کیا جاتا ہے۔ اگر وہ حکم نہ دیتا تو اس کو کوئی سجدہ نہ کرتا۔ دوسرے طریقے سے بھی یہ غلط ہے۔ یوسف علیہ السلام کو یعقوبؑ نے سجدہ کیا اگر سجدہ علت عظمت ہوتا تو یعقوبؑ سے یوسفؑ افضل ہوتے مگر سب کے نزدیک یعقوبؑ یوسفؑ سے افضل ہیں۔ اصل میں یہ اصول ہی غلط ہے۔ دلیلیں اور ہیں جو لوگ فرشتوں کو افضل بتلاتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبات وفضلنٰھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا (اسریٰ - ۷۰) مخلوق پر ہم نے انسان کو اور بنی آدم کو فضیلت دیدی۔ فضیلت اکثر پر دی کل پر نہیں دی۔ تو مخلوق کا کچھ حصہ ایسا ہے جس پر انسان کو فضیلت نہیں دی۔ اسی لئے فرمایا علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا

اگر یہ ملائکہ سے بھی افضل ہوتا تو کوئی قوم باقی نہیں رہی تو سب پر فضیلت ہوتی اور اس نے یہ کہا ہوتا علی کل ممن خلقنا ہم نے تمام مخلوق پر فضیلت دیدی۔ اہل سنت والجماعت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ عبارت کو نہیں سمجھے۔ اکثر اور کثیر یہ کل کے مقابلے کے ہیں۔ اگر کل میں سے کچھ بھی نکال دیا جائے تو وہ کل نہیں رہے گا۔ جو بچے گا وہ کثیر اور اکثر ہی ہوگا۔ اب اس کائنات میں دو ہی جماعتیں ہیں ایک افضل اور ایک مفضول تو کل جو ہے وہ افضل جمع مفضول ہے۔ اس میں افضل تھوڑی سی مخلوق ہے باقی مفضول مخلوق جو ہے وہ کثیر ہے تو کل کائنات میں سے انسان جب نکال لیا جائے گا تو جو مخلوق بچے گی وہ کل نہیں ہوگی کثیر ہوگی۔ اس میں نصاحت د بلاغت ہے کہ کثیر پر فضیلت دی۔ اس لئے کثیر پر افضل ہونا ہی کل مخلوق پر افضل ہونا ہے اور فضیلت کی یہ وجہ ہی نہیں ہے۔ میں نے اس پر ایک رسالہ لکھ دیا ہے۔ دونوں جماعتوں کی نظر ظاہری اسباب پر ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملائکہ کی عبادت بہت زیادہ ہے۔ زیادہ عبادت والا اس سے افضل ہے۔ جس کی عبادت کم ہو۔ یہ دلیل غلط ہے۔ اس لئے کہ نوح؈ کی عبادت حضرت صلعم کی عبادت سے زیادہ ہے۔ مگر وہ افضل نہیں ہیں۔ انھوں نے ۹۵۰ برس اسی طرح عبادت اور تبلیغ خلوص نیت کے ساتھ کی ہے۔ جس طرح حضور صلعم نے ۲۳ برس کی ہے تو ۲۳ سال کی عبادت والا ۹۵۰ سال کی عبادت والے سے افضل ہے تو زیادہ عبادت موجب افضلیت نہ رہی۔

اگر عبادت کی مشقت باعث افضلیت ہوتی تو اگلی قوموں پر بڑی شاق عبادتیں مقرر کی گئی تھیں وہ اس امت سے افضل ہو جائیں۔

اگر زہد اور تقویٰ موجب فضیلت ہو تو یحییٰؑ نے شادی کبھی نہیں کی اور دنیا سے نہ ہد رہا ان کو تو چاہیئے وہ تمام انبیاء سے افضل ہو جائیں۔ مگر نہیں ہیں۔ اگر علم موجب فضیلت ہوگا تو خضرؑ موسیٰؑ سے افضل ہو جائیں گے مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ موسیٰؑ خضرؑ سے افضل ہیں۔ پھر یہ ثابت کبھی پوری طرح نہیں ہے کہ آدمؑ کو فرشتوں سے زیادہ تھا۔ علم آدم اسماء کلھا۔ آدم کو کل نام سکھا دیئے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ کبھی ان ناموں کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور کہا اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ خبر دو مجھ کو ان چیزوں کے ناموں کی اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو انھوں نے یہ کہا تھا کہ یہ فساد اور خونریزی کرے گا۔ یہ مستحق خلافت نہیں ہو سکتا۔ (بقرہ-۳۱) اللہ نے کہا تم کیا جانو مستحق خلافت کون ہے۔ پھر اللہ نے نام سکھائے، معارضہ کرایا اور فرشتے ہار گئے مگر اس سے استحقاق خلافت کہاں ثابت ہو رہا ہے۔ بتانا تو یہ چاہیئے تھا کہ تم نہیں جانتے وہ استحقاق خلافت یہ ہے۔ یہ ثابت نہیں ہوا۔ اس کو سمجھ لیں۔

اسماء سکھائے یا اسماء کے مسمیات سکھائے۔ جن چیزوں کے یہ نام ہیں ان چیزوں کو سکھایا وہ چیزیں حقائق ہیں۔ تو اللہ پاک نے آدم کو حقائق کا علم دیا یا حقائق کے ناموں کا علم دیا۔ بہرحال دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔ علم آدم اسماء کلھا یعنی اسماء المسمیات کلھا۔ یہ معنی ہو گئے مسمیات کے نام سکھائے۔ یا مسمیات سکھائے۔ اگر یہ بات ہے کہ چیزوں کی حقیقت آدمؑ کو بتا دی تو یہ ظاہر ہے کہ آدمؑ ملائکہ سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ زمین آسمان چاند سورج اور دیگر حقائق کو آدمؑ ان کو قطعی نہیں جانتے تھے۔ یہ شیطان کی دشمنی وغیرہ، کیونکہ ملائکہ تو منتظم اور مدبر عالم ہیں۔ ان کو زیادہ معلوم ہے کہ یہ ریزہ ریزہ ذرہ ذرہ فلاں فلاں شے

کیا ہے۔ تو اللہ پاک نے حقائق کا علم آدمؑ کو ملائکہ سے زیادہ نہیں دیا۔ اور اگر اسماء مراد ہیں تو ہر نبی کو مختلف زبانوں میں تعلیم دیتے چلے آرہے ہیں۔ وہ ہر زبان جانتے ہیں اور برابر گفت و شنید ہو رہی ہے۔ اللہ سے انھوں نے گفتگو کی۔ آدمؑ سے کی شیطان سے کی۔ تو چیزوں کے نام بھی وہ جانتے تھے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تمام نام نہ جانتے ہوں مگر اکثر کو جانتے تھے اور آدم کی زبان بھی جانتے تھے۔ تو یہاں یہ مضمون نہیں لگتا عرضہم میں یہ ہم کا ضمیر ذوی العقول کے لیے ہے اور اسماء کی طرف ہو تو عرضہم نہیں

بلکہ غزنیہا ہونا چاہیئے تھا۔ تو یہ ھُمَ ضمیر جو ہے یہ وہم میں ڈال رہا ہے۔ اور فرشتوں کو خجالت اور شرمندگی جب ہوگی جب ان کے خیال کے خلاف بات پیدا ہوگی۔ تو یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ خونریزی کرے گا۔ یہ مستحق خلافت نہیں ہے۔ کیونکہ جو فساد اور خونریزی کرے وہ مستحق خلافت نہیں ہے۔ تو اللہ پاک نے ان کی تحدید اجمالی کی اور فرمایا: انی اعلم ما لا تعلمون (البقرہ-۳۰) میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی تم کیا جانو یہ میں جانتا ہوں کہ مستحق خلافت کون ہے۔ تو ان کا چاہیئے اس طریقے سے ہو سکتا تھا۔ کہ وہ ایسی چیز خلافت کی ظاہر کرتا کہ وہ دیکھ کر ششدر رہ جاتے کہ ان میں یہ خوبی ہے۔ تو اس نے کیا کیا۔ کہ علم آدم الاسماء الخلفاء کلھا ۔۔۔۔ قیامت تک کے جتنے انبیاء اور قطب اور ولی تھے ان سب کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے کہ خلفاء اللہ کے یہ ہیں۔

پھر ان سب خلیفاؤں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر کہا۔

انبئونی باسماء ھولاء خلفائی :- یہ ہیں میرے خلیفہ ذرا ان کے نام تو بتاؤ۔ تم جانتے ہو یہ کون ہیں۔ تو انہوں نے کہا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا (البقرہ-۳۲) تو نے جس کے نام ہمیں بتائے ہم ان ہی کے نام جانتے ہیں سب کے نہیں جانتے۔ تو اللہ پاک نے کہا یہ ہیں میرے خلیفہ یہ خونریزی کریں گے؟ یہ فساد کریں گے؟ ان پر تم جرح کرتے تھے۔ تم ان کے نام تک تو جانتے نہیں اور تم ان پر جرح اور طعن کرتے ہو انبئونی باسماء ھولاء ان کنتم صدقین (البقرہ-۳۱) اگر تم سچے ہو تو اور کچھ نہیں چلو ان کے نام ہی بتاؤ۔ بہت بڑھیا تاویل ہوگئی۔ مطلب یہ ہے۔ اور اگر علم موجب فضیلت

ہوتا تو خضرؑ حضرت موسیٰؑ سے افضل ہو جاتے ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت رشدا میں آپ کی پیروی کرنی چاہتا ہوں اس علم میں جو آپ کو حاصل ہے۔ خدا کی طرف سے۔ وہ آپ مجھے سکھایئے (کہف ۶۶) تو انہوں نے بڑی بے اعتنائی سے کہا لن تستطیع معی صبرا تو ہرگز بھی میرے ساتھ صبر نہ کر سکے گا۔ (کہف ۶۷) اتنے بڑے جلیل القدر نبی کو اس طرح ڈانٹ دیا کہ تو میرے ساتھ کیا رہ سکے گا۔ میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس میں نبی کی توہین ہوتی ہے۔ جب انہوں نے یہ کہا

ستجدنی ان شاء اللہ صابرا ولا اعصی لك امرا (کہف ۶۹)

میں ان شاء اللہ ٹھہرا رہوں گا۔ اور تیرے ہر حکم کو مانوں گا۔ اور تیرے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ تب انہوں نے کہا۔ پھر بھی سختی کی کہا فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شیئ اگر تو میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو ہرگز مجھ سے (کہف ۷۰) بات نہ کیجو حتی احدث لك منه ذکرا یہاں تک کہ میں خود ہی تجھے کچھ بتا دوں۔ کس واقعہ کے متعلق۔ تو علم کی بنا پر خضرؑ موسیٰؑ سے افضل ہو جاتے مگر سب قومیں جو موسیٰؑ کو نبی مانتی ہیں۔ یہودی بھی مسلمان بھی سب اس پر متفق ہیں کہ موسیٰؑ خضرؑ سے افضل ہیں۔ اور اگر علم موجب افضلیت ہو تو شیطان کو سب سے زیادہ علم ہے۔ ہر آن کی اسے خبر ہے۔ خون کی طرح دوڑتا ہے جو آپ کے دل میں خطرہ گزر جاتا ہے۔ اس کا بھی اس کو علم ہو جاتا ہے صرف علم ہی نہیں ہے۔ وہ خود خطرہ اس میں پیدا کرتا ہے۔ انه یرکم هو وقبیله وہ اور اس کی قوم تم کو برابر دیکھ رہی ہے۔ (اعراف ۲۷)

مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف - ۲۷) اور تم اس کو نہیں دیکھتے۔ اسی لئے تو اس نے کہا کہ جب میری اس کی دشمنی ہو گئی تو تو مجھے قوت دے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ جہاں اس کا ایک بچہ ہو گا وہاں تیرا بھی ایک بچہ ہو گا۔ کہا اور دے تو کہا تو خون کی طرح اس کے بدن میں دوڑ جائے گا۔ کہا اور دے کہا

تمام مرد و زن اور تمام اس کے مال اور اولاد تمام میں تجھے اسکا شریک کر دیا۔ پوری قوت اس کو دیدی جب آدم ؑ کو علم ہوا تو انہیں بڑا رنج ہوا کہ تو نے میری اس کی دشمنی کر دی اور اس کو اتنی بڑی طاقت دیدی۔ تو اللہ پاک نے کہا کہ پورا یاد نہیں رہا آخری بات بتا دوں کہ آخر سانس تک جب تک غرغرہ نہیں لگے اس وقت بھی توبہ کرے گا۔ تو میں معاف کر دوں گا۔ ہر طرح سے گنجائش دیدی۔ اور بھی کئی باتیں فرمائیں یاد آگئیں تو بیان کر دوں گا۔ اور میں نے جب موازنہ کیا تو شیطان کی قوت کو زیادہ پایا۔ تو میں نے کہا یہ تو رحمت پر غضب غالب ہو گیا۔ تو ایک عجیب بات خدا نے میرے دل میں فوراً ڈالی وہ یہ ہے کہ شیطان کو بہت زیادہ قوت دی لیکن اصل بات یہ ہے کہ شیطان کو یہ جتنی قوتیں دی گئی ہیں یہ سب پرائیویٹ اور مخفی ہیں۔ اور یہ سب قوتیں برا کرنے والا اپنے لئے اپنا رہا ہے۔ مثلاً شراب پینے کو دل چاہا۔ بہکایا تو شیطان نے یہ قوت دی۔ اس نے دی مگر پینے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ میرے خود دل میں یہ ہے اور ایک یہ ہے کہ میں شراب خانے میں آپ کو لے چلوں اور جبراً کہوں کہ پینی پڑے گی ورنہ میں آپ کی تنخواہ بند کر دوں گا۔ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے، تو گناہ کے دھوکے کے، گمراہی کے، جتنے اسباب ہیں سب مخفی ہیں اور وہ ایسے

اسباب ہیں کہ انسان ان کو اپنا رہا ہے۔ چور رات کو چوری کر لیتا ہے اور صبح کو جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ شیطان نے مجھ سے چوری کرائی۔ یہی کہتا ہے کہ ہاں میں نے چوری کر لی۔ اور شرمندہ ہوتا ہے کہ بے شک میری غلطی ہے۔ لیکن ہدایت کے لئے نبی کو بھیجا کہ ظاہری سبب ہے بتا رہا ہے۔ کہ اس گمراہی میں نہ جائیو۔ معلوم ہوا کہ ہدایت کے اسباب زیادہ ظاہر اور قوی ہیں۔ اور ضلالت کے اسباب پوشیدہ اور کمزور ہیں۔ اب بھی اس کی رحمت ہی غالب ہے۔ یہ نکتہ میرے خیال میں آیا تھا۔ جو میں نے آپ کو بتا دیا۔ کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔ اگر شیطان نبی کی طرح ظاہر اپنی تمام قوتوں کے ساتھ آتا تو وہ قوی ہو جاتا۔ یہ بحث بیچ میں آگئی۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ علم موجب افضلیت نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ علم والا زیادہ علم والے سے افضل ہو۔ جس طرح صحابہ اتنے بڑے عالم نہیں تھے جتنے بعد کے علماء جلیل القدر ہوئے ہیں۔ مگر افضلیت صحابہ ہی کو حاصل ہے۔ تو علم موجب افضلیت نہیں۔ کیونکہ یہ سبب ہے کام کے کرنے کا۔ موثر نہیں ہے۔ ارادہ کو قوی کرنے اور مراد تک پہنچنے کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ یہ موجب نہیں ہے۔ موجب افضلیت نہیں ہے۔ ظاہر دیکھیں کہ علماء کو جہلا پر افضل ہونا چاہیئے۔ مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا اور یہ جو فرمایا:—

ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون کیا عالم و جاہل برابر ہیں۔ (زمر-۹)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جاہل سے عالم افضل ہیں تو یہ ٹھیک ہے کہ علم کا جہل سے جب مقابلہ ہو گا۔ تو علم جہل سے قطعی افضل ہے۔ لیکن علم جس محل میں ہے۔ یعنی عالم اور جہل جس محل میں ہے۔ یعنی جاہل تو جہل کے محل کا پتہ

نہیں کہ وہ کتنا قیمتی ہے۔ اور علم کے محل کا پتہ نہیں وہ کتنا کم قیمت ہے
تو قیمتی شئے علم کو کم قیمت محل میں جاکر اور کم قیمت جہل قیمتی محل میں جاکر
مجموعہ جہل مجموعہ علم سے افضل ہو جائے گا۔ قدرت کو لے لیجئے۔ بادشاہ کے
پاس سب سے زیادہ قدرت ہوتی ہے۔ مگر اس کی رعیت میں ایسے لوگ موجود
ہوتے ہیں جو باوجود کم قدرت رکھنے کے بادشاہ سے افضل ہوتے ہیں۔
اگر روحانیت کو لیں تو عیسےٰ علیہ السلام میں روحانیت سب انبیاء سے زیادہ تھی۔
روح القدس ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ بغیر باپ کے پیدا
ہوئے تھے۔ مادیت ان میں سب سے کم تھی مگر وہ حضور اکرمؐ کیا اکثر انبیاء سے
افضل نہیں ہیں۔

زہد اور مشقت بھی موجب افضلیت نہیں کیونکہ ہندوؤں کے یہاں
جتنا زہد و مشقت ہے کسی پیغمبر کے یہاں نہیں مگر وہ بالاتفاق کافر ہیں۔

بہرحال معیار فضلیت ان اسباب ظاہری میں سے کوئی نہیں ہے
سوائے اختیار کے۔ یعنی جو وجہ انسان کے تمام کائنات سے افضل ہونے
کی ہے۔ وہی وجہ جن میں تمام انسانوں سے افضل ہونے کی ہے۔ اور
وہ وجہ صرف اختیار ہے۔ اور کوئی نہیں۔ اور اختیار کے یہ معنی ہیں کہ چاہے
کرے چاہے نہ کرے۔ اور یہ فطرتاً ہوتا ہے۔ عقل نہیں ہے۔ معیار فضلیت
فطرت میں داخل نہیں ہے۔ یہ بعد میں آتی ہے۔ اگر عقل موجب فضلیت ہوتی
تو یہ فطری ہوتی۔ بچہ پیدا ہوتا تب ہی ہوتی۔ مگر نہیں ہوتی۔ بچہ ہر شے منہ
میں رکھ لیتا ہے۔ بالکل تمیز نہیں ہوتی۔ اختیار ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ عقل

کا درجہ پیچھے ہے۔ اصل چیز اختیار ہے۔ اور وہ اختیار ایسا ہو کہ جبر اس کو نہیں لا رہا ہے۔ یہ نکتہ کی بات ہے۔ یعنی بھوک پیاس شہوت غضب یہ جبری قوتیں اس کے متعلق کرنے کا سبب نہیں بن رہی ہیں۔ بلکہ اس ناقص اختیار کو فعل پر لانے کے لئے کامل اختیار لا رہا ہے۔ اور اس کامل اختیار کے لانے کے معنی ہی امر الٰہی کے ہیں۔ اگر امر الٰہی اس اختیار کو ترجیح دے رہا ہے تو یہ سارے عالم سے افضل ہے سوائے خالق اختیار کے۔ انسان کی فضلیت کا باعث اختیار ہے اور کوئی مخلوق با ختیار نہیں ہے۔ ملائکہ عبادت پر مجبور ہیں۔ انسان عبادت پر مختار ہے۔ چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ وہ ایمان پر مجبور ہیں۔ یہ ایمان پر مختار ہے۔ اصل وجہ ملائکہ سے افضل ہونے کی یہ ہے باقی انہوں نے جو وجہیں بتائی ہیں۔ وہ یا نا تمام ہیں یا کمزور ہیں یا غلط ہیں اور جامع دلیل یہ ہے کہ ملائکہ کا وجود اول ہوا ہے۔ پہلے جو شے مہیا کی جائیگی وہ مقصود نہیں ہوگی اس پہلی شے سے کوئی اور شے بنے گی۔ وہ مقصود ہوگی۔ اور وہاں کام ختم نہیں ہوا۔ تو تیسری شے بنے گی وہ مقصود ہوگی ــــــ اور یہ غیر مقصود ہوگی۔ اسی طرح یہ سلسلہ وہاں تک جائے گا جہاں تک کام ختم نہ ہو۔ یہ بڑا عجیب قانون ہے۔ جس پر میں مطلع ہوا۔ اور آپ کے سامنے بیان کیا کہ پہلے مفردات کو بنایا۔ پھر جمادات کو پھر نباتات کو پھر حیوانات اور سب سے آخر میں انسان کو بنایا۔ اور کام ختم کر دیا۔ اور نیچے کے جتنے اجزا ہیں۔ اوپر والوں میں خرچ اور صرف ہو رہے ہیں۔ جمادات نباتات میں صرف ہو رہے ہیں۔ نباتات حیوانات میں صرف ہو رہے ہیں اور حیوانات انسان میں صرف ہو رہے ہیں۔ مگر

انسان کسی اور شے میں صرف و خرچ نہیں ہو رہے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ انسان مقصود کائنات ہے۔ وہ آخر میں بنا ہے۔ جو شے آخر میں بنے گی وہ مقصود ہو گی۔ ملائکہ پہلے پیدا ہوئے۔ وہ ذرائع ہیں مقصود نہیں ہیں۔ اسباب ہیں مبادی ہیں۔ اگر یہ مقصود ہوتے تو ان کو پیدا کر کے کام ختم ہو جاتا مگر کام ختم نہیں ہوا۔ اور انسان کو پیدا کر کے کام ختم ہو گیا۔ تو انسان ہی مقصود کائنات ہوا۔ اور مقصود افضل ہوتا ہے۔ ذریعہ مفضول لہٰذا انسان ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس سے بڑھیا دلیل نہیں ہو سکتی۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ تمہاری جو مشیت ہے وہ ہی وہ مشیت ہے جو رب العالمین کی مشیت ہے۔ یعنی اگر اللہ رب العالمین چاہے گا۔ تو تم کو نیکی کی توفیق عنایت کرے گا۔ یہ واقعہ ہے لیکن اپنے دل میں آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ تو جس وقت یہ تصور ہو گا کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ اس وقت علم الٰہی متعلق ہو گا جس وقت آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ خدا کر رہا ہے۔ اس وقت کوئی علم نہیں ہے۔ ابھی آپ یہ کہیں کہ یہ معلوم ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہوا۔ یہ سنا ہے آپ نے آپ کو یہ علم ہے کہ یہ زمین و آسمان خدا کا فعل ہے۔ آپ کا نہیں ہے۔ اس طرح سے آپ کو یہ علم ہو جائے گا کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ آپ نہیں کر رہے ہیں بلکہ خدا کر رہا ہے۔ آپ کو اپنی عبادت بیان تقریر کے بارہ میں یہ علم ہو کہ یہ خدا کا فعل ہے اور ان میں آپکی قدرت کو کوئی دخل نہیں ہے تو اس وقت تکلیف ساقط ہو جائے گی۔ انسان سو رہا ہے استغراق میں ہے۔ جذب میں ہے۔ اس وقت نہ روزہ ہے۔ نہ نماز ہے۔ نہ حج ہے نہ زکوٰۃ ہے۔ کچھ فرض نہیں ہے۔ سب ساقط ہیں۔ تمام تکلیفیں اس وقت ہیں۔

جب آپ یہ سمجھیں کہ یہ میں کر رہا ہوں ۔ واقعہ بتایا کہ واقع میں یہی بات ہے۔ یہ نہیں ہے کہ سننے کے بعد آپ یہ کہیں کہ بس چھوڑ دو عمل کو۔ نہیں پوری ذمہ داری آپ پر کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ میں کر رہا ہوں۔

اگر اللہ پاک چاہے تو آپ کوئی نیک کام کر سکتے ہو

اگر اللہ نہیں چاہے تو نہیں کر سکتے تو مجبور ہو گئے

یہی تو دھوکہ ہے۔ اللہ پاک اگر نہ چاہے تو ہم کوئی نیک کام نہیں کر سکتے۔ یہ صحیح ہے مگر اس کو صحیح ہونے کے کیا معنی کہ نیکی ہم خود نہیں کر سکتے۔ اللہ نہیں چاہتا کہ اسوقت ہم کسی کو ایک پیسہ خیرات دیں۔ تو ہم نہیں دیں گے۔ تو ہم مجبور ہو گئے۔ نہیں بلکہ وہ پیسہ ہم خود نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارا اپنے ارادہ سے فعل نہ کرنا ہی خدا کا نہ کرنا ہے۔ یعنی خدا نہیں چاہتا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نہیں چاہتے۔ اور ہم نہیں چاہتے کے یہ معنی ہیں کہ خدا نہیں چاہتا۔ اور اگر خدا کی مشیت الگ ہو اور بندہ کی مشیت الگ ہو تو ہو سکتا ہے۔ متفق ہو جائے اور ہو سکتا ہے کہ ٹکرا بھی جائے۔ جیسے میری اور آپ کی مشیت آپ ایک کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں وہ نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں بھی وہی کرنا چاہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں خدا جو چاہ رہا ہے وہ وہی بات ہے جو ہم چاہ رہے ہیں۔ اب خدا یہ چاہتا ہے کہ ہم بیان کریں۔ ہم خوشی سے آ رہے ہیں۔ اور بیان کر رہے ہیں۔ مگر ہم یہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ ہم خود کر رہے ہیں۔ یعنی خدا جو چاہتا ہے۔ وہی ہم کریں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ ہم اس کے چاہنے سے مجبور ہیں۔ ہم اس کے چاہنے سے مجبور جب ہوں گے جب ہماری اور اس کی مشیت الگ الگ ہو گی اور اگر ہماری اور

اس کی مشیت الگ الگ ہو گی تو دونوں میں ٹکراؤ ہو جائے گا۔ اور کوئی کام نہیں ہو گا وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین کے یہ معنی ہیں کہ دراصل میں جو مشیت تمہاری ہے۔ استقامت کی وہ اللہ رب العالمین کی مشیت ہے اور تم استقامت چاہ نہیں سکتے جب تک تمہیں توفیق نہ ہو گی۔ اور وہ توفیق کیا ہو گی۔ کہ تم خود چاہنے لگو گے۔ ظاہر میں تمہارے چاہنے سے وہ نیک عمل ہو گا اس کا تمہیں انعام ملے گا۔ اس طرح ظاہر میں تمہارے چاہنے سے جو عمل ہو گا اس کی سزا تمہیں ملے گی۔ لیکن اندر خانے وہ سب خدا ہی کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ تو یہ تو اندر خانے ہے وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العلمین ظاہر میں تم خود ذمہ دار ہو۔ تمہاری مشیت قدرت سبب موجود ہے۔ اور تم کو حکم دیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ وہاں توفیق کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر توفیق کا سوال ہوتا تو کام کیسے ہوتا۔ حکم ہوا نماز پڑھو۔ تو اندر خانے تو وہ توفیق دے گا تو نماز پڑھے گا۔ مگر ظاہر میں تمام اسباب قدرت، قوت موجود ہے۔ کچھ مانع نہیں ہے۔ اگر ظاہر میں کوئی مانع ہو گا۔ تو اس کی کوئی ذمہ داری نہیں وہ سب معاف ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ
يَسْتَوْفُوْنَ ۝ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ؕ
اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ۙ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ۙ
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ؕ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ
الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ؕ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ؕ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ۝ؕ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ۙ الَّذِيْنَ
يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ؕ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا
كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ۙ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ؕ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۝ۙ
ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ؕ
كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ۝ وَ
مَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝ۙ

یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝
عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ۝ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ
نَضْرَةَ النَّعِیْمِ ۝ یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۝
خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝
وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ ۝ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا
الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَكُوْنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
یَتَغَامَزُوْنَ ۝ وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا
فَكِهِیْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ
لَضَآلُّوْنَ ۝ وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ حٰفِظِیْنَ ۝
فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ یَضْحَكُوْنَ ۝
عَلَی الْاَرَآئِكِ یَنْظُرُوْنَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ
الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝

(سورہ مطففین ۔ ۱۳۔)

مطففین

وَيۡلٌ۔ افسوس جہنم کی وادی۔ عذاب۔

مُطَفِّفِيۡنَ۔ مطفف ڈنڈی مار۔ کم تولنے والا خفیہ طور پر۔

كَلَّا۔ ہرگز نہیں ایسا چاہیئے۔ ڈانٹنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

سجین: تنگ، تاریک شیاطین کے رہنے کی جگہ۔

کتاب فجار سجین میں ہے اور سجین کتاب مرقوم میں ہے۔ یعنی کتاب فجار مرقوم ہے مرقوم میں ہے یعنی کتاب فجار مرقوم ہے۔ کتاب مرقوم میں۔ کتاب مرقوم میں اور بھی چیز ہو سکتی ہیں اور یہ کتاب مرقوم ایک رجسٹر ہے جو دفتر سجین میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں ذرا سی دقت یہ ہے کہ چپکے سے چھپا کر ڈنڈی مارنے والا چند تولہ کم تولتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات پر اتنا بڑا عذاب ایسی وعید ہے یہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ غور طلب ہے اور بہت باریک بات ہے۔

ہر شخص کا یہ جذبہ ہے کہ مساوات ہو انصاف ہو۔ اور مغلوب نہ ہو تو جب ایک شخص نے ذرہ ذرہ برابر کم تول دیا تو وہ ذرہ برابر غالب ہو گیا۔ اور عدل جاتا رہا۔ جب عدل جاتا رہا تو سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہر شخص یہ خواہش کرے گا کہ وہ غالب ہو۔ تو ایسی صورت میں ہو گا۔ یہ کہ عدل جاتا رہے گا۔ اور نظام کائنات بگڑ جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمَا خَلَقۡتُ الۡاِنۡسَ وَالۡجِنَّ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنَ انسان اور جن کو عبادت کے لئے

(الذاریات۔ ۵۶)

پیدا کیا یعنی یہ کہ انسان کوشش کرے کہ اپنے آپ کو قائم رکھے۔ کھائے پیئے اور طاقت پکڑے اور جب طاقت حاصل ہو جائے تو عبادت کرے۔ یہ کاروبار سب اس لئے ہے کہ انسان کھائے پئے بیاری دفعہ ہو جائے اور آرام پائے اور جو وقت بچے اس میں اللہ کی عبادت کرے۔ جب ڈنڈی مارے گا تو عدل غارت ہو جائے گا۔ کھانے پینے کی چیزوں کے حاصل کرنے میں وقت پیش آئے گی۔ پھر عبادت کا وقت نہیں ملے گا۔ اور جب عبادت نہیں کرسکے گا۔ تو جو جزا مرتب ہے عبادت پر وہ اس کو نہیں ملے گی اور بے سود ہو جائے گی۔ تو سارا نظام عقبےٰ اور سارا نظام دنیا سب ایک ادنیٰ اسی ڈنڈی مارنے سے تباہ ہو جائے گا۔ اس لئے اتنی عظیم الشان سزا اس کے لئے مقرر کی ہے۔ تو نظام عالم ضروری ہے اور نظام عالم ہو نہیں سکتا۔ بغیر خوف اور جزا کے اور خوف روز جزا نہ ہو تو نظام صحیح نہیں ہوسکتا۔ اگر کہو کہ حاکم درست کرسکتا ہے تو یہ غلط ہے۔ حاکم اور سیاست نظام عالم کو صحیح نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ رعیت بادشاہ یا حاکم کے تابع ہیں۔ یا تابع نہیں ہیں۔ اگر تابع نہیں ہے تو نظام بگڑ گیا۔ اور اگر تابع ہے اور حاکم کو خوف جزا نہیں ہے تو انتہائی ظلم کرے گا۔ اور ظلم کرے گا۔ تو عبادت نہیں ہوسکے گی اور جب عبادت نہیں ہوسکے گی۔ تو جس لئے عبادت ہے وہ عبث اور بے سود ہو جائے گی۔ تو تھوڑی سی ڈنڈی مارنے پر عدل نہیں رہے گا اور جب عدل نہیں رہے گا۔ تو جو نظام اس عدل پر موقوف ہے وہ بے سود ہو جائے گا۔ اس بنا پر سخت سے سخت وعید کی ہے۔

پھر فرمایا أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ؁ کیا ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ اٹھائے جائیں گے یا کم از کم ظن بھی نہیں ہے اور ظن ہو سکتا ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ حسن و قبح دونوں یہاں موجود ہیں اور اس بات کو بھی جانتا ہے کہ اچھے اور برے میں فرق ہے۔ کوئی شخص اچھے کو برا یا برے کو اچھا یا اچھے اور برے کو برابر تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اچھی طرح جانتا ہے کہ اچھا اچھا ہے اور برا برا ہے۔ اچھا بڑھیا ہے اور برا گھٹیا ہے۔ اس جہان میں نیکی اور بدی کا فرق موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر بدکردار آرام اور آسائش میں رہتے ہیں اور اکثر نیکوکار تکلیف میں زندگی گذارتے ہیں۔ اکثر قاتل کو سزا نہیں ملتی۔ دنیاوی سزا سے بچ جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر جزا نہیں ہوگی۔ تو نیک و بد برابر ہو جائیں گے۔ تو لازم ایک دارالجزا ہونا چاہئیے جہاں نیکی کا بدلہ نیک اور بدکرداری کی سزا ملے تاکہ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے اس پر اگر غور کرو تو ذرا سی دیر میں اس پر یقین بھی آ جائے گا۔ کہ روز جزا حق ہے۔

اس کے علاوہ اس پر غور کریں کہ خداوند تعالٰے نے جو اس جہان کو پیدا کیا تو اس کا مقصد کیا ہے۔ نفع پہنچانا ہے یا نقصان اگر نقصان پہنچانا مقصود ہوتا تو نقصان سے بچنے کی صلاحیت اور قدرت نہ دیتا۔ یہ جدوجہد بتا رہی ہے کہ مقصد تکلیف پہنچانا نہیں ہے۔ ہرن شیر کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے انسان مصیبت کو دیکھ کر اس کے ازالے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اگر مقصود نقصان پہنچانا ہوتا تو یہ قدرت ازالہ کی نہ دیتا اب چونکہ ازالے کی قدرت

موجود ہے اس لئے معلوم ہوا کہ نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ اگر نقصان اور فائدہ دونوں پہنچانا مقصود نہیں تھا تو یہ بات بغیر پیدا کئے حاصل تھی۔ جب تک انسان پیدا نہیں ہوا تھا اس کو نہ فائدہ پہنچ رہا تھا نہ نقصان تو پھر پیدائش ہی عبث ہو جائے گی اور پیدائش عبث نہیں ہے۔ تو جب پیدائش عبث نہیں ہے اور نہ نقصان پہنچانا مقصود ہے تو ضرور فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ اور نفع اس جہان میں موجود نہیں ہے۔ جو فائدہ بظاہر نظر آتا ہے اس کی تہہ میں اس سے بہت زیادہ نقصان موجود ہے۔ سب سے بڑا فائدہ یہاں حیات ہے۔ اس میں ممات پوشیدہ ہے۔ اگر موت اس حیات میں مضمر نہ ہوتی کوئی کسی سے نہ ڈرتا۔ یہ جو ڈر ہے یہ بتا رہا ہے کہ حیات میں موت پوشیدہ ہے یہ جو لذات اور آرائشیں اس کو یہاں حاصل ہیں تو حصول کے وقت بھی وہ ڈر رہا ہے۔ کم از کم اس کے انقطاع کا ڈر ہے۔ نتائج کا ڈر الگ ہے۔ یہ ڈر بتا رہا ہے کہ اس لذت اور آسائش کی تہہ میں عیب اور نقصان موجود ہے۔ انگور کو دیکھئے کیا خوشنما اور لذیذ ہوتا ہے لیکن اس کا انجام کتنا بدبودار اور مکروہ ہوتا ہے۔ کہ انسان دیکھنا گوارا نہیں کرتا اور اگر اس کے قریب ہو تو ناک بند کر لیتا ہے یہی حال ہر لذیذ ترین غذا کا ہے۔ کہ بہت تھوڑا سا حصہ تو اس کا جزو بدن بنتا ہے باقی بڑا حصہ ایسی مکروہ شکل اختیار کرتا ہے کہ ہر شخص اس سے پرہیز کرے۔ یہی حال مشروبات کا ہے۔ دونوں چیزیں نہایت پاک اور طاہر ہیں۔ مگر ان کے نیچے تہہ میں نہایت عیب اور نقص پوشیدہ ہے۔ تو اس جہان میں کہیں راحت نہیں ہے اور انسان کو راحت کے لئے پیدا کیا ہے تو ضرور دار راحت ہونا

چاہیئے۔ وہ اس جہان کے بعد ہے اسی کا نام دارالجزار ہے۔

علاوہ اس کے آپ غور کریں کہ اگر دارالجزار نہیں ہوگا تو انسان حیوان سے بدتر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ انسان کو گذرے ہوئے مصائب کا رنج ہوتا ہے اور آئندہ آنیوالے مصائب کا خوف ہوتا ہے اور موجودہ مصائب کی تکلیف تو ہوتی ہی ہے۔ مگر حیوان کو صرف موجود مصائب کی تکلیف ہوتی ہے تو حیوان کو ایک تکلیف اور انسان کو ماضی، موجود اور آئندہ تینوں تکالیف ہوتی ہیں تو انسان حیوان سے بھی بدتر ہوگیا۔ گزری ہوئی تکلیف کا حزن اور آئندہ تکلیف کا خوف انسان کو ہوتا ہے۔ مگر بکرے کو دیکھیں کہ دس بکرے باندھ دیں۔ چارہ ان کے سامنے ڈال دیں۔ ایک ایک کو ذبح کرتے رہیں باقی بکرے برابر چارہ کھاتے رہیں گے۔ ان کو اس کا خوف نہیں ہوگا۔ کہ آئندہ ان کا بھی ذبح کا نمبر آنے والا ہے۔ اور انجام کا بالکل خوف نہیں ہوتا۔ ان کو دکھ صرف اس وقت ہوگا۔ جب آپ ان کو دکھ دیں۔ وہ دکھ انسان کو بھی ہوتا ہے۔ تو حیوان کو ایک اور انسان کو تین دکھ ہوئے اور راحت میں دونوں برابر۔ جو لذت آپ کو امرود کے گودے سے ملتی ہے وہی راحت بکرے کو چھلکے سے ملتی ہے۔ اونٹ کانٹے دار جھاڑی اتنے ہی مزے سے کھاتا ہے۔ جس مزہ سے آپ گنڈیری کھاتے ہیں۔ تو لذت میں برابر تکلیف میں زیادہ۔ تو انسان جانور سے بدتر ہوگیا۔ لیکن بالاتفاق انسان جانور سے بدتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں ایک چیز زائد ہے حیوان سے، اور وہ عقل ہے۔ تو عقل انسان کی ذلت اور حقارت کا سبب ہوا۔ حالانکہ عقل اشرف الاشیاء ہے۔ تو ذلت کا سبب کیسے

بن سکتی ہے۔ تو ایسی چیز ہونی چاہیئے جس سے عقل کی شرافت ظاہر ہو۔ وہ اس جہان میں نہیں ہے۔ تو ایک دوسرا جہان لازمی ہے۔ جہاں اس کی شرافت ظاہر ہو۔ اگر وہ نہ ہوگا تو انسان اس کائنات میں تمام جانوروں سے بدتر ہو جائے گا تو انجام اس حیات کا ضروری ہے۔ تو ایسا کام نہ کرنا چاہیئے ڈنڈی مارنا نہ چاہیئے تاکہ انجام خراب نہ ہو۔

اب دوسرا مسئلہ غور کرنے کا یہ ہے کہ یہ بدکرداریاں دل کو زنگدار کر دیتی ہیں اور دل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک نقطہ سیاہ لگا دیا جاتا ہے۔ اور بار بار کرنے سے نقطے لگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس میں توبہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی یہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ حالت بہت خطرے کی ہوتی ہے۔ جب سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ ایک فعل کو بار بار کرنے سے ایسا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پانی جب قطرہ قطرہ گرتا ہے تو سخت سے سخت پتھر میں گڑھا ڈال دیتا ہے۔ برخلاف اس کے بارش کا ڈھیروں پانی نکل جاتا ہے۔ اور کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سن کی رسی جو بڑی نرم چیز ہے۔ کوئیں پر جو لوہے کی گھری لگی ہوتی ہے اس میں گڑھا ڈال دیتی ہے۔ بار بار اس پر چلنے سے۔ کثرت افعال سے ایک ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شکل کو آپ بار بار بنائیں تو ایسا راسخ ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ آنکھ بند کر کے بھی آپ اس کو بنا دیں گے۔ بار بار آپ نے دیکھا کہ روپیہ کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی تو دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ

جو بھی کچھ ہے۔ وہ روپیہ ہے۔ اگر فقیر کو ایک روٹی جو دوآنی کی آتی ہے اور ایک دوآنی دیں اور اس کو اختیار دیدیں کہ دونوں میں سے جو چاہے لے لے تو وہ دوآنی اٹھا لے گا اور روٹی چھوڑ دے گا۔ کیونکہ دل میں یہ بیٹھ گیا کہ اصل چیز روپیہ ہے۔ روپیہ کا مالک ہونا سارے جہان کا مالک ہونا ہے۔ اور روٹی کا مالک ہونا سارے جہان میں سے صرف ایک چیز کا مالک ہونا ہے۔ تو کثرت انعال سے یہ جذبہ پیدا ہو گیا کہ مال محبوب شے ہے۔ ورنہ روپیہ کوئی شے نہیں ہے۔ وہ تو ذریعہ تبادلے کا ہے۔ آم کا رس بچے کے دست کے مشابہ ہوتا ہے بار بار دیکھنے سے دل میں کراہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض نفیس المزاج آم کا نکلا ہوا رس نہیں کھاتے کراہیت کرتے ہیں۔

ہر جگہ ہر شے کو دیکھا کہ وہ خدا کی قدرت سے ہو رہی ہے تو دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ خدا کی قدرت عام ہے۔ اس کا لوگ صحیح استعمال نہیں کر سکے اور یہ سمجھے کہ جب یہ عام ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے شریک پر بھی قادر ہے اور اور اپنی ذات پر بھی قادر ہے۔ اس خیلہ سے ایسی دقیق دقیقیں پیدا ہو گئیں کہ جن کی حد نہیں۔ تو راسخ ملکہ پیدا ہونے کے بعد غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں۔ انکا علاج الگ ہے۔ جیسے آم کے رس میں خوشبو اور نجاست میں بدبو ہوتی ہے یہ دونوں میں تمیز کر دے گا۔ اس طرح خدا ہر شے پر قادر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہر مخلوق پر قادر ہے۔ ہر ممکن پر قادر ہے۔ تو یہ کہنا کہ وہ قادر نہیں ہے۔ یہ شرع کے بھی خلاف اور عقل کے بھی خلاف۔ تو بات کیا ہے۔ کہ اس کی ذات اور تمام صفات باقی رہ گئیں تو ... قدرت الگ نہیں ہوتی۔ تو یہ اتنا دقیق مسئلہ ...

ہوگیا کہ دونوں فریقوں کے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ خدا کی ذات اور صفات یہ بغیر قدرت کے ہیں ان سے قدرت متعلق نہیں ہوئی۔ اور بغیر قدرت کے اس کی ضدیں محال ہیں۔ یعنی محال کرنے سے وہ محال نہیں ہوئیں۔ بلکہ وہ قدرت کے تعلق کے بغیر ہی محال ہیں۔ جس طرح ذات وصفات واجب اور ضروری ہیں۔ اسی طرح ان کی ضدوں کا عدم بذاتہ ضروری اور واجب ہے اب خدا کا قادر ہے یا نہیں ہے یہ ایک سوال ہے۔ بات آگئی ہے تو اس کو بھی سمجھا دوں۔ خداتعالیٰ محال پر قادر ہے وہ کہتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں عالم کا عدم میں ہونا محال ہے۔ لیکن خداتعالےٰ ازل میں عالم کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اس لئے خداتعالےٰ محال پر قادر ہوگیا۔ مگر یہ دلیل غلط ہے۔ خدا ازل میں قادر ہے۔ اس کے کیا معنی۔ ازل اور ازل میں قادر ہونا یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ازل کے معنی غیر مقدور ہونے کے ہیں۔ اور قادر کے معنی مقدور ہونے کے ہیں تو قادر ہونے اور مقدور ہونے کا اجتماع ہوگیا ازل معنی لا اول اور قادر ہونے کے معنی ذی اول۔ یعنی ازل میں یعنی لا اول میں اول ممکن ہے۔ یہ بالکل بے ہودہ بات ہے۔ غلط ہے۔ لہٰذا یہ دلیل غلط ہے بالکل۔ باقی جب سوال کیا جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ کس شے پر قادر ہے تو جواب دیا جائے گا کہ ہر شے پر قادر ہے کسی ایک جز کے متعلق نہیں کہا جائے گا۔ اور جب یہ پوچھا جائے گا کہ خدا محال پر ذات وصفات پر قادر ہے یا نہیں۔ تو جواب دیا جائے گا کہ یہ سوال صحیح نہیں ہے۔ غلط ہے۔ جواب اس وقت دیا جائے گا جب سوال صحیح ہو۔ شے پر قادر ہونے کے معنی اس

شے سے قدرت کے متعلق ہونے کے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے یہ معنی ہیں کہ قدرت ان سے متعلق نہیں ہوئی۔ وہ غیر متعلق قدرت ہیں۔ اسی طرح ازل میں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو شے غیر متعلق قدرت ہو۔ جس شے کے ساتھ قدرت متعلق ہو یا ہو سکتی ہو۔ وہ شے لا اول نہیں ہے ذی اول ہے۔ اس لئے وہ سوال غلط ہے۔

اور یہ مثال دینی کہ حرکت میں سکون ممکن ہے یہ غلط ہے بلکہ حرکت اور سکون کا اجتماع محال ہے۔ حرکت کے وقت سکون ممکن ہے یعنی ایک جسم میں جس میں حرکت ہو رہی ہے۔ حرکت کے وقت سکون ہو سکتا تھا اگر ہوتا۔ تو جواب صحیح یہ ہے کہ سوال غلط ہے۔

تو گناہ کیا پھر گناہ کیا اس طرح بار بار گناہ کرتے کرتے ایک ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور قلب پر سیاہی جم جاتی ہے کہ اگر توفیق الٰہی شدید ہو تب تو وہ دور ہو ورنہ دور نہیں ہوتی۔ لہٰذا جہاں گناہ ہو فوراً توبہ کرنی چاہیئے اور اس کا پلٹا کرنا چاہیئے۔ دل پر تو زنگ چھا جاتا ہے۔ اور مثل پردہ کے ہو جاتا ہے۔ جب پردہ دل پر پڑ گیا تو پردہ کے آگے جو چیز ہو گی وہ قطعی نظر نہیں آئے گی۔ دیکھئے یہاں برابر حرکت ہو رہی ہے۔ اور حرکت کے لئے جہت چاہیئے سمت چاہیئے۔ کس سمت حرکت کرے۔ آپ روز صبح اٹھتے ہیں۔ دن بھر کھانا پینا اور کار دبار کرتے شام کو واپس آ کر سو جاتے ہیں۔ صبح اٹھ کر پھر وہی حرکت کرتے ہیں۔ بار بار یہی حرکت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر وقت آ گیا۔ اور آخری لمحہ میں شہد اور ربانی دیا جا رہا ہے۔ اگر ثقیل غذا ہضم ہو سکتی ہے اور گلے سے اتر سکتی تو ثقیل غذا بھی

دی جاتی۔ مگر گلے سے نہیں اترتی۔ اس لئے رقیق دی جاتی ہے۔ جب پیدا ہوا تھا
اس وقت بھی شہد اور پانی دیا تھا آخری وقت بھی شہد اور پانی دیا جا رہا ہے
جو فعل پہلے دن ہوا تھا وہی فعل آخر دن ہو رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ پوری زندگی بیکار
گئی جو روز آخر تھا وہ روز اول ہے۔ اگر مقصد زندگی کا کھانا پینا ہی تھا۔ تو یہ تو
روز اول ہی حاصل تھا۔ پھر برابر حرکت ہوتی رہی اور یہی کام کرتا رہا تو پوری
زندگی بے کار گئی۔ تو معلوم ہوا کہ زندگی کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ یہ مرتبہ
حیوانی ہے۔ تمام جانور اس میں شریک ہیں۔ کھانے پینے میں حرکت جو ہو رہی وہ
حیوانیت سے ہو رہی ہے اور حرکت کرنے والا انسان ہے۔ تو جس نقطے سے حرکت
ہوگی وہ عیب، قبیح اور برا ہوگا۔ اور جس جگہ جا کے سکون ہوگا وہ حسن اور اچھا ہوگا۔
اسی کے لئے وہ حرکت ہو رہی ہے۔ جس جگہ سے چلے گا وہ قبیح ہوگی۔ جہاں پہنچے
گا وہ حسن ہوگی۔ وہ مقصود ہوگی۔ جب تک اس کا حسن نظر میں رہے گا وہاں سے
نہیں جائے گا۔ جب وہاں اس کی نظر میں قبح ہوگا وہ فوراً وہاں سے حرکت کرے گا
اس مقام کو جہاں اس کو حسن نظر آئے گا برابر حرکت ہو رہی ہے۔ انسان بھاگ
رہا ہے کس سے بھاگ رہا ہے۔ حیوانیت سے بھاگ رہا ہے۔ حیوانیت کے برے
نقطے سے جو بھاگے گا تو اس سے بہتر وہ نقطہ ہونا چاہئے جہاں یہ جا رہا ہے۔ وہ
نقطہ جہاں جا کر یہ ٹھہرے گا وہ اس سے بہتر تو ہے۔ باعتبار مقدار اور باعتبار
زمانہ لیکن حقیقت میں بہتر نہیں ہے۔ ایک شخص ملغوبہ کھا رہا ہے۔ ایک غریب آدمی
ہے وہ گڑ کے چاول کھا رہا ہے۔ ملغوبہ اس کو میسر نہیں ہے تو جب تک وہ گڑ کے
چاول کھا رہا ہے۔ اس کو وہی مزہ آ رہا ہے جو ملغوبہ کھانے والے کو آ رہا ہے۔ تو

اس نقطہ سے بھاگ کر جنت میں جا رہا ہے وہاں بھی کھانا پینا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں قطع ہو جائے گا وہاں قطع نہیں ہو گا۔ یہاں گھٹیا چیزیں ہیں۔ وہاں بڑھیا چیزیں ہوں گی۔ یہاں گڑ کا چاول ہے تو وہاں مطنجن ہے یا اس سے بھی بڑھیا ہے مگر نوعیت ایک ہی ہے۔ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ دار آخرت حیوان ہے۔ (عنکبوت - ٦٤) وہ مقصود نہیں ہے۔ حیوان تو یہاں موجود تھا۔ یہ قطع ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں۔ لیکن حیوانیت جوں کی توں موجود ہے۔ تو مقصود بالذات جنت نہیں ہے۔ اور نہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ اور نہ ان کے لئے یہ حرکت ہو رہی ہے۔ اور اگر انسان کو یہ ثابت ہو جائے کہ وہ ہیرا اور یہ ہاتھ سے نہ جائے تو ہر انسان اس کے لئے تیار ہے کہ وہ اس کو چھوڑ دے اور نہ مرے۔ میں بہت بڑی بات کہہ گیا اللہ تعالیٰ معاف کرے اگر اس میں کوئی غلطی ہو۔ نزع کی تکلیف اتنی شدید ہے کہ اللہ اس سے پناہ میں رکھے۔ نوع ایک ہی ہے اور وہ نوع سے بھاگ رہا ہے۔ اور جس شے کے لئے یہ بھاگ رہا ہے اور حرکت ہو رہی ہے وہ دیدار خداوندی ہے۔ دیدار کرنے کے لئے کوئی جگہ چاہیئے۔ جہاں سے وہ دیدار کرے گا۔ وہ جگہ جنت ہے۔ تو جنت میں ٹھہرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے۔ بلکہ وہ اس لئے وہاں ہے کہ دیدار باری تعالیٰ کرے تو مقصود صرف دیدار باری تعالیٰ ہے۔ اور جب دل کے اوپر حجاب اور پردہ پڑ گیا۔ تو فرمایا کَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ۔ وہ اپنے رب کے دیدار سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ بداعمالیوں کے باعث ان کے دل پر پردہ پڑ چکا ہے اس وجہ سے ان کو نظر نہیں آئے گا۔ جس کا جتنا پردہ ہلکا ہو گا اتنا ہی وہ زیادہ دیکھے گا۔ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق دیدار کرے گا۔ اور تجلی نفس کی استعداد کے مطابق

ہوگی۔ اسی لئے کہا کہ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔ کیونکہ وہی مقصود ہے۔ یہ نہیں کہا کہ وَاِلَی الْجَنَّۃِ مَصِیْرُ جنت کی طرف لوٹنا ہے۔ اب جو لوگ نہیں سمجھتے وہ کہیں گے کہ اس میں کیا مزہ ہے۔ کیا بات ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے دہقان ہے وہ کہے کہ ہمارے اور بادشاہ کے کھانے میں کیا فرق ہے کچھ بھی نہیں — یہ ناواقفیت ہے۔ ذلت نہیں ہے ورنہ کھاتا۔ اس میں کیا لذت ہے۔ کہ جس کے سامنے یہ ساری جنتوں کی لذتیں ہیچ ہیں۔ تو جب ربط دیا دونوں آیتوں کو کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ان کی بداعمالیاں پردہ بن گئی ہیں ان کے دلوں پر۔ تو لازمی نتیجہ ہوگا کہ ان کے دل اس قابل نہیں ہوں گے کہ وہ دیدار کر سکیں۔ دیکھنے کے لئے تو دل ہی ہوگا نا۔ انسان کی روح حق اللہ پاک کو دیکھے گی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اپنے رب کو دیکھ کر تروتازہ ہوجائیں گے۔ کھائیں گے پئیں گے۔ اچھی طرح ہضم ہو جائے گا تب کہیں جا کر تازگی آئے گی۔ یہ جو آپ کو کھانا پینا اچھا لگ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علت ہے زندگی کی۔ وہاں مجرد دیکھتے ہی تروتازہ ہوجائیں گے زندگی حاصل ہوجائے گی۔ اگر کھانا مقصود ہوتا تو ہر وقت کھاتا رہتا۔ مگر ایسا نہیں کرتا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ہے حیات کا۔ اسی طرح مبدأ حیات حقیقی جو ہے وہ خداوند تعالیٰ ہے۔ وہ حیات ابدی اس کو حاصل ہوجائیگا۔ اور وہ ترک گناہ پر موقوف ہے اللہ تعالیٰ کے انعام اور فضل اور اس کی توفیق پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس کے کرم و فضل کی دعا کریں۔ اس صورت میں اور کوئی عقلی بات نہیں ہے جو بیان کی جا سکے۔

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ هِيَ خَمْسٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ (۱) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ (۲) وَاِذَا
الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ (۳) وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ (۴) وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا
وَحُقَّتْ ؕ (۵) يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا
فَمُلٰقِيْهِ ۚ (۶) فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ (۷) فَسَوْفَ يُحَاسَبُ
حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ (۸) وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ (۹) وَاَمَّا مَنْ
اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ (۱۰) فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ (۱۱) وَّيَصْلٰى
سَعِيْرًا ؕ (۱۲) اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ (۱۳) اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ
يَّحُوْرَ ۚ (۱۴) بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ (۱۵) فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ (۱۶)
وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ (۱۸) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ
طَبَقٍ ؕ (۱۹) فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ (۲۰) وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ
لَا يَسْجُدُوْنَ ۩ (۲۱) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ۖ (۲۲) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
بِمَا يُوْعُوْنَ ۖ (۲۳) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (۲۴) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۠ (۲۵)

شقت پھٹ جائے۔ حقت۔ آسمان اس کی شان یہ ہے کہ اپنے
کان اپنے رب کی طرف لگائے رکھے کہ جو حکم ہو فوراً اس پر عمل کرے۔
حقت۔ یہ لفظ سمجھنے کا ہے: اذنت کے معنی مطیع و فرمانبردار ہو۔

آسمان جسم ہے۔ جس جوہر میں لمبائی چوڑائی اور موٹائی ہو۔ اس
جوہر کو جسم کہتے ہیں۔ لمبائی چوڑائی موٹائی یہ تینوں مختلف خصلتیں ہیں۔ اور
ان کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک یہ محدود نہ ہوں۔ یعنی لمبائی دونوں جانب میں
لاانتہا نہیں پا سکتی۔ اسی طرح چوڑائی اسی طرح موٹائی کسی نہ کسی حد پر ٹھہرے
گی۔ لاانتہا نہیں جا سکتی۔ اس لئے کہ ایک ایک رخ کو دو دو طرفین لازم ہیں۔ تو
تین کو چھ طرفین لازم ہیں۔ آگے پیچھے اوپر نیچے دائیں بائیں۔ آسمان شش
جہات سے گھرا ہوا ہے۔ اس لئے لامحدود ہو نہیں سکتا۔ اگر کرہ ہے تو کرہ دائرے
پر مشتمل ہے۔ اور دائرہ قطر پر اور قطر کو ایک محدود نسبت لاحق ہے۔ دائرہ
کے ساتھ کیونکہ وہ ایک محیط دائرہ کا ایک تہائی ہے۔ جو شے کسی شے کی تہائی ہو
یا کتنی ہو وہ لامحدود نہیں ہو سکتی۔ یعنی جس شے میں کوئی نسبت جاری ہو جائے
گی وہ لامحدود نہیں ہو سکتی۔ اس کی دلیل کہ جو شے عدد پر مشتمل ہے وہ محدود ہو گی
یہ ہے کہ اگر وہ مشتمل ہے اول اور ابتدا پر۔ یعنی اس کے لئے ابتدا موجود
ہے۔ تو جس کے لئے ابتدا موجود ہے وہ محدود ہو گی۔ اور یہ جسم عدد پر

مشتمل ہے۔ اس لئے جسم محدود ہو گیا۔ خواہ وہ دائرہ ہو مستطیل مثلث ہو
سب محدود ہو گیا۔ تو دائرہ محدود ہو گیا۔ تو جسم بسیط بھی دائرہ ہے۔ وہ بھی محدود
ہو گیا اور جسم ہو نہیں سکتا۔ جب تک تحدید نہ ہو۔ جیسا میں نے اوپر بیان کیا کہ
چھ جہتوں سے گھرا ہوا ہے۔ تو گھرے ہونے ہی کے معنی محدود ہونے کے ہیں
اس لئے جسم لا تناہی نہیں جا سکتا۔ اقلیدس کے طریقہ سے بھی سمجھ لیجئے کہ ایک
زاویہ منفرجہ ہے۔ ۹۰ درجہ سے بڑا اب اس کے دونوں بازو جوں جوں بڑھتے
جائیں گے۔ ان کا درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر دونوں بازو لا انتہا
بڑھا دیئے جائیں تو ان کا فاصلہ بھی لا انتہا بڑھ جائے گا۔ حالانکہ وہ دونوں
بازوؤں سے گھرا ہوا ہے۔ تو وہ لا انتہا نہیں ہو سکتا۔ جسم جب محدود ہو گیا تو
وہ یا اتنا ہے یا اُتنا۔ اور اِتنا یا اُتنا وہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ اتنا اتنا
کیا نہ جائے تو اس کا کوئی کرنے والا ہے۔ تو ہر جسم محدود اور متناہی ہے
اور متناہی اور محدود ہونا اس کا اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ کہ کوئی نہ
کوئی اس کا کرنے والا ہے۔ کیونکہ جتنا وہ اب ہے۔ اس سے ایک انچ زیادہ
اور ایک انچ کم دونوں ممکن ہیں۔ اللہ پاک کی موجودگی کو ثابت کرنے کی سب
سے بڑی دلیل یہی ہے۔ کہ جسم کے لئے دونوں صفتیں ممکن ہیں۔ کمی کی بھی زیادتی
کی بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ موجود طول کے ساتھ مسطول ہوا۔ اگر یہ اس کی ذات
کا تقاضہ ہوتا تو دونوں طرف نسبت برابر نہیں ہو سکتی تھی۔ موجود طول کی طرف
اور موجود طول کے خلاف۔ دونوں صورتیں کم اور زائد۔ تو جب دونوں صورتیں
ممکن ہیں تو معلوم ہوا کہ موجود طول کے ساتھ مطول ہونا اس کی طبیعت کا تقاضہ نہیں

ہے۔ بلکہ کسی بیرونی طاقت نے جو اس سے باہر ہے۔ اس کو موجود طول کے
کے ساتھ مطول کر دیا۔ اور وہ شے جو اس کو موجود طول کے ساتھ مطول کر رہی
ہے۔ وہ شے جسم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ جسم ہوگی۔ تو یہی صورت اس کیساتھ
ہوگی۔ کہ کوئی اس کا کرنیوالا ہوگا۔ محدث اور مطول کرنے والا ہوگا۔ جیسا اس
جسم کا ہے۔ پھر اس کا کرنے والا جسم نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ بھی جسم ہوگا۔
تو اس طرح جسموں کا سلسلہ لاانتہا چلے گا۔ اور سلسلہ لاانتہا جا نہیں سکتا۔
ناممکن اور محال ہے۔ کیونکہ جسم جو ہے وہ مرکب ہے۔ اور ہر مرکب اپنے اجزا
کے پیچھے ہے اور جو شے کسی شے کے پیچھے ہوتی ہے اس شے کے لئے ابتدا
اور اول ہوتا ہے۔ اور جس کے لئے ابتدا ہے وہ شے ازلی اور ہمیشہ سے
نہ رہی بلکہ خاص وقت میں ہوئی۔ جو شے خاص وقت میں ہوئی۔ وہ اس
سے پہلے بھی ہو سکتی تھی۔ پیچھے بھی ہو سکتی تھی۔ خاص وقت میں کیوں ہوئی
تو معلوم ہوا کہ اس کی تخصیص کرنے والا کوئی مخصص ہے۔ اور وہ مخصص جسم
سے بھی باہر ہے۔ اور جسم کی طبیعت اور ماہیت سے بھی باہر ہے۔ نہ جسم
ہے نہ جسمانی ہے۔ غیر جسمانی چیز نے جسم کو بنایا ہے۔ اور وہ کسی شے
ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ یہ جسم ہے۔ یہ تو ثابت ہو گیا جسم پہلے نہیں تھا
پھر ہوا تو وہ ایسا نہیں ہے کہ پہلے نہ ہو پھر ہو۔ جو شے ایسی نہ ہو کہ پہلے
نہ ہو پھر ہو۔ اسی شے کا نام ازلی ہے۔ وہی اس کا بنانے والا ہے موجد
ہے۔ خالق ہے۔ یعنی خالق عالم اور خالق اجسام جو ہے وہ ازلی ہے۔ اور
ظاہر ہے کہ جو شے ازلی ہوگی وہ ابدی ہوگی۔ جس شے کے وجود میں کسی

نے تاثیر کی وہی اس شے کے عدم میں تاثیر کرے گی. کیونکہ تاثیر علت ہے وجود کا اور جب وہ علت مٹا دی جائے تو وجود خود بخود مٹ جائے گا. مثلاً روشنی کی علت سورج ہے اگر سورج کو مٹا دیا جائے تو روشنی خود بخود مٹ جائے گی. تو معلوم ہوا کہ صانع عالم غیر جسمانی شے ہے. وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا. اسی نے اس کو پیدا کیا ہے. پیدا کرنے کی ترکیب کیا ہوتی ہے. اس کی ترکیب یہ ہوتی ہے کہ ایک ماہیت صانع کے سامنے ہوتی ہے. اس ماہیت کو وجود کے ساتھ متصف کر دیتا ہے. مثلاً آسمان کو پیدا کرنا ہے. تو آسمان کی ماہیت اس کے سامنے ہے اور ایک اور ماہیت وجود کی اس کے سامنے ہے. وہ اس ماہیت کو اس ماہیت کے ساتھ متصف کر دیتا ہے. اس اتصاف کا نام پیدا کرنا ہے. مثلاً کپڑا اور رنگ دو چیزیں ہیں تو کپڑے کو رنگ کے ساتھ متصف کرنے کے معنی رنگنے کے ہیں تو وجود کے کپڑے کو آسمان کی ماہیت کے ساتھ وہ متصف کر دیتا ہے. اس اتصاف کے معنی پیدا کرنے ایجاد کرنے اور تخلیق کرنے کے ہیں. تو وہ یہ اتصاف ہے جو موصوف اور صفت یعنی ماہیت اور وجود کے بیچ میں ہوتی ہے. یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (ق-۱۶) فرمایا ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں. یعنی انسان کی زندگی اور حیات سے بھی اس کے وجود سے زیادہ قریب ہیں زیادہ قریب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے وجود اور اس کی ماہیت حیات کے بیچ میں وہ اتصاف موجود ہے. تو وجود سے وہ پہلے آگیا. یعنی انسان کی جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو قریب ہونے کی کیا علت ہوئی. یہ اتصاف

سب بیچ ہیں۔ وجود سے بھی پہلے ہے۔ وجود آگے ہے ونحن اقرب الیہ منکم ولٰکن لا تبصرون ہم تم سے سب سے زیادہ قریب ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔ (واقعہ۔ ۸۵) جب وہ اتنا قریب ہے تو ہر آن وجود محتاج ہے اور اس قابل ہے کہ سنے کہ کیا حکم ہو رہا ہے۔ اگر اتصاف کا حکم ہو اتو متصف ہو گیا اور اگر سلب اتصاف عدم اتصاف کا حکم ہو اتو وہ معدوم ہو گیا تو فرمایا کہ آسمان کی یہی حالت ہے حقت کے معنی درحقیقت وہ اس قابل ہے کہ جو بات کہی جائے اسے سن لے۔ پہلے جب وہ نہیں تھا اس سے کہا کہ سن۔ ہونے کو وہ ہو گیا۔ اب وہ ہو گیا تو میں نے اس سے کہا تو پھٹ جا۔ تو اس نے پھٹنا سن لیا۔ اور وہ اسی لائق ہے۔ کہ وہ سنے اور فوراً عمل کرے۔ یعنی پھٹ جائے جیسا کہ ایک بندہ مطیع فرمانبردار ایک حاکم کا حکم سن کر عمل کرتا ہے ایسے ہی وہ عمل کرے گا۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں بتدریج ہوتا ہے۔ اور وہاں فوراً ہو گا۔ ادھر سنا ادھر پھٹ گیا ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا۔ یہ معنی واذا السماء انشقت واذنت لربھا وحقت کے ہیں۔

واذا الارض مدت

اور جب زمین پھیلا دی جائے یا بڑھا دی جائے۔

پھیلانے کی تو صورت یہ ہو گی کہ پہاڑوں کو اور تمام چیزوں کو پھیلا کر مسطح کر دیا جائے گا لا ترٰی فیھا عوجا ولا امتا نہ کوئی ٹیڑھ نظر آئے گی۔ نہ کوئی ٹیلہ نظر آئے گا۔ بالکل صاف چٹیل میدان ہو جائے گا۔ اور بڑھانے کے یہ معنی ہیں کہ اس طول وعرض موجودہ سے بہت بڑھ جائے گا تاکہ اولین وآخرین سب جمع ہوں گے۔ اس لئے بہت زیادہ پھیلاؤ کی ضرورت ہو گی اور

جب زمین اپنے اندر سے سب نکال دیگی۔ اور خالی ہو جائے گی۔ جو مُردے ہیں وہ سب نکل جائیں گے اور جو خزانے ہیں وہ نکل جائیں گے وتخلت یہ تکلف کا صیغہ ہے یعنی بتکلف وہ سب نکال کر بالکل خالی ہو جائے گی۔ اس کے اندر کوئی شے باقی نہیں رہے گی۔ یہ شرط ہے جب ایسا ہو ایسا ہو ایسا ہو تب کیا ہو گا؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ کہ جزا کیا ہے۔ بعض علماء تو کہتے ہیں کہ اس کی جزا فملاقیہ آگے آیت آتی ہے۔ اس کا ٹکڑا ہے۔ یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ یہ ہے جزا اس کی کہ جب یہ باتیں ہوں گی تو انسان اپنے عمل سے ملاقات کرے گا۔ اب یہ یہاں ضمیر اپنے عمل کی طرف پھیر لی اور اس کا اوپر کچھ ذکر نہیں ہے زیادہ محققین علماء کی رائے یہ ہے۔ لیکن اصل جزا آگے آتی ہے۔ جو صاف اور واضح ہے کہ جب آسمان پھٹ گیا اور زمین بڑھ گئی اور جو کچھ اس میں تھا اس نے نکال کر باہر ڈال دیا۔ واذنت لربھا وحقت اب دوبارہ کہا۔ پہلے آسمان کے لئے کہا تھا۔ اب زمین کے لئے کہا کہ وہ اس لائق ہے کہ سنے اور عمل کرے۔ زمین کی بھی یہی شان ہے اب ایک جملہ معترضہ بیچ میں آگیا۔ یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ ہمارا خیال ہے کہ اس کا ترجمہ اس طریقہ پر ہو۔ فملاقیہ اس کی جزا نہ ٹھہرائی جائے۔ اے انسان تو بے شک بڑی جد وجہد کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ کب تک کرتا رہے گا۔ الی

موت کا ہوگا۔ یعنی موت کے وقت تک تو عمل اور جد وجہد اور کوشش کرتا رہے گا فملاقیہ اور پھر تو اس سے ملاقات کرے گا۔ اپنے رب سے ملاقات کرے گا۔ یا اپنی کوشش سے ملاقات کرے گا۔ تو کوشش کی تو عرض ہے۔ اس سے تو ملاقات نہیں ہو سکتی تو اس کتاب سے ملاقات کرے گا جس میں کوشش لکھی ہوئی ہوگی یعنی نامہ اعمال سے ملاقات کرے گا۔ میں نے ترجمہ اس کا بہت صاف کر دیا تاکہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ ترجمہ ہے اور تمام تفسیروں میں یہی مضمون ہے۔ اب بات سمجھنے اور غور کرنے کی یہ ہے کہ انسان کوشش کرتا رہے گا۔ حرکت و عمل کرتا رہے گا۔ موت تک یا اپنے رب کی ملاقات تک۔ رب کی ملاقات کنایہ ہے موت سے۔ مرتے ہی اپنے رب سے ملاقات ہو جائے گی۔ مرتے دم تک کوشش کرتا رہے گا۔ یہ کہنا چاہیئے کہ یہ حرکت جو ہے برابر جاری رہے گی۔ اور سکون جب ہوگا۔ جب اپنے رب تک پہنچ جائے گا۔ اس سے پہلے سکون نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ برابر نشیب و فراز ہو رہا ہے۔ ڈھایا جا رہا ہے۔ اس کے اندر حرکت ہی حرکت ہے۔ اور مسلسل یہ بگڑ رہا ہے۔ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ ہے ایک حال سے دوسرے حال میں متغیر ہوا اور بگڑا۔ اس کو غور سے سمجھیں کہ دیوار کو جب ڈھاتے ہیں تو کتنا شور مچتا ہے۔ اور جب وہ بن جاتی ہے تو سکون ہو جاتا ہے۔ تو عمل کرنے میں تو برابر شور و شغب اور حرکت ہوتی ہے۔ اور جزا میں سکون ہوتا ہے۔ اطمینان ہو جاتا ہے۔ تو انسان کی حرکت اس جگہ ختم ہوگی جہاں اس کا رب ہے۔ اس کے یہ معنی نہ لگائیں کہ اپنے رب کی ملاقات

حرکت کا جو انجام ہے وہ خود محرک ہے۔ خالق حرکت ہی اس کی حرکت کا انجام ہے۔ حرکت کے لئے جہت چاہیئے۔ حرکت جب ہوگی کسی جہت کی طرف ہوگی۔ اور وہی جہت مقصود ہوا کرتی ہے حرکت کا۔ تو جب اس مقصود اس جہت تک نہیں پہنچے گا۔ حرکت برابر جاری رہے گی۔ یہ عالم سفر میں ہے۔ تو اگر اس کو وہ جائے اقامت یا وطن سمجھے گا تو ٹوٹے میں رہے گا۔ وطن اور دارالاقامت سکون کا نام ہے۔ سکون کی جگہ ہے۔ اور یہ ہے حرکت۔ مسافرت میں ہے سفر کر رہا ہے۔ اور سفر دو طریق پر ہوا کرتا ہے۔ یا تو وطن کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔ یا مال لے کر گاہک کی تلاش میں وطن سے جاتا ہے جو مال لے اور زیادہ نفع دیدے۔ باقی جتنے سفر ہوتے ہیں وہ ان دونوں کے اجزا ہوا کرتے ہیں یا سفر اس لئے ہوتا ہے کہ مال تجارت نفع سے بک جائے یا سفر اسلئے ہوتا ہے کہ وطن لوٹ کر آجائے۔ آپ یہ کہیں کہ بھائی وغیرہ کسی کو ڈھونڈھنے کے لئے بھی سفر ہوتا ہے وہ سفر بھی منفعت کیلئے ہوتا ہے مال کیلئے نہیں۔ عزیز رشتہ دار کے ملنے کی منفعت ہوتی ہے بہرحال مقصد منفعت ہے تو کہتا ہے کہ اگر وطن کی طرف سفر کرتا ہے تو وطن وہ جگہ ہوا کرتی ہے کہ وہاں جاکر پھر نہ نکلے وہاں سے نکلنے کو دل نہ چاہے۔ اور جب جانے کے بعد نکل گیا۔ تو وہ وطن کہاں رہا۔ اب اگر آپ دلی جائیں۔ تو وہاں وہ رہنے نہیں دیں گے نکال دیں گے تو وہ وطن کہاں رہا۔ وطن وہ ہے جہاں سے نکالا نہ جا سکے تو وہی جگہ ہے جنت لا یبغون عنها حولاً (کہف - ۱۰۸) وہ جنت سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اسی جگہ رہیں گے۔ وہاں جانے کے بعد نکلنے کو دل نہیں چاہے گا اور السلام کم جو انتظام نہ کر سکے اور رکھ نہ سکے۔ اور امن قائم نہ رکھ سکے۔

تو اس کی مملکت میں جائیں گے تو وہ وطن نہیں بن سکے گا۔ اس کو چھوڑ دینا پڑے
گا کہ ہائے مجھے شکست ہو گئی۔ یا برأت ہو گئی۔ وہ وطن نہیں رہے گا۔ تو وطن وہ
جگہ ہے کہ اس کے حاکم کے قبضے سے وہ جگہ نہ نکل سکے۔ اور وہ وہی حاکم ہے۔
جس کا نام خدا ہے۔ تو سکون کی جگہ وہی ہوئی جنت۔

یا اس لئے سفر کرتا ہے کہ نفع ہو۔ تو اس جہان میں ایسا کوئی نہیں ہے
کہ مال زیادہ سے زیادہ قیمت میں خرید لے۔ کیونکہ جو بھی خریدے گا۔ وہ اپنا
فائدہ بھی دیکھے گا۔ تو ایسا گاہک جو مال کو اتنے نفع پر خریدے گا کہ دوسرا کوئی
نہ خرید سکے وہ گاہک صرف خدا ہی ہے۔

لہٰذا دونوں صورتوں میں خدا ہی تک پہنچنا ہے۔ یعنی اس جگہ تک
جہاں مل جائے۔ تو انک کادح الی ربک کدحا کے معنی یہ ہیں کہ
تو برابر سفر کرتا رہے گا حرکت کرتا رہے گا جب تک تو اپنے رب تک پہنچے گا۔
جب وہاں پہنچ گیا پھر عمل وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ وہاں وہ مال بھی بہت نفع پر
خریدے گا اور وطن بھی ہے۔ وہاں سے نکالا نہیں جائے گا۔ وطن سے نکلنے
کا طبیعت میں جذبہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یہاں کیسا ہی مالدار ہو خوشحال ہو بادشاہ
ہو بادشاہ بھی ایک وقت خودکشی کر لیا کرتے ہیں۔ وطن چھوڑ کر بھاگ جاتے
ہیں۔ یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو نکالا نہ جاتا
قدرتی طور پر آدمی مرنا چاہتا ہے وہ اور بات ہے وہاں ایسا دل لگ جائے
گا کہ وہاں سے نکلنے کو دل نہ چاہے گا۔ اگر پہلے کے تجربہ کر دیکھیں وہ تو
روحانی طور پر معلوم ہوگا۔ لیکن جسمانی تجربہ ایک آنکھ میں ہو جائے گا۔ اسی وقت

بچہ ہوا بڑا ہوا اتنی عمر ہو گئی۔ مگر اس وقت کبھی نہیں چاہے گا کہ ماں کے
پیٹ میں دوبارہ چلا جائے اور وہ جن مقامات سے آیا تھا وہاں واپس
جانے کو بالکل تیار نہیں تھا۔ کہ یہ چھوٹے بچے جو ہوتے ہیں اس کو ماں ہی جانتی ہے
کہ کیسا اضطراب اور تکلیف ہوتی ہے۔ کیا کیا اذیتیں ہوتی ہیں۔ ماں ہی کو معلوم
ہوتی ہیں کہ وہ لوٹ کر اپنے مقام کو جانا نہیں چاہتا۔ پسند نہیں کرتا جانا۔ جبراً جاتا
ہے۔ تو وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہے گا۔ تو فرمایا اے انسان تو سمجھ لے
کہ جتنی بھی کوشش تو کر رہا ہے۔ اور عمل کر رہا ہے۔ اس کا انجام اور انتہا جو ہے
وہ میری ہی ذات ہے۔ میرے پاس جو جگہ ہے وہ تیرے رہنے کے لئے ہے۔
تیرے دل۔ تیری روح اور تیرے قلب کے لئے سکون کے لئے میرا دیدار ہے
اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔ یہ ہیں معنی کہ ہو کے رہے گی ملاقات۔ اب اگر اس کی
مرضی کے مطابق عمل ہوا ہے۔ تب تو یہ صورت ہو گی۔ اور اگر مرضی کے خلاف
ہوا تو جو صورت ہو گی۔ خلاف کو بھی آپ سمجھ لیں کہ جس جہت کو جانا تھا۔ اس
جہت کو نہیں گیا۔ جانا ہے مشرق کو اور گیا مغرب کی طرف۔ تو ہرگز منزل مقصود کو
نہ پہنچے گا۔ اور تمام جد و جہد اور سفر اور وقت برباد ہو گا۔ اور اپنی مراد سے
محروم ہو گا۔ فاما من اوتی کتابہٗ بیمینہٖ فسوف یحاسب حسابا یسیراً
جس وقت آسمان پھٹ جائے گا۔ زمین پھیلا دی جائے گی۔ اس وقت کیا
ہو گا۔ اے انسان جن لوگوں کے سیدھے ہاتھ میں ان کا نامۂ اعمال دیا جائے
گا تو وہ ہلکا سا حساب دیکر فارغ ہو جائیں گے۔ ہلکا سا حساب کے معنی آسان
حساب۔ آسان حساب وہ ہے جس ... [illegible]

کیوں نہ کیا؟ ایسا نہ ہو۔ صرف دیکھا معروضہ کو اور کہہ دیا کہ جاؤ۔ بس۔ اور جتنے گناہ ہیں۔ وہ بخشش اور کرم ہو کر معاف کر دیئے جائیں گے۔ اور حساب ختم ہو جائے گا۔ اور وہ حساب جس میں بحث ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اس حساب سے آپ کو اور مجھے سب کو بچائے۔ وہ محتسب حساب ہو گا۔ جس سے یہ مناسبہ ہو گیا کہ یہ تو نے کیوں کیا۔ یہ کیوں کیا۔ بس سمجھ لو کہ وہ مارا گیا۔ ہلاک ہو گیا۔ تو حساب یسیر کے یہ معنی ہیں کہ اس سے پرسشِ حال نہیں ہو گی۔ نہ سوال ہو گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایسا ہو گا کہ اس کے نامِ اعمال میں کہیں ایک نیکی بھی نہیں ہو گی۔ وہ بخش دیا جائے گا تو اس کو تعجب ہو گا۔ اور دریافت کرے گا۔ یا اللہ العالمین میں نے کوئی نیکی نہیں کی تو نے مجھے بخش دیا۔ تو جواب ملے گا کہ تو نے ایک رات سوتے میں کروٹ لی۔ اور تیرے منہ سے یا اللہ نکلا بس تو تو اس کو بھول گیا اور مجھے یاد ہے۔ اس لئے میں نے تجھے بخش دیا۔ خدا کی شان ہے۔ خدا اس کا نام ہے۔ صرف ایک کلمے میں بخش دیا۔ ذرا سی بات میں بخش دیا۔ بڑی رحمت والا ہے۔ اس دنیا میں صرف ایک رحمت کا ظہور ہے۔ دوسرے عالم میں ننانوے رحمتوں کا ظہور ہو گا۔ اولین و آخرین جمع ہوں گے۔ اور بے شمار رحمتیں ان پر نازل فرمائے گا اس کی رحمتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ بڑی سہولتیں ہیں۔ اگر یہاں توبہ کر لی تو اس کی معافی کا صاف اعلان ہے۔ اور اگر توبہ نہیں کی تب بھی وہ اپنی رحمت سے چاہے تو بخش دے گا۔ فرمایا ان ربک لذو مغفرۃ للناس علیٰ ظلمھم یہ اعلان جاری کیا۔ بے شک تیرا رب اس وقت بخش دیتا ہے۔ جب وہ ظلم کرتے ہوں۔ توبہ بو

[illegible]

پہلے بخش دیتا ہے۔ تو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ دل لگانا چاہیئے اور فرمایا اَنَا عند الظن عبدی بی میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۱۰۱) وہ جیسا مجھے سمجھے گا ویسا ہی پائے گا۔ تو گمان اس سے یہ رکھنا چاہیئے کہ وہ گناہ بخش دے گا۔ تو گناہ کا بخشنے والا ہی پائے گا۔ اسی لئے کہا فلیستجیبوالی ولیؤمنوابی مجھ سے دعا قبول کرانے کی کوشش کرو۔ اور میری بات کو مانو (البقرہ ۱۸۶) جہاں کہیں سوال آیا ہے اللہ پاک نے دو طریقے استعمال کئے ہیں۔ ویسئلونک عن الجبال وہ تجھ سے پوچھتے ہیں پہاڑ کے متعلق۔ کیا پوچھتے ہیں کہ پہاڑ (طٰہٰ ۱۰۵) قدیم ہے یا حادث فقل ینسفہا ربی نسفًا کہہ دے کہ پہاڑوں کو میرا رب ریزہ (طٰہٰ ۵) ریزہ کر دے گا۔ تو جو شے ریزہ ریزہ بننے کے قابل ہے وہ قدیم نہیں ہو سکتی تو طریقہ اختیار کیا "فقل" کا قل کہ فقل تو کہہ دے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ:— ویسئلونک عن الروح وہ روح کی بابت تجھ سے پوچھتے ہیں قل الروح من امر ربی کہہ دے کہ روح میرے رب کے علم سے ہے۔ تو یہ دو (اسریٰ ۸۵) طریقے ہیں۔ ہر سوال کے جواب میں قل کہا ہے۔ یا فقل کہا ہے۔ واذا سئلک عبادی عنی اور اگر میرے بندے میری بابت پوچھیں۔ فانی قریب (البقرہ ۱۸۶) تو یہاں نہیں کہا قل انی قریب تو قل کہنے میں جو وقفہ لگتا اس کی بھی برداشت نہیں کرتا ہے۔ میں موجود ہوں بولو کیا کہتے ہو۔ پھر خود ہی کہتا ہے۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان جو مجھے پکارتا ہے اس کی پکار کو اور دعا کو میں سنتا ہوں فلیستجیبوالی مجھ سے دعا قبول کرانے کی کوشش (البقرہ ۱۸۶) کریں ولیؤمنوابی میری بات کو مانیں لعلھم یرشدون شاید کہ ہدایت

پالیں۔ اللہ پاک کی رحمت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہاں بھی بڑے بڑے روٴسا اور خاندانی لوگ ایسے گزرے ہیں کہ ان کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ ایک شخص تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ آگرے سے گجرات جا رہا تھا۔ اس کے درمیان بیس پڑاؤ ہیں۔ اس کے پاس ۲۰ لاکھ روپیہ تھا۔ یہ اکبر کا امیرالامراء تھا۔ بڑی ہستی ہے اس کی اس پر مضمون لکھنے سے یورپ والے پی ایچ ڈی کی ڈگری دیدیتے ہیں۔ ایک میرے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر اظہر ان کو اسی پر ڈگری ملی۔ یہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے استاد تھے۔ تو ایک فقیر آیا اس نے کہا ایک لاکھ روپیہ لوں گا۔ خان خاناں نے اس کو دیدیا۔ دوسری منزل پر پھر آیا۔ اور وہی سوال کیا۔ اس نے پھر اس کو ایک لاکھ روپیہ دیدیا۔ پھر تیسری منزل پر بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد فقیر نے سوچا۔ کہ اب اگر میں طلب کروں گا تو شاید ناراض ہو۔ اور نہ دے تو وہ اپنی راہ ہولیا۔ خان چوتھی منزل پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر جب وہ نہ آیا تو دریافت کیا۔ معلوم ہوا وہ تیسری منزل سے لوٹ گیا۔ خان نے کہا افسوس بڑا کم ظرف تھا۔ میں نے یہ طے کیا تھا۔ آخری منزل تک اس کو اسی طرح دیتا رہوں گا۔ تو ایسا کریم النفس ایک معمولی دنیادار انسان تھا۔ اگرہ میں اس کے مکان کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازہ سے ہر صبح وہ دروازہ پر آتا اور نیچی نظر کرکے فقراء اور ضرورتمند لوگوں کو دیتا۔ جب ان سے نبٹتا تو دوسرے دروازہ پھر تیسرے اور پھر چوتھے دروازہ پر یہی عمل کرتا۔ ایک دن ایک برہمن آگیا۔ اس نے پہلے دروازہ پر اس کو دیدیا۔ پھر دوسرے دروازے پر پہنچا۔ وہاں بھی دیدیا۔ اسی طرح وہ چاروں دروازوں پر

گیا اور چاروں مرتبہ خان خاناں نے اس کو دیا۔ سب تو لے کر چلے گئے یہ
لینے کے بعد کھڑا رہا۔ خان نے اس سے پوچھا کیا تم کو کچھ نہیں ملا۔ اس نے کہا نہیں
مل تو گیا مگر میں ایک بات تم سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ پوچھا کیا ہے۔ اس نے کہا
دو بات پوچھنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خیرات کرنا کہاں سے سیکھا اور یہ کہ نظر نیچی کیوں
رکھتے ہیں۔ تو اس نے وہ ہندی کا شاعر تھا ہندی کے دوہے میں اس نے
جواب دیا۔ وہ دوہا تو میں بھول گیا اس کا مضمون یہ تھا کہ دنیا تو یہ سمجھتی ہے کہ
عبدالرحیم دے رہا ہے مگر دینے والا دے رہا ہے (مو کو کرے برن) وہ کوئی
اور ہے اس لئے شرم کی وجہ سے میری آنکھیں جھکی رہتی ہیں۔ تو جب
انسانوں میں ایسے ایسے لوگ موجود ہیں تو خدا کے کرم اور رحمت کا کیا اندازہ ہو
سکتا ہے۔ میں عقلی دلیل سے بھی کسی وقت سمجھا دوں گا کہ اللہ کی رحمت میں
کتنی وسعت ہے۔ اس وقت سورت کو ختم کرنا ہے۔ وقت کم ہے یہ سب
حساب بیسیرا یہ تو قیامت میں روز جزا کا حال ہے۔ مرنے کے
بعد جو حساب ہوگا۔ وہ بالکل آسان ہے۔ وہ یہ ہے کہ حسن اور قبح علت ہے
ارادہ کو برانگیختہ کرنے کی۔ اگر برائی کا تصور ہوتا ہے خیال میں۔ تو رد کرنے
کا ارادہ کرتا ہے اور اگر حسن کا تصور ہوتا ہے۔ تو کرنے کا ارادہ کرتا ہے
اگر نفع ہو کسی مال میں تو نفع کا تصور علت ہوتا ہے۔ اور اگر نقصان ہو تو
نقصان کا تصور علت ہوتا ہے۔ شعور ذاتی ہے۔ شعور کے بعد ارادہ پیدا ہوتا
ہے۔ جو بھی شعور ہوا۔ حسن کا قبح کا۔ ایسا شعور جس نے ارادہ کو ہلایا یا ارادہ
نے قدرت کو ہلایا کیونکہ قدرت کو فعل کے کرنے اور نہ کرنے دونوں کی طرف

نسبت برابر ہے۔ تو قدرت سے صرف کرنا ہی نہیں ہو گا۔ نہ کرنا بھی ہو گا۔ کرنے کے لئے اوپر سے ایک قوت آتی ہے۔ جس کا نام ارادہ ہے۔ وہ کرنے کی طرف لیجاتی ہے۔ یا نہ کرنا ہوتا ہے تو نہ کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ قدرت اعضاء کو حرکت دیتی ہے۔ اعضا اس عمل کو کرتے ہیں۔ عمل کے بعد وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے تو یہاں تو عمل ہوا اور اس جہان میں شعور پر کھٹ سے ایک نقطہ لگ گیا۔ وہ مختصر نویسی ہوتی ہے۔ کہ وہاں کے اندر پورا کا پورا نقش ہو جاتا ہے۔ جوں ہی یہ بدن ہٹا پورا کا پورا عمل ظاہر ہو جاتا ہے اس لئے کہ حساب یسیرا۔ یوں آسان حساب ہو گیا۔ سب معلوم ہو گیا۔ اور اس کی حسی مثال وہی ہے۔ کاربن کاپی کہ لکھو اوپر نقش ہو نیچے تو اعمال جو ہو رہے ہیں سب دل میں اور روح میں اترتے جا رہے ہیں۔ اوپر کاٹ دیں گے تو نیچے بھی کٹا ہوا آ جائے گا۔ اگر کوئی نیکی ہوئی ہے۔ تو اس کے حساب میں سے گناہ کاٹ کر باقی درج کر دی جاتی ہے۔ اگر گناہ کیا پانچ روپیہ کا نیکی کی دس روپے کی تو اس میں سے پانچ روپے کاٹ کر باقی پانچ لکھ دیئے جائیں گے اور نظر جب آتا ہے۔ جب اوپر کا پرچہ پھاڑ دیں گے۔ اسی طرح یہ بدن اوپر کا پرچہ ہے جب موت آئے گی اور یہ بدن کا پرچہ اوپر سے پھاڑ دیا جائے گا۔ تو نیچے سے روح پر سب منقش نظر آ جائے گا۔ بالکل یہی ہو رہا ہے۔ آپ غفلت نہ کریں۔ اس کو محض علم کے لئے نہیں بلکہ عمل کے لئے سنیں اور عمل کریں اللہ آپ کو اور مجھ کو دونوں کو توفیق دے عمل کرنے کی۔ بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ وقت زیادہ نہیں ہے۔ یہ مغالطہ ہو رہا ہے اور انشاء اللہ کسی وقت بتاؤں گا کہ یہ مغالطہ کیوں ہوتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے دھوکے سے بچ جائیں یہ بہت دھوکے کی چیز ہے

اس کی تہہ میں فنا موجود ہے۔ اس حیات میں موت مضمر ہے۔ صحت میں مرض مضمر ہے۔ اگر مرض مضمر نہ ہوتا تو تندرست آدمی کبھی بیمار نہ ہوتا۔ غنا کے اندر فقر مضمر ہے
مضمون بڑا ہے سبق رہ جائے گا۔ بہت آسانی کے ساتھ حساب ہو جائے گا
وینقلب الیٰ اھلہ مسرورا ؕ اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم واپس چلا جائے گا۔

اہل: اس کا گھر اس کی بیوی اور روہ۔ اہل جنت ہوں یا حور عین یا کنبہ اور ذریات بشرطیکہ وہ جنتی ہوں۔ جو کافر ہو گیا وہ اس کا اہل نہیں ہے۔ نبی کو حکم دیا کہ تیرا کافر بیٹا، تیرا اہل نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ایسا ہوا یہاں اکثر ایسا ہوا ہے کہ گھر پہچاننے میں دھوکا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا گھر ہے۔ کہ اس میں بالکل دھوکا نہیں ہوگا سیدھا اپنے گھر میں دروازہ کھول کر داخل ہو جائے گا۔ بالکل شبہ نہیں ہوگا سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ (حدید-۲۱)
اپنے رب کی عنایتوں اور جنت کی طرف دوڑو اس سلسلہ میں مت پڑو۔ یہ تھوڑی دیر کا کام ہے۔ مزدور پانچ روپے روز کماتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۸ ر مجھے دیدو بچوں کے لئے آٹے دالے کا انتظام کر دوں تھوڑا سا اس کو دیدیا جاتا ہے۔ باقی روپیہ شام کو ملے گا۔ جب کام ختم ہو جائے گا۔ تو یہ جو دنیا کی نعمتیں مل رہی ہیں یہ کام کی حفاظت کے واسطے ہیں کہ یہ یہاں خدا کے حکم کی اطاعت میں کچھ خرچ ہو رہا ہے۔ ضرورت پڑے گی اس لئے تھوڑی سی نعمتیں دیدی ہیں۔ ورنہ درحقیقت یہ نعمتیں نہیں ہیں۔ نعمت شام کو ملے گی۔ جب کام ختم ہو جائے گا۔ اور آپ کو ہر مثال یہاں ملے گی۔ باہر نہیں جانا پڑے گا اس کے اندر

بچے سے بچہ کم عقل سے کم عقل آدمی کو بھی قرآن میں ہدایت موجود ہے۔ نبی سے لے کر کم سے کم عقل آدمی کے لئے بھی تاکہ کسی کو عذر باقی نہ رہے انہی بعض مثالوں سے سمجھایا ہے کہ کوئی دنیا کی طاقت، انسان معلم حکیم فاضل عالم متکلم کوئی نہیں کہا سکتا یہ ہیں معنی الی اھلہ مسرورا کے واما من اوتی کتابہ وراء ظہرہ؟

اور جس کے نامہ اعمال کی کتاب پیٹھ کے پیچھے سے دی جائے گی۔ بائیں ہاتھ میں۔ فسوف یدعو ثبورا وہ موت مانگے گا۔ اردو میں ایک لفظ اس کے لئے ہے۔ ہائے موت یا ثبورا اور کہتے ہیں مرا رے مرا رے ثبورا کہتے جائیں گے اور یصلیٰ سعیرا اور جہنم میں داخل ہوتے جائیں گے اب وجہ بتلاتا ہے انہ کان فی اھلہ مسرورا وہ اس دنیا میں ظاہر عمل میں خوش و خرم تھا۔ یعنی وہ عاقبت سے بالکل مطمئن تھا۔ عاقبت کا اس کو کوئی خیال نہیں آتا تھا۔ عاقبت کا ان کو انکار تھا۔ اور گناہ اور سیہ کاریاں کرتا تھا۔ اور اس کو جو دنیوی دولت روپیہ پیسہ ملا تھا اس میں مسرور تھا۔ یہ وجہ ہوئی اس کے وہاں غیر مسرور ہونے کی جو یہاں خدا کو اور عاقبت کو بھول جائے گا۔ وہ وہاں غیر مسرور ہو گا۔ اور میں اس کو عقلی دلیل سے سمجھاؤں گا کسی وقت، آج وقت نہیں ہے۔ یہاں کا جو سکھ ہے۔ وہ اس لئے دیا تھا کہ وہ اس سکھ کے ہوتے ہوئے ان کی اطاعت کرتا۔ اگر سکھ نہ ہوتا۔ تو اطاعت نہ کرنا معذوری تھی۔ ٹانگیں اگر ٹوٹ گئیں تو کیا عبادت کرتا اگر بھوکا ہے تو اس سے کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ عبادت کرنے کے واسطے۔ یہ سارے سامان دیئے گئے۔ کہ میری خدمت کے لئے تو تیار ہو جائے اس کے بدلے سب نہیں کچھ تھوڑا البتہ ضرورت ہے۔ اس کے مطابق تھوڑا سا دیدیا۔ کم سے کم

ضرورت وہ ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہلاک ہو جائے۔ تو اتنا سارے عالم کو دے رکھا ہے ورنہ سارا عالم تباہ ہو جائے۔ یہ جو کہتے ہیں دکھ ہے تو وہ جھوٹ بولتے ہیں رزق تو وہ ہے جو جسم کے اندر جذب ہو اور جو صحیح تغذی کرے اور جسم کو طول عرض و عمق میں بڑھائے۔ اتنا کھالیا کہ پیٹ بڑھ گیا نہیں تینوں طرف سے بڑھائے وہ صحیح ہے اور صحت ہے۔ اسی لئے خون بڑھ گیا۔ وہ بیماری ہے۔ یہ عموماً ہوتا ہے۔ بلغم بڑھ جاتا ہے۔ بغیر بھوک کے کھانا کھانے سے۔ اس لئے اتنا رزق ہر شخص کو دیدیا کہ قوت برقرار رہے۔ بھوک کی تو زیادہ ضرورت ہے۔ بمقابلہ کپڑے کے۔ کپڑے نہ ہونے سے اتنی جلدی نہیں مرسکتا۔ جتنی جلدی غذا نہ ہونے سے مرجائے گا۔ جب کم ضرورت کو اس نے پورا کردیا۔ تو زیادہ ضرورت کیوں نہ پوری کرے گا۔ انہ ظن ان لن یحور اس نے وجہ بتا دی یہ یہ خیال کرتا تھا۔ کہ اس کو موت نہیں آئے گی۔ اس کو میرے پاس آنا نہیں ہے۔ ان لن یحور معنی لمدیرجع کے میرے پاس رجوع نہیں ہونا۔ یا اس نعمت سے رجوع نہیں ہونا جس نعمت میں وہ ہے۔ وہ اس خیال میں ہے کہ یہ اس سے کبھی جدا نہیں ہوگی۔ یا یہ خیال ہے کہ خدا و دا کوئی چیز نہیں ہے بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ جتنا عیش کرنا ہے کرلے۔ پھر تو کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔ اس قسم کے خیالات عموماً متمول لوگوں میں ہوجایا کرتے ہیں۔ اگر تمہارا ایسا خیال ہے۔ تو غلط ہے۔ میں خوشی کو رنج سے بدل دوں گا۔ اور اگر ایسا خیال ہے کہ نہیں لوٹنا تو ضرور لوٹنا ہے۔ بلیٰ دونوں کے ساتھ لگتا ہے نفی اثبات ہے۔ یہ کہا کہ رجوع نہیں ہونا۔ تو کہا نہیں رجوع ہوگا۔ خوشی سے

رنج کی طرف اور حدوث سے قدیم کی طرف رجوع ہو گا: دونوں کے ساتھ لگتا ہے۔ بلی کے معنی دونوں کا نفی اثبات ہے۔ اور اس کی وجہ بتائی۔ ان ربہ کان بہ بصیرا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔ تمام اعمال اس کی نظر میں ہیں۔ یہاں بھی۔ ایک بڑا آدمی چھوٹے آدمی کو دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ جب اس سے کوئی اس چھوٹے آدمی کی شکایت کرتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ ارے کیا کہتے ہو سب کچھ میری نظر میں ہے۔ وہ ہے یہ موقع فلا اقسم بالشفق واللیل وماوسق۔ والقمر اذا اتسق میں قسم کھاتا ہوں (اکثر قسم کے موقع پر لا زائد آتا ہے۔ یہ محاورہ ہے۔ زبان کا) شفق کی۔ اور قسم کھاتا ہوں رات کی اور رات جس چیز کو جمع کرلے، تمام جاندار اور تمام بہائم اور حشرات الارض جو رات کو نکل جاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کی قسم کھائی ہے۔ اور قسم کھاتا ہوں چاند کی جب وہ مجتمع ہو جائے بدر کامل ہو جائے۔ تاریکی اور اندھیرے اور اجالے دونوں کی قسم کھائی۔ جامع عالم ہے۔ پوری کائنات کی قسم کھائی۔ قسم اس لئے کھائی ہے۔ کہ یہ انقلاب برابر ہو رہا ہے۔ ابھی ظلمت ہے ابھی ضو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت ذکر الٰہی ہونا چاہئے۔ اور یہ پانچ وقت کی جو نماز فرض ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ ۵ انقلاب ۲۴ گھنٹے میں ہوتے ہیں۔ ایک صبح سے ظہر تک۔ ایک حالت ہو گئی۔ پھر زوال شروع ہوا۔ تو حالت دوسری ہو گئی۔ پھر زوال کے بعد تیسرا درجہ شروع ہو گیا۔ وہ عصر کا وقت ہو گیا۔ پھر عصر سے مغرب کا تیسرا زمانہ آئے گا۔ پھر چوتھا زمانہ مغرب سے عشاء تک۔ پھر عشاء کے بعد سے صبح تک پانچواں انقلاب۔ یہ پانچ انقلاب ہیں۔ یہ پانچ انقلاب خبر دے رہے ہیں کہ یہ چیز دائمی نہیں

ہے۔ اس میں پھنسنا نہیں۔ جو چیز دائمی نہیں ہے وہ پھنسنے اور دھوکا کھانے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے ان اوقات میں یادِ الٰہی فرض کی گئی۔ تاکہ انسان کو عبرت ہو۔ یہ وقت گزر گیا۔ یہ وقت گزر گیا۔ رہنا نہیں ہے یہاں۔ ہر وقت ڈرنا چاہیے پہلے زمانہ میں ریلوں پر دستور ہوتا تھا۔ بہت دور گاڑی ہوتی تھی میل ڈیڑھ میل پہلے تو اسٹیشنوں پر گھنٹی بجتی تھی ریل اس وقت نظر نہیں آتی تھی مگر منٹ دو منٹ میں آجاتی تھی۔ تو یہ وہ کھٹا کا ہے۔ اس کھٹاکے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی مر جائے گا۔ نہیں وہ خبر دے رہا ہے کہ دیر نہیں جلد آنے والی ہے۔ ان سب چیزوں کی قسم کس بات پر کھائی ہے۔ لترکبن طبقاً عن طبق طبق کے معنی حال ایک حال کے بعد دوسرے حال میں تم کو ملاقات کرنی پڑے گی۔ ایک حال سے دوسرے حال میں تم کو داخل ہونا پڑے گا۔ برابر انقلاب ہو رہا ہے۔ جب انقلاب ہو رہا ہے۔ تو انقلاب میں دوام کی گنجائش نہیں ہے۔ تو اس جگہ ایک وقت معین تک ٹھہرتا ہے۔ اب جس جگہ ٹھہرتا ہے وہی منزل ہے۔ اس کے اندر دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ اور دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ آخرت پر ایمان لانا چاہیئے۔ اور عاقبت کے آرام و آسائش کے لیے عمل کرنا چاہیئے اور کوشش کرنا چاہیئے۔ اسی بات پر قسم کھائی ہے کہ حالات میں انقلاب ہوتا رہے گا طبقاً عن طبق کے یہ معنی ہیں کہ ایک حال سے دوسرے حال میں داخل ہوتے رہیں گے۔ اگر آپ غور کریں تو یہ جو آسائش آپ کو ہے اس میں اتنی بے آرامی محسوس ہوگی کہ آپ اس کو چھوڑ دیں گے اور جن لوگوں کو یہ محسوس ہوتی ہے وہ ارباب مکاشفہ کہلاتے ہیں۔ اور وہی اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ ہم آرام سے کھا رہے

ہیں۔ پی رہے ہیں ان کو کچھ نہیں۔ چھوٹے بچے گلی میں کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کچھ نہیں دیکھتے۔ کھانے کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ اور بچے ماں باپ کے منہ میں ٹھونستے بھی ہیں تو وہ ان کو ہٹا دیتے ہیں۔ انہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا وہ واقف نہیں ہوتے۔ ایک بچہ کو اگر کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لے تو ماں کے دل میں کینہ رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا بھائی بیجا منہ پر لگا کر اس کو ڈرائے تو وہ روتا ہے مگر ماں باپ بھائی سب جو اس کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کرتے وہ آنسوؤں سے روتا ہے اور وہ ہنستے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں وہ اس کے لئے کوئی دکھ والی چیز نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ماں چولہے کے پاس ہے۔ بچہ آنگن میں کھیل رہا ہے لیکا یک اس کی نظر پڑتی ہے کہ وہ سانپ یا کنکھجورے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اکدم بھاگتی ہے۔ چہرہ کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ چیختی دوڑتی ہے۔ ہے ہے بچہ زہریلے کیڑے کو پکڑ رہا ہے۔ ڈس لے گا۔ اور بچہ ہنستا ہوتا ہے۔ بچہ ہنستا ہے تو ماں روتی ہے۔ اور بچہ روتا ہے تو ماں ہنستی ہے۔ تو یہ تکلیفیں جو پہنچ رہی ہیں۔ ان کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ تم کو اصل میں امتحان میں ڈالا جا رہا ہے۔ جو بالغ معرفت کے لوگ ہیں۔ وہ ان تکلیفوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ جس طرح بڑا بھائی ڈراتا ہے۔ تو اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ مگر دشمن اگر ٹیڑھی نظر سے دیکھ لے تو اس کی گردن مار دیں گے۔ اسی طرح بالغ نظر آدمی دنیوی تکلیف کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور متاثر نہیں ہوتے۔ تو جتنے انبیاء علیہم السلام اور ولی اللہ ہیں وہ ان سے نہیں گھبراتے اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی مصلحت ہے جو عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اس لئے تکلیف سے نہیں بھاگنا چاہئے۔ ویسے یہ عقل کے بھی بالکل خلاف

ہے. کیونکہ غنا اور تونگری میں جو طلب ہے وہ اتنی پریشان کن ہے کہ میرے پاس روزانہ کاروباری لوگ آیا کرتے ہیں کہ بڑی تکلیف ہے. کساد بازاری ہے۔ اس کے لئے کچھ دعا کیجئے۔ وہ اتنے پریشان ہوتے ہیں کہ ہم نادار لوگ اتنے پریشان نہیں ہیں. یہ اصحاب امیر وکبیر اور صاحب موٹر یہ اتنے پریشان ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر وقت اس مال کے زائل اور ضائع ہونے کا ان کو فکر ہوتا ہے اور ہم جیسے غریبوں کو اس کے حصول کا فکر ہوتا ہے. کہ مل جائے تو کچھ کام چلے تو ان کو ضائع ہونے کا فکر ہے اور ہم کو حاصل ہونے کا فکر ہے. ایک جگہ حصول کا فکر ہے۔ ایک جگہ زوال کا فکر ہے. اور حصول کا فکر زوال کے فکر سے بہتر ہے کیونکہ حصول وجود ہے. اور زوال فنا ہے. اور وجود فنا سے بہتر ہے. لہٰذا فقیری امیری سے بہتر ہے. یہ تو دماغ نے سمجھا ہے اگر دل سمجھ لے تو اسی وقت سب کچھ ہے. تمام انبیاء علیہم السلام تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام اولیاء اللہ دل سے سمجھتے ہیں. ہم نے تو دلیل سے سمجھا لیا ہے. ایک بہت بڑا پہلوان ہے آپ نے اس کے چٹکی لے لی. تو وہ دیکھے گا بھی نہیں اور دیکھے گا تو ہنسنے لگے گا. اور بچے کے ہلکا سا ناخن لگا دو تو آنسو سے رونے لگے گا. تو کمزوری کی وجہ سے برداشت نہیں کر سکتا. اور پہلوان طاقت دار ہوتا ہے تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے. اور جو لوگ تکلیف برداشت کرتے ہیں. وہ تکلیف کا اظہار بھی نہیں کیا کرتے یہ بھی عقل کے مطابق ہے. کبھی چوٹ لگ جاتی ہے. زخم ہو جاتا ہے. ہڈی ٹوٹ جاتی ہے. تو پٹی باندھ دی جاتی ہے. جب پٹی کھول کر دکھلانے کا وقت آتا ہے تو کھول کے دکھانے والا دکھانے کو تیار نہیں ہوتا وہ نہیں چاہتا کہ کھول کر دکھلائے

کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح جو لوگ اپنی
تکلیف پر قابو رکھتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی تکلیف کو ظاہر نہیں کرتے۔ بہت واضح
ہو گیا۔ روحانی چیز کو حسی چیز سے واضح کر دیا بس یہی میرا کام ہے۔ اور دوسرے
سے کیا شکایت کروں۔ ابھی میری بیوی بیٹا، کسی سے میری شکایت کریں کہ ہمارے
گھر میں بڑی تنگی ہے۔ فاقہ ہے یا جو بھی ضرورت ہے اور مجھے پتہ چل جائے
یا آپ مجھ کو بتائیں تو مجھے کتنا رنج اور غصہ ہوگا۔ کہ میرے گھر والوں نے میرا
عیب ظاہر کر دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ ناراض ہوتا ہے۔ کہ میرا
بندہ میرا ہو کر دوسروں سے کہتا ہے۔ اور شکایت کرتا ہے۔ اس لئے جتنے اولیاء
اللہ ہیں اور خدا کے خاص بندے ہیں وہ کبھی کسی سے شکایت نہیں کرتے۔ اور
یہاں بھی دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے کبھی کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کو اچھے اچھے
کھانے کھلاتے ہیں جو بچ جاتا ہے اندر بھیج دیتے ہیں۔ اب بچے اگر یہ کہیں کہ
ہم تو تمہارے بیٹے ہیں بیٹیاں ہیں۔ بیوی ہیں۔ ہمیں تو ایسا نہیں کھلاتے اور
غیروں کو کھلاتے ہو۔ تو اس کا کیا جواب ہے۔ یہ کہ سارا مال و دولت مکان دوکان
جائیداد سب تمہاری ہے۔ یہ تو دو منٹ کے لئے آئے تھے۔ کل مال کے مالک تو
تم ہو۔ بات صاف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی توفیق عنایت فرمائے۔

فہالھم لا یومنون۔ انہیں کیا ہوگا۔ جو بات نہیں مانتے ایمان نہیں لاتے اس میں
کونسی ایسی چیز تھی جو نہ سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہر وقت انقلاب ہو رہا ہے۔ برابر
حرکت ہو رہی ہے۔ اور یہ انقلاب جب تک ایسی حد کو نہیں پہنچے گا جو ناقابل انقلاب
ہو اس وقت تک یہ حرکت نہ آئے گی [illegible]

وہ ماننے کی چیز تھی مگر نہیں مانتے۔ اتنے بین دلائل کے بعد بھی نہیں مانتے۔

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُوْنَ۔

اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ تو سجدہ نہیں کرتے لایسجدون کے معنی سجدہ نہیں کرتے۔ مفسّرین نے اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے جنھوں نے یہ سب تفسیریں چودہ سو برس کے بعد ہم تک پہنچا دیں۔ کہ خشوع خضوع اور عاجزی نہیں کرتے ایک دن کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے واسجد واقترب کی آیت پڑھی تو آپؐ سجدہ میں گرے اور سب اصحاب بھی سجدہ میں چلے گئے مگر جو منافقین تھے وہ کھڑے تماشہ دیکھتے اور تالیاں بجاتے اور استہزا کرتے رہے۔ تو اس موقع پر یہ نازل ہوئی۔ یہ اس کا شان نزول ہے۔ ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ سجدہ نہیں کرتے۔ یہ سب جو کچھ میں کہتا ہوں انہیں حضرات کا کہا ہوا ہے۔ ہیں تو کوئی عقلی بات ہوتی ہے تو اپنی طرف سے کہہ دیتا ہوں۔ اور یہ حق بات ہے بل الذین کفروا یکذبون۔ مگر یہ کافر جو ہیں۔ تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ تمہارا تو روزی رزق ہے جھٹلانا۔ اصل چیز یہ ہے کہ تکذیب کی ٹھان لی ہے اور یہ استہزا، اور لغو گوئی اور بے ہودہ باتیں۔ یہ سب اس کی فرع ہیں۔ جو کچھ انہوں نے دل میں جمع رکھ چھوڑا ہے۔ بغض حسد اور شرک اور بدعت وہ سب اللہ کے علم میں ہے۔ یعنی جتنی خرابیاں ہیں سب اللہ کے علم میں ہیں فبشرھم بعذاب الیم ان کو عذاب الیم کی خوشخبری دیدو۔ عذاب الیم دردناک عذاب حالانکہ خوشخبری تو نیکی کی دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں بطور استہزا کے فرمایا۔ وہ لوگ استہزا کر رہے ہیں تو ان کو جواب بھی ان ہی الفاظ میں دیدیا۔ استہزا

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ

معنی دو ہیں یا تو استثنا ہے کہ ان ہی میں سے چند لوگ توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں۔ اور نیک کام کریں۔ تو ان کے لئے ثواب غیر ممنون ہے۔

یا الا منقطع ہے لیکن جو لوگ ایمان لے آئے۔ خواہ ان میں سے ہوں۔ یا کوئی اور ہوں اور انہوں نے نیک کام بھی کئے تو ان کے لئے قدرت، اجر اور ثواب غیر ممنون ہیں۔

غیر ممنون یعنی غیر منقطوع کسی حد پر نہیں ٹھہرے گا۔ اور ممنون مشتق منت سے ہے۔ کہ احسان نہیں جتایا جائے گا کیونکہ ایک گھنٹہ کے کام کے معاوضہ میں لاکھوں برس کے کام کا معاوضہ مل جائے تو یہ عقل میں نہیں آتا۔ آتی مزدوری دینا جو ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کا احسان جتایا جائے۔ مگر احسان بھی نہیں جتایا جائے گا۔ کہ کہیں دل میلا نہ ہو۔ دکھ نہ پہنچے۔ سورۃ ختم ہو گئی۔ اللہ آپ کو اور مجھے نیک اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔

حضور نے اس سورۃ کے بارہ میں یہ اعلان فرمایا کہ جو اس سورۃ کو پڑھے گا اس کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں پیچھے سے نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بچائے گا۔ کہ نامہ اعمال پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں کئی مرتبہ یا روزانہ پڑھی جائے یہ دین کی بات ہے۔ اس میں نہ زیادتی کی جائے گی نہ کمی۔ عقل کی بات چاہے جتنا کیلئے لیئے جتنی استطاعت بیان کر دوں گا۔ ایک مرتبہ اگر پڑھ لیں تو ثابت ہو جائے گی۔ روزانہ پڑھیں تو اور اچھا ہے۔ اب آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ وَشَاهِدٍ
وَّمَشْهُوْدٍ ؕ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ النَّارِ ذَاتِ
الْوَقُوْدِ ۙ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ
بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ
فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ
عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ
لَشَدِيْدٌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ
الْوَدُوْدُ ۙ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ؕ
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ؕ
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ وَّاللّٰهُ مِنْ

وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۠

قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے۔ برجوں سے مراد بارہ برج ہیں۔ اور بعض
مفسرین نے آسمانی کیفیات کو بتایا ہے کہ یہ مراد ہیں۔ اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ
کیا گیا ہے۔ یوم جزا قیامت کا دن ہے۔ قسم ہے قیامت کے دن کی۔ قسم ہے شاہد و مشہود
کی۔ شاہد کے معنی گواہ یا حاضر۔ مشہود کے معنی جس پر گواہی دی گئی ہو۔ یا جو حاضر ہوا ہو یا
حاضر کیا گیا ہو۔ اس کی تفسیریں بے شمار ہیں۔ شاہد کے معنی یوم جمعہ یوم عرفہ یوم نحر ہے
شاہد حضور رسول اللہ صلعم اور مشہود اللہ تعالیٰ۔ بعض نے کہا شاہد پوری کائنات ہے
اور مشہود اللہ کی ذات ہے۔ بہرحال بڑی بڑی قسمیں کھائیں۔ یہ کس بات پر کھائیں۔ آگے
فرماتا ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ قُتِلَ: یہ بددعا کا فقرہ ہے۔ مارے
جائیں۔ قتل کر دیے جائیں۔ ان کا ستیاناس ہو۔ اخدود اس گڑھے کو کہتے ہیں جو کھودا جائے
مستطیل شکل میں اسے خندق کہتے ہیں۔ خندق والوں پر خدا کی مار ہو۔ وہ قتل کئے جائیں
اور مارے جائیں۔ یہ خندق والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقوں میں آگ لگائی تھی
اور اس میں مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور جلایا تھا۔ جن لوگوں نے خندقوں میں آگ جلا کر
مسلمانوں کو جلایا تھا وہ لوگ مارے جائیں۔ ان پر لعنت ہو۔ یہ کوسنا ہے یہ بددعا ہے
اللہ تعالیٰ ان کا ستیاناس کرے۔ اذھم علیہا قعود۔ جب وہ خندق پر بیٹھے ہوئے
تھے۔ وھم علیٰ ما یفعلون بالمومنین شھود۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس کو اپنی آنکھوں
سے دیکھ رہے تھے۔ اور وہاں موجود تھے۔ یہ حضور صلعم سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک

بادشاہ تھا۔ اس کے پاس ایک ساحر تھا۔ اس کے بل پر اس کی سلطنت چلتی تھی۔ جب وہ بوڑھا ہوگیا۔ تو اس نے کہا کہ کسی جوان کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس کو یہ سحر سکھادوں تاکہ وہ تمھارے کام آئے۔ بادشاہ نے ایک جوان منتخب کرکے بھیجا۔ وہ جوان جاتا رہا۔ ایک راہب اس کو راستہ میں ملتا رہا۔ اس کی باتیں وہ سنتا رہا اور اس کی باتیں اس کے دل کو لگیں اس کو اس کی تشویش تھی کہ ساحر اور راہب میں کون حق پر ہے۔ ایک روز ایک اژدہا اس کو ملا اور اس نے راستہ اس کا روک لیا۔ اس نے کہا یا الہ العالمین اگر راہب حق پر ہے تو مجھے اتنی قوت دے دے کہ میں اس اژدھے کے پتھر ماردوں اور یہ مرجائے۔ اور وہ اژدہا پتھر مارنے سے مرگیا۔ ایک روایت میں شیر بھی آیا ہے۔ بہرحال اس کو یقین ہوگیا کہ راہب حق پر ہے اور ساحر کا مذہب غلط ہے۔ اور وہ اس قدر مقدس آدمی ہوگیا کہ لوگ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس کے پاس آتے تھے۔ بیمار اچھے ہوتے اور اندھے شفا پاتے تھے۔ اتفاق سے بادشاہ کا جو معتمد تھا۔ اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ وہ اس کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لے آ۔ اللہ پاک تیری آنکھوں میں روشنی دے دے گا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا اور اللہ نے اس کی آنکھوں کو روشن فرمادیا۔ جب روشنی آگئی تو اس سے بادشاہ نے پوچھا یہ تیری آنکھوں میں روشنی کیسے آگئی۔ تو اس نے کہا خدا نے میری آنکھ روشن کردی۔ یہ سن کر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور اس کو بہت عذاب دیا۔ اس نے بتایا کہ اس لڑکے نے مجھے مسلمان کیا اور میری آنکھوں میں روشنی آگئی۔ لڑکے نے راہب کا نام بتایا تو بادشاہ نے راہب سے کہا تو خدا کو چھوڑ دے اور بت کو سجدہ کر اس نے کہا کہ نہیں میں نہیں چھوڑوں گا۔ تو اس نے اس کو آرے

سے چرا دیا۔ پھر اس لڑکے سے کہا کہ تو چھوڑ دے اس نے بھی انکار کیا۔ تو اس کو بلندی پر سے گرانے کا حکم دیا۔ اور اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے۔ مگر اور لوگ سب گر گئے اور وہ زندہ واپس آ گیا۔ پھر اس کو دریا میں غرق کرنے کے لئے بھیجا مگر ساری کشتیاں جو اسے ڈبونے کے لئے گئی تھیں سب ڈوب گئیں اور وہ بچ کر چلا آیا۔ جب وہ تھک گیا تو اس لڑکے نے کہا تو کس خیال میں ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو تو قتل نہیں کر سکے گا۔ اس کی صرف ایک ہی تجویز ہے کہ تو میدان میں لوگوں کو جمع کر اور ایک سولی لٹکا اور ایک تیر دے کر کہا کہ بسم اللہ رب ھذا الغلام کہہ کر یہ تیر میرے مار تو میں مر جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے مجمع جمع کیا اور اسی طرح وہ تیر اس کے مارا وہ اس کی کنپٹی پر لگا اور وہ مر گیا۔ پہلے تو وہ لڑکا نہیں ڈرتا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اب یہ تیر خدا کے نام پر چھوڑا گیا ہے میں ضرور مر جاؤں گا تو اس نے کنپٹی پر اپنا ہاتھ رکھ لیا اس کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ قیامت میں اٹھے گا تو اسی طرح ہاتھ رکھے ہوئے اٹھے گا۔ یہ دیکھ کر جتنے لوگ کھڑے تھے سب نے کہا۔ آمنا برب ھذا الغلام ہم اس غلام کے رب پر ایمان لے آئے۔ اس پر بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور بہت جلا اس نے خندقیں کھدوائیں اخدود خد سے مشتق ہے۔ خد معنی شق کرنا۔ ان خندقوں میں آگ جلوائی۔ اور ان لوگوں سے کہا کہ بتوں کو سجدہ کرو۔ انھوں نے انکار کیا تو اس نے ان کو بہت عذاب دیا اور پکڑ پکڑ کر خندقوں میں جلا دیا۔ بعض روایت میں بارہ ہزار ہے بعض میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور جلانے والے آگ پر بیٹھے ہوئے تھے تو اس کے معنی آگ پر بیٹھنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے کنارہ پر بیٹھ کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے یہ لعنت ہے ان لوگوں پر اور یہ عام ہے جو ظلم کرے گا۔ اس کے لئے بھی یہی آیت ہے

ان کی تخصیص نہیں ہے وما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید الذی لہ ملک السموات والارض اور ان کو کسی بات پر غصہ نہیں آیا سوائے اس بات کے کہ وہ ایمان لائے اللہ پر ایسا اللہ جو عزیز ہے۔ اور حمید ہے اور جس کی بادشاہی تمام آسمان اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ان سب کا مالک ہے۔ اس مالک پر وہ ایمان لے آئے تھے۔ اس بات پر وہ جلے اور ان کو طیش آیا اور مسلمانوں کو جلا ڈالا۔ ایمان لانے کے قابل صرف اللہ کی ذات ہے۔

اللہ کسے کہتے ہیں۔ اللہ اس ذات کو کہتے ہیں۔ جو حسن وکمال کا جامع ہو۔ اس میں اچھائی ہو اور کمال ہو۔ حسن کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کے مناسب ہو طبیعت کے مناسبت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی فعل خلاف طبیعت بھی اس سے صادر ہو تو طبیعت بُرا نہ مانے۔ برابر دکھ درد اور اذیت اللہ کی طرف سے انسان کو پہنچتی رہتی ہیں۔ مگر وہ بُرا نہیں مانتا۔ نہ جذبۂ انتقام پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے وہ راضی رہتا ہے اور کمال ایسی بڑائی کو کہتے ہیں کہ اس پر زیادتی نہ ہو سکے۔ ایسی بڑائی اور مناسبتِ طبع کے مجموعہ کو اللہ کہتے ہیں۔ تو وہ ایسے معبود پر ایمان لائے جو حقیقت میں ان دونوں کمالوں کا جامع ہے۔ اس پر ایمان لانے کی بناء پر وہ ناراض ہو گئے اور مسلمانوں کو جلا دیا تو پہلی صفت اللہ بتائی اور دوسری صفت عزیز بتائی۔ عزیز اس قادر کو کہتے ہیں جو مغلوب نہ ہو سکے۔ دبے نہیں۔ حمید ایسی ذات کو کہتے ہیں جو مستحق حمد ہو۔ حمد کی اصل علت حسن اور احسان ہے۔ خود اس کی ذات میں خوبی کا ہونا اور خوبی کو دوسرے تک پہنچانا اس کو کہتے ہیں احسان۔ اب یہ بالفعل یا بالقوۃ ہو اس وقت ہو یا آئندہ ہو نقصان نہ پہنچے فائدہ ہی فائدہ ہو۔ حمد کی اصل علت حسن ہے خواہ وہ ذات

ان کا سوجود ہو یا امکان حسن ہو، دوسرے تک حسن کو پہنچا دینے کا مستحق حمد پر وہ ایمان لائے اس پر وہ ناراض ہو گئے۔ اللہ پاک ہر آن مستحق حمد ہے کیونکہ اس کی ذات میں کبھی خوبی موجود ہے۔ اور وہ دوسروں تک بھی تمام عالمین کو بھی خوبی پہنچا سکتا ہے۔ اگر اس سے نقصان پہنچے تو وہ مستحق حمد ہونے کے منافی نہیں ہے۔ وہ ہر آن مستحق حمد ہے خواہ اس سے نفع پہنچے یا اس سے نقصان پہنچے تو اس جہان میں پہنچے تو اس جہان میں پہنچے تو وہ ہر حال میں مستحق حمد ہے جس طرح وہ اس جہان میں اس پر قادر ہے کہ کافروں فاسقوں اور نافرمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ اور جس طرح وہ اس پر قادر ہے کہ اپنے مطیع اور نیک بندوں کو دکھ پریشانی مفلسی بیماری بھیجے اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس جہان میں بھی اپنے بندوں کے ساتھ چاہے تو اسی قسم کا برتاؤ کرے۔ یہاں تو کر دیا وہاں کا وعدہ کیا کہ وہاں ایسا نہیں کرے گا۔ یہ فرق ہے۔ یہاں وہ دونوں پر قادر بھی ہے اور فاعل بھی ہے۔ اور وہاں بھی وہ دونوں پر قادر تو ہے مگر اس نے اعلان کر دیا کہ وہاں وہ فاعل نہیں ہوگا۔ اپنے مطیع بندوں کو جنت دے گا اور نافرمانوں کو دوزخ میں ڈالے گا۔

حمد کے معنی تعریف کرنا۔ ایک جماعت علماء کی یہ کہتی ہے کہ کسی اختیاری خوبی پر تعریف کرنا حمد ہے۔ کسی میں کوئی خوبی ہو اور اس کے اختیار سے وہ صادر ہو اس پر جو تعریف ہو گی وہ حمد ہے۔ مگر یہ تعریف ناقص ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات بھی مستحق حمد ہے۔ اور اس کی صفات بھی مستحق حمد ہیں۔ اور ذات و صفات دونوں غیر اختیاری ہیں۔ نہ ذات اختیار سے ہوئی ہے اور نہ صفات اختیار سے

ہوئی ہیں۔ نہ وہ اپنے اختیار سے ہوئی نہ غیر کے اختیار سے اور باوجود غیر اختیاری ہونے کے وہ مستحق حمد ہے۔ دوسری جماعت یہ کہتی ہے کہ فائدہ پہنچے تو تعریف کر اور فائدہ نہ پہنچے تو تعریف کر۔ ایسی تعریف کا نام حمد ہے۔ کیونکہ رستم کی بہادری سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے اور نہ حاتم کی فیاضی سے کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پھر بھی ہم ان کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن یہ تعریف حمد نہیں ہے۔ ابھی تک حمد کی صحیح تعریف نہیں ہوئی ہے۔ صحیح تعریف حمد کی آپ سمجھیں۔ مثلاً آپ نے ایک سوتی دکھلایا بہت نفیس تھا اس کی تعریف ہوئی دوسرے نے اس سے بڑھیا نکالا۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ ہوئی۔ اسی طرح ہر شے سے بہتر دوسری شے ملے گی۔ اور اس کی تعریف پہلی شے سے زیادہ ہوگی۔ اگر کوئی ایسی شے ہو جس سے بہتر کوئی شے نہ ہو تو اس کی جو تعریف ہوگی اس سے بڑھ کر کوئی دوسری تعریف نہیں ہوگی۔ اسی تعریف کو حمد کہتے ہیں۔ اللہ سے بہتر کوئی دوسری شے ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کی تعریف سے بڑھ کر کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ایسی تعریف جس تعریف پر اضافہ نہ ہو سکے اس کو حمد کہتے ہیں۔ اور وہ صرف خدا کے لئے ہے۔ باقی جس تعریف پر اضافہ ہو سکے وہ حمد نہیں مدح کہلاتی ہے۔ اب انسانوں میں سے جو تعریف کرے گا اس سے بڑا عالم اس سے زیادہ تعریف کرے گا۔ اس سے بڑا عالم اس سے زیادہ تعریف کرے گا یہاں تک کہ نبی آجائے گا۔ وہ ایسی بڑی تعریف کرے گا جو دوسرے انسان سے ممکن نہیں ہے۔ تو جو تعریف خدا کرے گا اس سے بڑی کوئی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بس وہی حمد ہے۔ الحمد کا جو الف ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ وہ معین فرد جو حمد کا ہے وہ صرف اللہ کے لئے ہے اور وہ معین فرد کونسا

ہے نہ وہ ہے جو تعریف وہ خود اپنی کرتا ہے یہ معنی حمید کے ہیں اور حمید جو ہے وہ علم کے معنی لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ جب تک علم نہیں ہوگا۔ انعال حمیدہ صادر نہیں ہوں گے۔ عزیز غالب کو کہتے ہیں۔ تو جب یہ دونوں اوصاف جمع ہو جائیں گے وہی بادشاہت کے لائق ہے۔ وہ ذات جو عالم بھی ہو اس سے انعال حمیدہ بھی صادر ہوں اور ایسا قادر ہو جو مغلوب نہ ہو سکے وہی بادشاہت کے قابل ہے۔

واللہ علی کل شئی شہید

یہ خاص تو اصحاب اخدود کے لئے ہے سخت تنبیہ ہے کہ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں کہ تم جلا رہے ہو اور عذاب دے رہے ہو۔ میں عنقریب تم کو سخت سزا دوں گا۔ ویسے عام ہے نیکوں کی نیکیاں دیکھ رہا ہے ان کو جلد جزا دے گا۔ بداعمالوں کی بدیاں دیکھ رہا ہے۔ ان بداعمالیوں کی جلد سزا دے گا۔ یہ معنی اللہ کے شاہد ہونے کے ہیں۔ یہ ترجمہ ہو گیا۔ اب میں بتاتا ہوں۔ شاہد یا شہید کسے کہتے ہیں۔ بہت باریک بات ہے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اولم یکف بربک انہ علی کل شئی شہید۔ (حم سجدہ ۵۳) کیا تیرے لئے تیرا رب کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے پر شاہد ہے۔ تو ہر شے پر شاہد ہونے کے کیا معنی ہر شے کی شیئت کی شہادت دی ہے۔ کوئی شے شے نہیں ہو سکتی جب تک اس کی شیئت کی اللہ پاک شہادت نہ دے۔ یہ نہیں ہے کہ صرف انعال پر اس کی نظر پڑ رہی ہے کہ یہ یہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کر رہا ہے۔ نہیں بلکہ وہ ہر شے کی ذات کا بھی شاہد ہے اگر وہ شہادت نہیں دے گا۔ تو وہ شے شے نہیں ہوگی یعنی کوئی وجود موجود نہیں ہو سکتا جب تک وہ شہادت نہ دیدے اس کے وجود کی۔

دلیل ہر شے کے وجود اور شیئت کے معنی کیا ہیں۔ جب تک وجود اور

اس کے معنی معلوم نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک شہادت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ شے موجود ہے کے معنی ہیں کہ وہ شے ہے۔ جس نے شے پر اثر مرتب ہو ترکیب کے معنی تقدیم و تاخیر کے ہیں۔ یعنی جب کوئی شے ہوگی تو کوئی نہ کوئی شے اس کے بعد ہوگی یعنی جب آگ ہوگی تو حرارت ہوگی۔ یعنی آگ کے اثرات ہیں۔ وہ آگ پر مرتب ہیں یعنی آگ کے اوصاف آگ پر مرتب ہیں۔ تو یہ مرتب جو ہے اسی کا نام وجود ہے۔ تو وجود مصدر آثار کو کہتے ہیں۔ جس شے پر اثر مرتب نہ ہو وہ وجود نہیں عدم ہے۔ لاشے محض ہے۔ سورج موجود ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ سورج پر اثر مرتب ہے۔ روشنی کا۔ اگر روشنی کا اثر مرتب نہ ہو تو سورج سورج نہیں رہے گا۔ معدوم ہو جائے گا۔ تو ہر شے کی یہ حالت ہے کہ اس پر اثر مرتب ہو رہا ہے یعنی آثار اور صفات موصوف پر مرتب ہیں۔ مرتب آثار کا نام وجود ہے۔ ہر شے پر خدا شاہد ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ تمام اشیاء پر جو آثار اور صفات مرتب ہیں ان کی شہادت خدا نے دی ہے۔ اگر یہ آثار اور اوصاف اس شے میں سے نکال دیئے جائیں تو وہ شے شے نہیں رہتی۔ لاشے محض ہو جاتی ہے۔ لاشے جب محض ہو گئی تو اثر کی ترتیب کیسے ہو سکتی ہے۔ تو آگ سے کہا کہ گرم ہو۔ اس نے کہا کیسے گرم ہوں۔ کس شے پر مرتب ہوں کیونکہ گرمی سے قطع نظر آگ لاشے محض ہے۔ جب آگ لاشے محض ہو گئی تو گرمی اور اوصاف کس پر اور کیسے مرتب ہو۔ جبتک رات نہ ہو اندھیرا کیسے مرتب ہو۔ رات لاشے محض ہے تو جہاں ترتیب اثر یعنی ایجاد کا سوال پیدا ہوا کہ شے ہو تو اللہ تعالیٰ نے گارنٹی دی شہادت دی کہ میں شہادت دیتا ہوں اس شے کی شیئت کی۔ اور اثر مرتب ہو گیا ورنہ کوئی شے شے ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اثر ہٹنے کے بعد تو وہ شے بچتے ہی

کی نہیں۔ تو کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ اس پر جو اثر مرتب ہو رہا ہے۔ اگر وہ ہٹا لیا جائے تو وہ لاشے محض نہ ہو جائے۔ اور اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔ اور جب اثر مرتب نہیں ہوگا۔ تو شے موجود نہیں ہوگی۔ تو ہر شے کے موجود ہونے کی شہادت اور ضمانت اللہ پاک نے دی ہے۔ مثلاً مجھے آپ کو ایک ہزار روپیہ دینے ہیں۔ آپ نے تقاضہ کیا۔ ایک ذمہ دار صاحب نے ضمانت دیدی کہ میں ضمانت دیتا ہوں کہ روپیہ تم کو مل جائے گا۔ آپ نے کہا کہ مل گئے۔ لینا دینا کچھ نہیں خالی ضمانت پر آپ نے کہہ دیا کہ مل گئے۔ اسی طرح ان تمام اشیاء کائنات کی ایک ذمہ دار ہستی نے شہادت دیدی تو یہ موجود ہوگئیں ورنہ یہ ہیں ویں کچھ بھی نہیں۔ قل ای شئی اکبر شہادۃ کہہ دے کون سی شے شہادت کے اعتبار سے سب سے بڑی ہے۔ (انعام ۱۹۰) جس کی شہادت کبریٰ ہر شے کی شیئت میں دخیل ہے وہ کونسی شے ہے وہ صرف اللہ ہے۔ عالم شہادت پر موجود ہوا ہے اگر شہادت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہیں ہوتا حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہے۔ اگر حقیقی وجود ہوتا تو ضدوں کے ساتھ موصوف نہ ہوتی فرمایا یانار کونی بردا (انبیا ۹۰) اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔ تو اس کے کہنے سے وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اگر حقیقی وجود آگ کا ہوتا تو کبھی ٹھنڈی نہ ہوتی۔ مجرد اس کے اعتبار اور سہارے پر ہے۔ جب وہ کہہ دیتا ہے۔ گرم ہو جا۔ گرم ہو جاتی ہے۔ جب کہہ دیتا ہے ٹھنڈی ہو جا ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ حقیقت سے ہی نہیں اس کے لئے۔ زندہ ہو۔ زندہ ہو گیا۔ مردہ ہو۔ مردہ ہو گیا۔ نہ ہو۔ معدوم ہو گیا۔ حقیقت کچھ نہیں۔ محض اس کے اعتبار اور سہارے پر ہر شے کا وجود ہے۔ اصلی وجود کائنات میں سے کسی کا نہیں ہے۔

اللہ آپ کو توفیق دے اور مجھے بھی حقیقت میں کسی شے کا وجود نہیں ہے بجز

اعتبار ہے۔ اس کو ذرا فلسفی طریقہ پر سمجھ لیں۔ کُلُّ شَیءٍ ہَالِکٌ۔ ہر شے معدوم اور باطل اور ہالک ہے۔ اِلَّا وَجْہَہٗ مگر اس کی ذات۔ اگر ہ کی ضمیر خدا کی طرف پھر رہی ہے۔ تب تو معنی بالکل صاف ہیں۔ نہیں (تفصیل) کل شئ کی طرف پھر رہی ہے۔ کل شئ، شئ قیلاً۔ شے کی ذات جو ہے۔ وہ ہے غیر ہالک باقی سب ہالک ہیں۔ کیونکہ کل شئ جو ہے وہ ہر شے ہے ہر شے اور شے ہے۔ اور شے اور شے ہے۔ ہر ہر شے تو ہالک ہے اس میں سے ہر کاٹ دیں گے تو شے بچ جائے گی۔ اور وہ اس کی ذات ہے۔ شے کی جو ذات ہے "شے" وہ تو ہے غیر ہالک اور کل شئ جو ہے۔ یعنی ہر شے وہ ہالک ہے۔ اب وہ ہر کیا چیز ہے۔ "ہر" اس شے کی شہادت ہے۔ ورنہ وہ چیز کچھ نہیں ہے۔

اب اس کو عقلی طریقہ پر سمجھیں اس میں ذرا سا دقیقہ ہے۔ ہر شے کبھی ہوتی ہے۔ کبھی نہیں ہوتی یعنی کسی شے کا وجود دائمی نہیں ہے۔ اگر دائمی وجود ہوتا تو کبھی معدوم نہ ہوتی۔ اگر دائمی عدم ہوتا۔ تو کبھی موجود نہ ہوتی۔ اگر ذاتی وجود ہوتا تو کبھی مٹتی نہیں۔ اگر ذاتی عدم ہوتا تو کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی خصلت ان دونوں کے درمیان ہے۔ اس درمیانی خصلت کا نام امکان ہے۔ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان بین یکون و بین ان لا یکون۔ یعنی وجود و عدم کے درمیان۔ تو کائنات اور اس کی ہر شے ممکن ہے۔ تمام فلاسفر، تمام حکماء اور تمام علماء متکلمین سب اس بات پر متفق ہیں کہ امکان ازل میں ہے۔ ہمیشہ سے ہے۔ ممکن نہیں۔ ممکن تو ہالک ہے۔ یعنی اس کا حدوث تو ہے ہالک مگر ہو سکتا، یہ قدیم ہے۔ سخت بھول ہوئی ہے۔ ان سب اس لئے کہ امکان تو بین بین ہے۔ وجود اور عدم کے درمیان ہے۔ امکان نہ وجود ہے نہ عدم ہے۔ بلکہ وجود اور عدم کے درمیانی چیز کا نام امکان ہے ح

اسلام ہوں یا حکمائے یونان سب سے غلطی ہوئی۔ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ جو چیز درمیانی ہے وہ کبھی اول نہیں ہونے کی۔ درمیانی چیز ہمیشہ اول سے پیچھے ہو گی۔ اور جو شے کسی شے سے پیچھے ہے وہ کبھی ازلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے امکان کبھی ازل میں نہیں ہو سکتا۔ یہ فلسفے کی بنیاد کو کاٹ دینے والا بیان ہے۔ جب تم امکان کو درمیانی چیز کہہ رہے ہو تو وہ نہ وجود میں ہو گا نہ عدم میں ہو گا۔ وہ تو دونوں کے درمیان ہو گا۔ اور درمیان ہمیشہ اول کے لبعد ہو گا۔ بیچ میں ہو گا اور ازل لااول کا نام ہے۔ لاابتدا کا نام ہے اور بیچ کے لئے اول ہو گا ابتداء ہو گی۔ لہٰذا امکان ازلی نہیں ہے۔ اب وہ امکان کیا ہے۔ امکان درحقیقت درمیانی چیز کا نام ہے۔ اور وہ صرف اعتبار پر ایک شعور دیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے کہ ذی شعور تو ہیں اس کو ہونا سمجھ رہی ہیں۔ ایک شعور دے دیا اس شعور کے اعتبار سے وہ سمجھ رہا ہے کہ ہو رہا ہے۔ ورنہ حقیقت میں کوئی کچھ نہیں ہے ایک بے شعور بچے کا باپ مر جائے تو وہ اس کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ سو رہا ہے۔ کیونکہ اس کو شعور نہیں ہے۔ شعور ہونے کی بناء پر یہ پیدا کر دیا ہے کہ یہ زندہ ہے یہ مردہ ہے۔ اگر شعور ہٹ جائے تو کوئی زندگی و زندگی کچھ چیز نہیں ہے۔ شعور کے مختلف شعبے ہیں۔ شعور بدل جائے تو حالات بدل جائیں گے یعنی زندہ مردہ لگے گا۔ اور وہ زندہ ہو جائے گا۔ مثلاً خواب میں برا اچھا ہو جائے گا اور اچھا برا ہو جائے گا۔ اور یہ مدارج لاانتہا ہیں کسی جگہ نہیں ٹھہرتے۔ اس لئے یہ جتنے شعور ہیں ان شعوروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے جو چیز بدل گئی اس کی کیا حقیقت رہی۔ کل ایک شے اچھی تھی آج بری ہو گئی۔ ابھی زندہ تھی دو منٹ لبعد مر گئی۔ اصلیت کچھ نہ رہی۔ اصلیت اس شے کی ہے جو ناقابل تبدیل ہو۔ اور امکان نہیں ہے۔ ہو سکتا برابر تبدیلیاں ہو رہی ہیں تو اس کو جو وجود ملے

گا۔ وہ عارضی ملے گا۔ وہ وجود حقیقی وہی ہے جو وجود و عدم کے درمیان جس سے یہ امکان
ہے۔ وہی وجود اصلی ہے۔ اگر اس کی ظرف میں عدم آجائے گا۔ جس ظرف میں
وجود ہے اس وجود کے ظرف میں اگر عدم متحقق ہوجائے گا۔ تو وجود و عدم کا اجتماع
ہوجائے گا۔ اور عدم اور وجود کا اجتماع محال اور ناممکن ہے۔ اس لئے کہ واقع کا جو
پیالہ ہے وہ ظرف صرف وجود سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔
نہ عدم کی نہ لاعدم کی نہ امکان کی واقع میں تو صرف وجود ہی وجود ہے۔ اور واقع کے
باہر کائنات میں یہ تمام اعتبار ہے۔ یہ خدا کے اعتبار میں ہے اور جس ظرف میں وہ
ہے سمجھانے کے لئے کہہ رہا ہوں ورنہ اللہ پاک ظرف سے پاک ہے۔ وہاں نہ وجود کا
نام ہے نہ عدم کا نام ہے کچھ نہیں کوئی چیز نہیں ہے وہاں تو صرف ایک ہی وجود ہے
نہ اس وجود میں کثرت ہے۔ نہ عدم ہے دونوں باتیں نہیں ہیں۔ تو ہر شے کو شے بنانے
والا اور شیئت دینے والا اس کا اعتبار ہے۔ اس کی شہادت ہے۔ یہ معنی ہیں اللہ
ہر شے پر شاہد ہے۔ ان اللہ علی کل شیئ شہید کے

ان الذین فتنوا المؤمنین والمومنات ثم لم یتوبو فلھم عذاب جھنم ولھم عذاب الحریق
بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو مبتلائے مصیبت کیا پھر وہ
باز نہیں آئے اور پابندی کی ان کے لیئے عذاب جہنم ہے اور جلانے والا عذاب ہے۔
عذاب الحریق یا تو اس کے یہ معنی ہیں ایسا عذاب جو جلانے والا ہے یا حریق
کوئی جلانے والی چیز اللہ کے علم میں ہے۔ اس کا عذاب یا وہ عذاب جو اصحاب
اخدود کو دیا گیا ہے۔ آخر میں جب عورت کو بچے سمیت ڈالا گیا تو آگ پلٹ پڑی
اور ان سب جلانے والوں کو جلا دیا یہ مراد ہے۔ یا عذاب جہنم سے ٹھنڈا عذاب

اور عذاب الحریق سے جلانے والا عذاب یا عذاب جہنم سے جل جانے کے بعد مزید احراقی کیفیت ہوگی جو اس سے زیادہ تکلیف کا باعث ہوگی۔ اللہ آپ کو اور ہمیں اپنے محافظت میں رکھے۔ یا جلانے کے بعد کوئلہ ہوں گے اور پھر زندہ ہوں گے پھر جلائے جائیں گے۔ تو پہلا عذاب۔ عذاب جہنم دوسرا عذاب حریق۔ قرآن شریف میں ہے بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ہم ان کی جلدوں کو دوبارہ بدل دیں گے۔ لیذوقوا العذاب (النساء: ۵۶) تاکہ عذاب کا مزہ چکھیں۔ معاذاللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو محفوظ رکھے اور جنت عطا فرمائے۔ فتنوا المومنین والمومنات مسلمان مومنوں اور مومنات کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ ابتلا میں ڈال دیا۔ امتحان میں ڈالنا۔ مصیبت میں ڈالنا۔ مگر یہ کلیہ نہیں ہے۔ یہاں بھی ایک نکتے کی بات ہے۔ یاد رکھیں فتنہ کلیتہً برا نہیں ان ھی الا فتنتک یہ تیرا فتنہ ہے۔ تضل بہا من تشاء وتھدی من تشاء (اعراف: ۱۵۵) اس فتنے سے تو جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دیدے۔ تو جب فتنے سے ہدایت ہو تو وہ کیسے برا ہے۔ انما اموالکم واولادکم فتنۃ مال اور اولاد (انفال: ۲۸) تمہارے فتنہ ہیں۔ حضرت فاطمہؑ۔ امام حسن و حسین علیہ السلام یہ اولاد نبی ہیں تو فتنہ کبھی اچھا ہوتا ہے کبھی برا ہوتا ہے۔ فتنہ کو کبھی برا نہیں کہنا چاہئے۔ جو امتحان اچھائی تک لے جائے وہ اچھا اور جو برائی تک لے جائے وہ برا۔ فتنہ کی دو قسمیں ہو گئیں بہت اچھی بات ہے۔

دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ثم لم یتوبوا ایسی سختیاں اور ایسا عذاب اور ایسا کفر کرنے کے بعد اگر توبہ کر لیں تو عذاب نہیں ہے۔ سوائے عبداللہ ابن عباسؓ کے سب اس پر متفق ہیں کہ قاتل عمداً اگر توبہ کرے تو اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔ اور یہ آیت

اس بات پر دلیل ہے۔ ثم لم یتوبوا میں استثنا کر دیا یعنی انھوں نے توبہ نہیں کی۔ اگر کر لیتے تو یہ عذاب نہ ہوتا۔ نہیں کی اس لئے عذاب ہوا۔

ان الذی آمنو وعمل الصالحات لھم جنت تجری من تحتھا الانہار ان کے علاوہ جنھوں نے ایمان لاکر نیک عمل کے لئے ان کے لئے بڑے بڑے باغ ہیں، نہریں ہیں۔

ذالک الفوز الکبیر یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہاں ایک اور لطیفہ ہے۔ جنت مونث ہے۔ اس کے لئے تلک آنا چاہئے تھا مگر مذکر کا صیغہ ذالک آیا تو یہ ضمیر جنت کی طرف نہیں پھر رہی ہے۔ جیسا کہ عام مفسرین نے کہا ہے بلکہ یہ اخبار کہ نیک اعمالوں کو جنت ملے گی۔ یہ خبر فوز الکبیر ہے۔ تو جو بشارت ہے۔ یہ بتا رہی ہے۔ کہ اللہ پاک ان لوگوں سے راضی ہے تو اس کی رضا کی بنا پر کہہ رہا ہے کہ یہ فوز کبیر ہے۔ وہ یہ خبر کب دے گا جب وہ ان سے خوش اور راضی ہوگا۔ تو یہ فوز کبیر ہے۔ اگر خوش نہ ہوتا تو جنت کی خبر نہ دیتا تو اصل میں پہلے خوش ہوا پھر جنت کی خبر دی۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس کا راضی ہو جانا جو ہے وہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ دوسری جگہ بہت صاف ہے۔ ورضوان من اللہ اکبر ذالک الفوز الکبیر یعنی رضوان حقیر من اللہ اکبر من کل شئی۔ یعنی اللہ کا ذرا سا (توبہ-۷۲)
خوش ہو جانا بہت بڑا ہے۔ بہت بڑا ہے ہر شے سے۔ اس کے مقابل میں کوئی شے نہیں ہے۔ تو جنت جو ہے وہ بسبب رضائے الٰہی ہے۔ کھانے پینے میں لذت نہ آئے اور خوشی نہ ہو تو کبھی کھانا نہ کھائے۔ اگر منہ کا مزا بدل جائے اور کوئی بیمار ہو جائے تو وہ کل نعمتیں بے کار ہو جائیں گی۔ کپڑا جوتا کھانا پینا یہ درحقیقت مقصو

نہیں ہیں مقصود صرف راضی ہونا ہے۔ طبیعت اگر راضی ہو جائے جن چیز دل سے
تو ان چیزوں کو اس خوشی کی بناء پر طلب کرتا ہے۔ اگر وہ چیزیں اس کی خوشی کا باعث
نہ ہوں تو کبھی طلب نہ کرے کسی پرندہ کو پنجرے میں بند کر دیں۔ باجرہ، دانہ اور وہ
تمام چیزیں جو اس کو مرغوب ہوں سب ڈال دیں مگر ذرا سی جھری کھلتے ہی فوراً اڑ جائے
گا۔ بالکل ان مرغوب چیزوں کی پرواہ نہ کرے گا کیونکہ وہ کھانا قید میں اس کو خوش
نہیں کرتا جنگل میں گھاس تنکے کھانا وہ اس کو پسند ہے۔ وہ اس کو خوش کرتے ہیں۔
تو اصل مقصد خوشی ہے۔ مقصود بالذات خوشی ہے۔ خدا کی خوشی بہت بڑی ہے
یعنی بندہ کے خوش ہونے کا جو سبب ہے۔ اس میں سب سے بڑا سبب خدا
کی خوشی ہے۔ آپ مجھ سے خوش ہیں۔ اور مجھے علم ہو جائے کہ آپ مجھ سے خوش
ہیں تو آپ کی خوشی سے مجھے خوشی ہوگی۔ اگر آپ سے بڑھیا آدمی آئے اور وہ خوش
ہو تو اس خوشی سے وہ خوشی بڑی ہوگی اور اس سے بڑا آدمی یہاں تک کہ سب سے
بڑا آدمی بادشاہ اگر آئے اور وہ خوش ہو تو اس کی خوشی سے مجھے بہت بڑی خوشی
ہوگی۔ اسی طرح بڑے سے بڑا یعنی اگر خدا خوش ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے
کہ وہ خوش ہے تو اس سے بڑی کوئی خوشی نہ ہوگی۔ نہ جنت سے وہ خوشی حاصل
ہوگی نہ حوروں سے حاصل ہوگی اور اس کی ترکیب اس نے بتادی۔ رضی اللہ
عنہم ورضوا عنہ۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ ان سے خوش ہو گئے۔ وہ کیسے خوش
(بینہ۔۸)
ہوا کن سے خوش ہوا وہ کون لوگ ہیں۔ ذٰلک لمن خشی ربہ یہ ان لوگوں کے لئے ہے
جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یہ خوشی خدا کی خدا کے ڈر کی وجہ سے ہے۔ آپ
بھی دیکھیں کہ اگر آپ کو کوئی ایسا آدمی مل جائے کہ وہ آپ کا رعب مانے تو آپ کو

خوشی ہوگی۔ تو اللہ کو خوش کرنے کی سب سے اچھی تدبیر یہی ہے کہ اللہ سے ڈرے۔
ان بطش ربک لشدید
پھر اس مضمون کو دہرایا بطش کہتے ہیں زور سے پکڑ لینے کو۔ تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ انہ ھو یبدئ ویعید عمل کرنے کے لئے پہلی بار بھی اسی نے بنایا اور جزا دینے کے لئے دوبارہ بھی وہی بنائے گا۔ یا حضرت ابن عباس کے مطابق پہلے جلا کر کوئلہ کر دے گا پھر دوبارہ جلا کر پھر ان کو عذاب حریق دے گا معاذ اللہ بہر حال دونوں معنی لگتے ہیں۔ وھو الغفور الودود۔ ذوالعرش المجید فعال لما یرید وہ کیسا ہے۔ ایک جگہ تنبیہ کی۔ وعید کی۔ اب وعدہ بیان کیا۔ یہ قاعدہ ہے۔ قرآن کا جہاں وعدہ ہوگا۔ وہاں وعید ہوگی۔ جہاں دھمکی ہوگی۔ وہاں بشارت ہوگی جہاں عذاب کا ذکر ہوگا وہاں ثواب کا ذکر ہوگا۔ بطش ربک لشدید وہ دھمکی ہے یہ بشارت ہے۔ وھو الغفور الودود غفور بخشنے والا معاف کرنے والا۔ گناہوں کو بخشنے والا۔ ان ربک لذو مغفرت للناس علی ظلمھم (ر۱۳ع-۶)۔ تیرا رب ان کے ظلم کاری کے وقت معاف کرنے والا ہے۔ یعنی اگر آدمی توبہ نہ کرے تب بھی بخشنے والا ہے کبھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ گندگی سفید کپڑے پر پڑتی ہے۔ ہلکے سے اس کو جھٹکا دیا گر پڑتی ہے۔ نشان دھبہ تک نہیں آتا تو بڑے بڑے گناہ کبھی وہ اس طرح معاف کر دیتا ہے۔ مثلاً کسی کو سلام کر لیا۔ اور کوئی ایسی ہی چھوٹی سی نیکی کی اس پر بڑا گناہ معاف کر دیا۔ وہ روز ایسا کرتا رہتا ہے۔ کبھی بغیر اس کے بھی یوں ہی معاف کر دیتا ہے۔ غفور معنی بڑا بخشنے والا مبالغہ کے معنی یہ ہیں۔ بہت بخشنے والا بڑا معاف کرنے والا۔ ذرا ذرا سی بات پر خطاؤں کو معاف کرنے والا۔ یہاں بھی ایسا

ہوتا ہے کہ بہت ناراض ہیں خفا ہیں کسی چھوٹے سے اور آپ کو اس نے ذرا سلام کیا فوراً گلے سے لگا لیا۔ معاف کر دیا۔ نہ رنجش۔ غصہ۔ نہ ناراضگی۔ سب ختم۔ ودود کے معنی محب بعض نے کہا محبوب۔ اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے یا جو اس کے نیک بندے ہیں ان کو خدا سے محبت ہے اور جو نسبت ہوگی تو فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ ذو العرش المجید عرش والا عرش کے معنی یا تو سلطنت کے ہیں سلطنت والا یا عرش عظیم جو جسم ہے آسمان پر عرش عظیم والا۔ اس کے یہ معنی کہ بہت بڑا حسین اور خوبصورت جسم ہے۔ کہ اس سے حسین اور بڑا کوئی جسم خدا نے پیدا نہیں کیا۔ اس کا نام عرش ہے۔ اس کا وہ مالک ہے۔ مجید کے معنی بزرگ مجید تو متواتر قرات ہے اور ایک روایت میں ذو العرش المجید بھی آیا ہے یعنی عرش کی صفت۔ عرش بہت بڑا عظیم الشان ہے۔ فعال لما یرید اب چونکہ یہ سب حروف بالامد خبر آ رہے ہیں تو یہ فعال ہو کی خبر نہیں ہے۔ اگر الفعال ہوتا تو اس کے ساتھ لگ جاتا۔ بلکہ ھو محذوف ہے۔ ھو فعال لما یرید۔ وہ کر ڈالتا ہے۔ جو چاہتا ہے۔ یعنی اس کا فعل اس کے ارادہ کے بالکل تابع ہے۔ فعل کو ارادہ کے علاوہ کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح فعل یہاں متحقق ہونا ارادہ کو لازم نہیں بلکہ ارادہ کو قدرت کو دھکیلنا پڑتا ہے۔ پھر اعضاء کو دھکیلنا پڑتا ہے۔ پھر آلات اور اسباب مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ پھر مدت اور زمانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں یہ چیز نہیں ہے۔ یہ چیز نہیں ہے ادھر ارادہ ہوا ادھر وہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جتنے فعل ہو رہے ہیں یہ اگر فاعل کے ارادہ کے تابع ہوں گے تو وہاں ارادہ اور مراد میں تخلف ہو جاتے گا۔ یہ راز کی بات ہے۔ اسے آپ سمجھ لیں۔ جتنے نہ ملوں کے فعل ان کے ارادہ سے

باہر ہیں وہاں ارادہ اور مراد کے درمیان مسافت ہوگی۔ وہ قطع کرنا پڑے گی۔ اور اس میں وقت لگے گا یعنی زمانہ لگے گا۔ اور مادہ کی ضرورت پڑے گی۔ زمانہ درکار ہوگا۔ ہمارے کھانے کا فعل ہے ارادہ کرنا پڑے گا۔ پھر قدرت کو استعمال کرنا پڑے گا۔ اگر اس پر عجز ہوا تو چمچہ لینا پڑے گا۔ اگر یہ بھی کافی نہ ہوگا تو دوسرا آدمی لقمہ لے کر منہ میں ڈالے گا۔ بہر حال مسافت ہوگی۔ دیر لگے گی۔ اس طرح مادہ اور زمانہ کی ضرورت ہوگی۔ تب کہیں جا کر فعل کھانے کا ہوگا۔ یہ کلیہ قاعدہ آپ کو بتلا دیا۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی جلدی یہ فعل ہوتا ہے۔ اس کائنات کے جتنے فعل ہو رہے ہیں۔ وہ سب فاعل سے باہر ہیں۔ لیکن خدا کے باہر کوئی میدان نہیں ہے جہاں وہ فعل ہوتا ہے۔ نہ زمین آسمان اور کل کائنات یہ سب اس کے علم کے اندر ہیں وہ ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے وجود کے باہر کوئی مسافت نہیں ہے جس کو طے کیا جائے واقع کا جو ظرف ہے سب اس کے وجود سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں بالکل گنجائش نہیں ہے۔ یہ سب اس کے علم میں ہے۔ اس کی ایک مثل ہے مثال نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں لاکھوں ہاتھیوں کی قطار یک آن آپ کے سامنے کھڑی ہوگی۔ آپ ان کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ ان کو دوڑا دیں۔ ان کو لڑا دیں۔ ان کو الٹا لٹکا دیں۔ مجرد آپ کے سوچتے ہی ویسا ہو جائے گا۔ وبائے عام میں سب کو مار دیجئے۔ فوراً سب ہاتھی مر جائیں گے۔ یہ ظرف خیال میں ہے ظرف ارادہ کے اندر ہے مراد اگر خدا کے باہر کوئی ظرف کوئی میدان ہوتا اور دوسری شے کا ایسا ہی وجود ہوتا تو وہ اس کو ایک آن میں پیدا نہ کر سکتا۔ پہلے اس پر قابو پاتا پھر کر سکتا۔ مگر ایسی کوئی شے کوئی میدان کوئی ظرف اللہ تعالیٰ کے ظرف سے باہر ہے ہی نہیں۔ اللہ سے دعا کریں کہ کوئی

غلط فہمی نہ پیدا ہو اللہ ہر شے سے پاک ہے سمجھانے کے لئے ظرف میدان اور وجود کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ حقیقت میں وہ ہر شے سے پاک ہے۔ انتہائی نازک بات ہے کہ ایسے لفظوں سے سمجھانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے زمین آسمان کا بنانا ایسا ہے جیسا ایک تنکا بنانا۔ لاگت سے سمجھیں جو لاگت آسمان زمین کے بنانے میں لگتی ہے وہ اتنی ہی لاگت ہے جتنی ایک تنکا بنانے میں لگتی ہے۔ کچھ نہ کچھ قدرت طاقت لگی تو جتنی تنکے میں لگی اتنی ہی زمین آسمان بنانے میں لگی۔ ایسا نہیں ہے کہ بڑی چیز بنانے میں زیادہ لاگت لگی اور چھوٹی چیز بنانے میں کم طاقت لگی۔ مَا خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ (لقمان ۲۸) تمہارا سب کا پیدا کرنا اور پھر دوبارہ پیدا کرنا ایسا ہے جیسے ایک نفس کا پیدا کرنا۔ جو طاقت اور قدرت ایک نفس کے پیدا کرنے میں صرف ہوئی اتنی ہی طاقت سب کے پیدا کرنے میں اور دوبارہ پیدا کرنے میں صرف ہوئی کچھ بھی فرق نہیں۔ زبان کمزور ہے بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (بروج ۱۶) جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ فوراً فعل صادر ہوتا ہے۔ اس کے ارادہ سے۔ کیوں کا سوال ہمیشہ وہاں پیدا ہوگا۔ اس بات کو یاد رکھیں کہ جہاں فعل غیر اختیاری ہو یا ایسا اختیار ناقص ہو جو بمنزلہ غیر اختیاری کے ہو۔ اور یہاں تجرد اختیار ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں کیوں کا سوال یہاں نہیں ہوگا جس طرح اس کی ذات بے کیوں ہے اسی طرح اس کا فعل بھی بے کیوں ہے۔ بے وجہ ہے، بے سبب ہے۔ بے علت ہے۔ تجرد ارادہ ہے۔ ادھر ارادہ کیا بغیر مسافت بغیر مدت طے کئے فوراً ہو جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ۙ وَالَّذِيْ
قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ۙ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً
اَحْوٰى ۝ؕ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ
الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ؕ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ۚۖ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ
الذِّكْرٰى ۝ؕ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ۙ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝ۙ
الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ۚ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا
يَحْيٰى ۝ؕ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ؕ
بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ۙ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ؕ
اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ۙ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ۔ اعوذ بکلمات اللّٰہ التامات من شر ما خلق ۳ بار اعوذ باللّٰہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم (آٹ۳بار) بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ۔ سبح اسم ربک الاعلی الذی خلق فسوی۔ تسبیح کر اپنے رب اعلیٰ کے نام کی جس نے پیدا کیا پھر درست کیا۔ پھر ٹھیک کیا۔ تسبیح کے معنی ہیں تبعید دور کرنا۔ کپڑے کو پاک کیا یعنی کپڑے سے نجاست کو دور کیا۔ یا نجاست کو کپڑے سے دور کیا۔ تو رب کی تسبیح کرنے یا پاکی بیان کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ رب کے نام کو نجاست سے ناپاکی سے دور کر۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ وہ کونسی ناپاکی یا نجاست ہے جس سے اللہ کے نام کو دور کرنا یا پاک کرنا ہے۔ پہلے یہ جان لیں کہ تسبیح کی ۵ قسمیں ہیں ۱۔ رب کے نام کی تسبیح ۲۔ رب کی ذات کی تسبیح ۳۔ رب کی صفات کی تسبیح ۴۔ رب کے افعال کی تسبیح ۔ ۵۔ اور رب کے احکام کی تسبیح ۔

۱۔ رب کی ذات کی تسبیح ۔ یعنی رب کی ذات کو ناپاکی سے دور کر۔ وہ ناپاکی کیا ہے اس پر غور کریں ۔ اللہ پاک کا وجود ایسا وجود ہے جس میں عدم نہیں ہے ۔ نہ حقیقی عدم ہے نہ عدم کی قابلیت ۔ جیسے ہم سب زندہ ہیں مگر موت یعنی عدم کی قابلیت ہمارے اندر ہے ۔ اگر موت ذات میں مضمر نہ ہوتی تو کبھی نہ مرتا۔ سب جانور جانتے ہیں کہ ان کی ذات

ہیں موت مضمر ہے تب ہی تو بکری بھیڑیئے کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے اسکو اگر اس کا یقین ہوتا کہ وہ نہیں مرے گی تو وہ ہرگز نہ ڈرتی۔ تو تمام کائنات میں عدم کی قابلیت ہے مگر خدا کا وجود ایسا ہے کہ اس میں نہ عدم کی صلاحیت ہے نہ استعداد ہے نہ قابلیت ہے۔ کوئی امکان اس میں عدم کا نہیں ہے اور نہ اس میں ایسا عدم ہے جس میں وجود کی قابلیت ہے۔ جیسا انڈے میں مرغ کا عدم ہے لیعنی انڈے میں صلاحیت ہے کہ وہ وجود مرغ میں تبدیل ہو جائے تو اللہ کی ذات کیا ہے۔ وجود محض ہے۔ یہ آگے بتائیں گے کہ وجود کیا ہے۔ تو تین ناپاکیاں ہیں ۱۔ خالص عدم ۲۔ عدم جس میں وجود کی قابلیت ہو۔ ۳۔ وجود جس میں عدم کی قابلیت ہے۔ ان تینوں ناپاکیوں سے اللہ کی ذات کو دور کرنا ہے۔ یعنی ان میں سے کوئی شے ذات باری میں نہیں ہے۔ وہ تینوں سے پاک ہے۔ یہ ذات کی تسبیح ہے وجود کس کو کہتے ہیں۔ جس شے پر کوئی اثر مرتب ہو۔ اس شے کو وجود کہتے ہیں۔ مبدءُ آثار یعنی جب وہ شے ہو تو کوئی اثر ہو ایسی شے کو وجود کہتے ہیں اور ایسی شے جس پر کوئی اثر مرتب نہ ہو وہ عدم ہے جب تک آثار مرتب ہوتے رہیں گے اس کو وجود قرار دیا جائے گا۔ اور جب آثار مرتب ہونے بند ہو جائیں گے تو وہ شے معدوم کہی جائیگی جیسے سورج کی روشنی جب تک رہیگی سورج کا وجود ہوگا۔ اور جب روشنی ختم ہو جائیگی سورج کا وجود ختم ہو جائیگا وہ سورج کا عدم کہا جائیگا۔ اللہ کا وجود محض ہے اور جتنی کائنات ہے اس کے وجود پر مرتب ہے۔ اور کسی شے میں تاثیر کرنے کی قابلیت نہیں ہے۔ وہی تاثیر کرتا ہے۔ ذات کی پاکی کے یہ معنی ہیں۔ استعداد دو طرفہ ہوا کرتی ہے۔ ہونے میں نہ ہو سکنا اور نہ ہونے میں ہو سکنا جہاں استعداد کی نفی ہوتی ہے۔ وہاں کثرت کی نفی ہو جایا کرتی ہے۔ کثرت ذریعہ ہے استعداد کی قابلیت کی۔ جہاں استعداد و قابلیت نہ ہو وہاں وحدت ہی ہوگی کثرت نہیں ہوگی

جب کثرت کی نفی ہوگئی تو ضد کی نفی ہوگئی۔ نہ کوئی اس کی ضد ہے۔ نہ مثال ہے۔ نہ کوئی لڈا ہے
کسی قسم کی کوئی مناسبت کسی شئے سے نہیں ہے۔ یہ معنی ذات کی پاکی کے ہوئے۔ وہ وجود بالفعل
ہے۔ وجود بالقویٰ نہیں ہے۔ نہ عدم کی صلاحیت نہ وجود کی صلاحیت۔ وہ اس عدم سے
پاک ہے جو خالص عدم ہے۔ اس وجود سے پاک ہوا جس میں عدم کی صلاحیت ہے۔ اس عدم
سے پاک ہوا جس میں وجود کی صلاحیت ہے آخری دو پاکیاں تو ایسی ہیں جو شرکت سے پاک کرتی
ہیں تو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اب اگر وہ عدم محض ہوگا اور یہ اشیاء کائنات موجود ہونگی تو ان میں بالفعل صلاحیت
موجود ہونے کی نہیں ہے کہ یہ موجود ہی ہوں۔ ان کے وجود میں عدم موجود ہے یہ ہو نہیں سکتیں بغیر
کسی وجود کے۔ یعنی اگر کوئی دوسری شے نہ ہو تو یہ موجود نہیں ہوسکتیں۔ مگر یہ سب اشیاء
ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ ان کا موجود ہونا پتہ دے رہا ہے ایسے وجود کی جو ان
موجود کا غیر ہے یعنی ایسا وجود نہیں ہے۔ جیسا وجود ان کا ہے۔ یہ سب ایسی ہیں یا ویسی
اتنی ہیں یا اتنی۔ زمین کا جو قطر ہے وہ اس سے بڑا بھی ہوسکتا تھا اور اس سے چھوٹا بھی
ہوسکتا تھا یعنی موجود قطر کے ساتھ مقدر ہونا اس کی ذات کا تقاضہ نہیں ہے۔ کیوں کہ
ذات کو دونوں طرف (کمی اور بیشی) نسبت برابر ہے تو پھر کیا وجہ ہے جو اس مقدار کیساتھ
مقدر ہوئی اور اس کے خلاف تمام مقداریں ممکن تھیں۔ اور نہ ہوئی۔ تو معلوم ہوگیا کہ اس مقدار
کا مقدر کرنے والا کوئی ہے۔ جس نے اپنے قہر سے اس کو مقہور کرکے موجود مقدار کے ساتھ
مقدر کردیا۔ اسی طرح ہر شے اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ اس کا کوئی موجود کرنے والا ہے
ذالذی قدر فھدیٰ وہ اس کی دلیل بیان کررہا ہے کہ بس اللہ نے اس کو مقدر
کردیا اور پھر ہدایت فرمائی۔ تو خدا کی ذات پاک ہے۔ خالص عدم آمیزش عدم اور
آمیزش وجود سے۔ یہ ذات کی پاکی ہوئی۔

۲۔ دوسری تسبیح اللہ پاک کی صفات کی ہے۔ اللہ کی صفتیں پاک ہیں۔ اس کے کیا معنی۔ سبحان ربك رب العزت عما یصفون اللہ ان صفتوں سے پاک ہے جو عام لوگ اس کی بیان کیا کرتے ہیں۔ (صفت۔ ۱۸۰) مخلوق میں جو صفتیں رائج ہیں ان صفات سے وہ موصوف نہیں ہے کیونکہ یہاں صفت عرض ہوتی ہے۔ عرض اس شئے کو کہتے ہیں جو دوسری شئے کے ساتھ قائم ہو۔ اور تنہا کہیں نہ ملے۔ ایسا وجود جو ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا اس کو ممکن کہتے ہیں۔ ممکن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو دوسرے کے ساتھ قائم ہے یہ عرض کہلاتا ہے۔ اور ایک وہ ممکن ہے جو دوسرے کے ساتھ قائم نہیں ہے اس کو جوہر کہتے ہیں یہ عرض صفت کہلاتا ہے۔ اور جوہر موصوف کہلاتا ہے۔ عرض و جوہر فلسفیوں کی اصطلاح ہے اور صفت موصوف اہل ظاہر کی اصطلاح ہے۔ تو صفات سے پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کوئی عرض اس کے ساتھ قائم نہیں ہے۔ نہ وہاں عرض ہے نہ جوہر بلکہ وہ دونوں کا خالق ہے۔ لہٰذا وہ ان دونوں جیسا نہیں ہے۔ وہ ان کے خلاف ہے وہ تصور میں نہیں آسکتا۔ یہاں صورت یہ ہے کہ ایک شئے قائم ہوتی ہے اور ایک 'ما قائم' ما قائم کے ساتھ قیام کے بعد ایک اسم مشتق کیا جاتا ہے اس کو صفت کہتے ہیں مثلاً سفیدی دودھ کے ساتھ قائم ہوئی ہے۔ اس سے اسم سفید مشتق ہوا۔ سیاہی رات کے ساتھ قائم ہوئی اس سے اسم مشتق ہوا سیاہ وغیرہ تو یہ سفید اور سیاہ صفت ہوئیں۔ دودھ اور رات کی۔ اللہ کی صفت اس صفت سے پاک ہے جو کسی شئے کے ساتھ قائم ہو اور پھر اس سے ایک اسم مشتق کیا جائے اور وہ اسم اس پر بولا جائے یہ ناجائز ہے غلط ہے۔ وہ اس سے پاک ہے مثلاً ارادہ اور مکر اس کے افعال ہیں۔ ان سے مرید اور مکار یا ماکر مشتق ہو۔ پھر وہ اس پر بولا جائے یہ جائز نہیں ہے۔ ایسی صفت سے وہ پاک ہے۔ چاہے وہ صفت اچھی ہو یا

بری ہو۔ یا مثلاً علم جس کی ضد جہل ہے وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو۔ اور پھر اس سے عالم اور معلوم الفاظ مشتق کئے جائیں اور پھر وہ اللہ کے لئے بولے جائیں۔ اس سے وہ پاک ہے۔ غور کریں کہ وہ واحد ہے۔ وہاں اضداد نہیں ہونگی۔ یہاں جتنی صفات ہیں ان کی ضد موجود ہے۔ علم اور جہل۔ قدرت اور عجز۔ حکمت اور سفاہت تو ان صفات سے جس کی ضدیں موجود ہیں۔ وہاں یہ صفات نہیں ہونگی۔ یعنی اس کا علم ایسا ہے کہ اس کے مقابل میں جہل نہیں ہے۔ اور ہمارے علم کے مقابل جہل ہے تو اس کا علم ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہمارا علم۔ وہ اس علم سے مختلف ہے۔ اس طرح اس کی حکمت اس کی قدرت ہماری حکمت و قدرت کے خلاف۔ وہ کیا ہے یہ بعد میں بتایا جائے گا پہلے اصول سمجھ لینا چاہئے۔ آپ کچھ بھی کرلیں مگر ہم تو جائیں گے۔ یعنی پہلے آپ نہیں جانتے ہیں پھر کوشش کر کر جان لیتے ہیں تو اس کا جاننا ایسا نہیں ہے کہ وہ نہ جانتا ہو پھر جان لے۔ یعنی اس کے علم اور جاننے کے لئے ابتدا نہیں ہے وہ جان نہیں جاتا بلکہ وہ جانتا ہی ہے۔ وہ ہوتا نہیں ہے بلکہ وہ ہے۔ ہم کل نہیں تھے آج ہیں۔ کل نہیں ہوں گے۔ تو وہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہے۔ کل (گذشتہ) بھی ہے۔ آج بھی ہے اور کل (آئندہ) بھی ہے۔ زمانہ ہم پر گذرتا ہے اس پر نہیں گذرتا۔ پورا زمانہ اس کے لئے ایک ہے۔ ماضی و حال و مستقبل سب اس کیلئے ایک آن ہے۔ جس طرح دائرہ کا مرکز یک آن دائرہ کے پورے محیط کو یک جہت دیکھ رہا ہے کیونکہ مرکز کی جہت ایک ہے۔ اگر جہت دو ہونگی تو مرکز نقطہ نہیں رہے گا۔ قابل تقسیم ہو جائے گا۔ ہمارے لئے دائرہ کی جہات اوپر نیچے دائیں بائیں ہیں مگر نقطہ کے لئے سب ایک ہی جہت ہے۔ مگر یہ بھی نہیں ہے کہ صفات اس کے لئے نہ ہوں۔ صفات ہیں۔ مثلاً جب ایک خط مستقیم دوسرے خط مستقیم کو اس طرح قطع کرے کہ زاویئے برابر کے پیدا ہوں تو ہر زاویہ قائمہ

ہوگا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے علاوہ قائمہ بن ہی نہیں سکتا۔ دو متند پر خطوط بھی اگر قطع کریں تب بھی زاویہ قائمہ بن جائے گا۔ گول چوڑیاں ایک دوسرے پر چڑھا دیں، چاروں زاویے برابر کے ہوں گے۔ اور ہر ایک قائمہ ہوگا۔ تو صفات ہیں مگر ایسی نہیں ہیں جو ہمارے تصور اور ذہن و خیال میں ہیں بلکہ وہ اس سے مختلف ہیں۔ یہ معنی ہیں اللہ کی صفات کے پاک ہونے کے۔

۳۔ تیسری تسبیح یہ کہ اللہ کا فعل پاک ہے۔ یہ پہلی بات سے بھی زیادہ مشکل بات ہے۔ توجہ زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں جتنے افعال ہو رہے ہیں وہ یا تو ارادہ سے ہو رہے ہیں یا بغیر ارادہ ہو رہے ہیں۔ انسان فعل ارادہ سے کر رہا ہے۔ باقی تمام کائنات بغیر ارادہ یا اضطراری طور پر افعال کر رہے ہیں۔ ارادی فعل کی صورت یہ ہے کہ جب انسان کسی فعل کا تصور کرتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلے اس کی اچھائی آتی ہے۔ یہ اچھائی اس کے ارادہ کو پیدا کرتی ہے۔ ارادہ قدرت کو ڈھکیلتا ہے۔ اور قدرت اعضا کو حرکت دیتی ہے پھر فعل شروع ہوتا ہے۔ قدرت کو کرنے اور نہ کرنے دونوں کی طرف نسبت برابر ہے چاہے کرے۔ اس کی بھی قدرت ہے۔ اور اس کی بھی قدرت ہے کہ اگر چاہے تو نہ کرے۔ ارادہ کے پیدا کرنے کا سبب حسن اور خوبی ہے جو انسان کے شعور میں اولاً آتی ہے۔ ہر فعل کا سبب ہوتا ہے۔ اور اس کی غایت یہ اچھائی ہوا کرتی ہے! اور یہ اچھائی تصور میں سب سے مقدم ہوتی ہے اور تحقق میں سب سے آخر میں ہوتی ہے۔ مثلاً روپیہ حاصل کرنا ہے تو روپیہ کی اچھائی سب سے پہلے آئی اور جب عمل پورا ختم ہو جائے گا تب روپیہ آخر میں حاصل ہوگا۔ اسی کو سبب، غایت یا علت غائی کہتے ہیں اسی کو فائدہ کہتے ہیں۔ اور اسی کے لئے یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ کیوں کیا؟

اس سوال کے جواب میں وہی غایت آ جائیگی یعنی روپیہ کے لئے کیا تو اللہ ایسا نہیں کرتا اسی کا نام فلسفیت ہے کہ اللہ کے افعال کو اپنے افعال پر قیاس کر کے جو نتائج نکالتے تھے وہ نکال لیے۔ ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے بدعقائد پیدا ہو گئے کیوں کہ اللہ نے فعل کرنے سے پہلے کسی اچھائی یا برائی کا تصور نہیں کیا کہ فعل کا حسن ارادہ کو پیدا کرتا اور وہ قدرت کو ڈھکیلتا۔ پھر وہ فعل مرتب ہوتا اور اچھائی حاصل ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ایسے فعل سے پاک ہے۔ کیونکہ یہاں جو فعل ہوتا ہے اس کا مقصد اچھائی کو حاصل کرنا یا برائی کو دور کرنا ہوتا ہے تو یہ انسان کا نقص ہے۔ اس نقص سے بچنے کے لئے اچھائی کو حاصل کرتا اور برائی کو دور کرتا ہے۔ اگر اس کو اچھائی حاصل نہ ہو اور برائی سے بچ نہ سکے تو ناقص ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کامل بالذات ہے اس لئے اس کا کوئی فعل اچھائی کو حاصل کرنے یا برائی سے بچنے کے لئے نہیں ہوگا یہ دراصل ناقصین کی شان ہے کہ وہ اپنے افعال سے اپنے نقص کو دور کرتے ہیں تو اس کے فعل کے پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا فعل اچھائی کو حاصل کرنے یا برائی سے بچنے یعنی اپنے کمال کے لئے نہیں ہوگا۔ اب رہا اضطراری فعل تو تمام علما اور فلاسفہ کو یہ دھوکہ لگا کہ چونکہ اس کا فعل نفع نقصان سے پاک ہے۔ اس لئے اس کا فعل بے وجہ ہے۔ اور اضطراری ہے فعل تکمیل کے لئے ہوتا ہے لیکن تکمیل کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ کامل ہے لہٰذا اس کے افعال بغیر ارادہ کے ہیں اور بغیر ارادہ کے جو فعل ہوتا ہے وہ اضطراری ہوتا ہے۔ جس طرح سورج روشنی دے رہا ہے بغیر ارادہ کے بغیر نفع و نقصان کے خیال کے جس طرح سورج کا یہ فعل غیر اختیاری ہے اسی طرح خدا کے افعال بھی غیر اختیاری ہیں۔ غیر اختیاری فعل فاعل کے ساتھ ہوتے ہیں۔ فاعل سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ تو یہ تمام کائنات اس کے ساتھ ہے اس لئے یہ ازلی ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ اب یہاں دو جماعتیں ہو گئیں۔ ایک وہ جس نے

اللہ کے افعال کو ارادی اور اختیاری ثابت کیا انہوں نے اپنے خدا کو مثل انسان کے کر دیا۔ دوسری جماعت وہ ہے جس نے اللہ کے افعال کو غیر ارادی اور اضطراری ثابت کیا انہوں نے اپنے خدا کو مثل جمادات ثابت کیا۔ غیر اختیاری جتنے فعل ہیں وہ سب عیب ہیں ان سے تو وہ بظاہر پاک ہے ہی بلکہ جو فعل اچھے ہیں، ان سے بھی وہ پاک ہے۔ فرمایا:۔
ولا یحیطون بشیئ من علمہ الا بما شاء اس کے علم میں سے بہ ذرہ برابر کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر اتنا جتنا کہ وہ چاہے (بقرہ۔۲۵۵)۔ یہ اس کی مشیت پر موقوف ہے کہ وہ اتنا علم دے دے کہ آپ اس کو شناخت کر لیں۔ خدا کی شناخت کا علم آپ کو خدا ہی دیگا آپ اپنی عقل سے شناخت نہیں کر سکتے یہ ممکن کی قسمیں ہیں۔ یا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اصل میں یہ تقسیم غلط ہے۔ اللہ پاک کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ عالم ہوگا یا جاہل ہوگا۔ قادر ہوگا یا عاجز ہوگا۔ اللہ کے لئے یہ تشقیق غلط ہے یہ تشقیق یہاں ہے اس مخلوق میں۔ کیوں کہ جب اس میں استعداد کی نفی ہوگئی تو کثرت کی نفی ہوگئی۔ اور جب کثرت کی نفی ہوگئی تو وہ قابلِ تقسیم نہ رہا۔ شرکت اور قسمت کی نفی ہوگئی۔ وہ عالم ہی ہے قادر ہی ہے یہاں ممکنات میں دونوں صورتیں ہیں۔ مخلوقات میں یا عالم ہوگا یا جاہل ہوگا۔ یہ علم اس علم کا بالکل غیر ہوگیا۔ اس کے علم کو سمجھ نہیں سکتے۔ اس میں خرابی یہ ہے غور کریں کہ۔

اگر اس کا فعل ایسا ارادی فعل ہوگا جیسا انسان کا تو اس فعل کو دیکھتے ہی اس فعل کے فاعل کا یقین ہو جائے گا جس طرح مکان کو دیکھ کر فوراً معمار کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کو بنایا ہے۔ تو جس طرح ارادی افعال کو دیکھ کر فاعل کا یقین ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کائنات ایسا ارادی فعل ہوتا جیسا انسان کا ہوتا ہے تو کائنات کو دیکھتے ہی فوراً خالق کائنات کا یقین ہو جاتا مگر نہیں ہوتا تو پتہ چل گیا کہ یہ کائنات کسی ارادی فعل کا نتیجہ نہیں ہے۔ آپ

غور کریں کہ کیسا ہی بزرگ سے بزرگ اور محترم سے محترم آدمی آپ سے کہے کہ اس
مکان کو بنانے والا کوئی نہیں ہے یہ خود بخود بن گیا آپ کو کبھی یقین نہیں ہوگا۔ مگر اس
کائنات کو دیکھ کر آپ شک ہی میں پڑتے ہیں کہ اس کو کسی نے بنایا ہے۔ اور اضطراری
فعل کو دیکھتے ہی صاحب اضطرار کا پتہ چل جاتا ہے۔ یعنی سورج کی روشنی کو دیکھتے ہی سورج
کا یقین ہوجاتا ہے تو اب خدا کے یقین ہونے کا تو کوئی ذریعہ ہی نہیں رہا۔ یہ سب
غلط بات ہے یہ سب حکمت اور فلسفہ کا رد ہوگیا۔ تو نہ اضطراری فاعل کی حیثیت سے خدا
کا ہونا معلوم ہوا۔ نہ اختیاری فعل سے خدا کا پتہ چلا لیکن دلیل اس بات پر دلالت کر رہی
کہ خدا موجود ہے تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ نہ اس کا فعل اختیاری ہے نہ اضطراری ہے نہ اس کا فعل
ان دونوں فعلوں جیسا نہیں ہے لا یحیطون بشیئ من علمه (بقرہ۔ ۲۵۵) اس کے
علم کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ تصور میں نہیں آسکتا۔ ہاں آتنی بات ضرور ہے الا بما شاء
جتنا وہ چاہے آپ کو علم دیدے تو اس نے اپنے آدمی اپنے رسول کے ہاتھ بتا کر بھیجا
کہ میں ایسا ہوں۔ ایسا ہوں۔ ایسا ہوں۔ ویسے عقل میں نہیں آسکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ
عقل اتنی تنگ و تاریک ہے کہ اس کے اندر خود عقل نہیں آتی۔ کسی کو آج تک پتہ
نہیں چلا کہ عقل کیا شے ہے۔ رہا حس تو وہ دوسری چیزوں کو تو محسوس کرتی ہے
مگر خود غیر محسوس ہے۔ حس حس کو محسوس نہیں کرسکتی۔ حس غیر محسوس، عقل غیر معقول
تو اللہ تعالیٰ جو ان دونوں کا خالق ہے وہ حس میں یا عقل میں کیسے آسکتا ہے۔ نہ وہ اتنا
ہے نہ اتنا یہ سوسکتا ہیں۔ نہ وہ ایسا ہے۔ نہ ویسا یہ کیفیات نفسانیہ ہیں۔ یعنی روحانیات
ہیں۔ تو نہ محسوسات میں اس کی کوئی مثال ہے نہ روحانیات میں اس کی کوئی مثل ہے
یہ معنی اس کے فعل کے پاک ہونے کے ہیں تو ناپاکی یہ ہے کہ یہاں جتنے فعل ہیں انہیں

تدریج ہے تقدیم و تاخیر ہے۔ اور تقدیم و تاخیر ایسی جو جمع نہیں ہوسکتی۔ تو ایسی شے جو پہلے اور پیچھے ہو اور جمع نہ ہوسکے اسی کا نام زمانہ ہے۔ انسان کو فعل کرنے کے لئے مدت اور زمانے کی ضرورت ہے۔ مادہ کی ضرورت ہے مگر وہاں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ مدت کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "کن" اور وہ ہو جاتی ہے لفظ کن سرعت کیلئے ہے ورنہ دراصل اتنی مدت بھی نہیں چاہیئے۔ اس کہنے میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔ پہلے ک نکلے گا پھر ن نکلے گا۔ اتنا کم۔ یہ الفاظ کم سے کم زمانے کے لئے ہمارے یہاں ہیں اس سے کم زمانے کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس لئے اس کو استعمال کیا سمجھانے کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس جلدی کا آپ تصور نہیں کرسکتے اتنی جلدی ہوتا ہے۔ تو اللہ پاک کا فعل پاک ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے فعل کے لئے نہ غایت ہے نہ تقدیم و تاخیر ہے۔ نہ مبداء ہے۔ نہ مادّہ ہے نہ مدّت ہے۔ نہ اوزار و آلات چاہیئے مجرد ارادہ کرتے ہی وہ فعل ہو جائے گا یعنی ارادہ سے مراد جدا نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے باہر فضا ہوتی یا میدان ہوتا جیسا ہمارے یہاں میدان اور کارخانہ ہوتا ہے۔ اور وہ کام کرتا تو اس کو بھی یہی دشواریاں پیش آتیں جو ہم کو پیش آتی ہیں۔ مگر کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔ جتنی جگہ ہے وہ اس کے وجود سے بھری ہوئی ہے۔ واقع کا جو ظرف ہے۔ جو پیالہ ہے اس کے وجود سے بھر چکا ہے اس میں گنجائش ہی نہیں ہے کسی دوسری شے کی۔ تو اب جو فعل ارادی ہوگا وہ ارادہ کے اندر ہوگا ارادہ سے باہر نہیں ہوگا۔ ہمارے جتنے فعل ہیں سب ذات کے باہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم فاعل بالحرکت ہیں اور وہ فاعل بالمشیّت ہے۔ اس کے فعل کے لئے نفس ارادہ کافی ہے۔ اس وجہ سے کہا

کن فیکون (یٰسٓ - ۸۲) اللہ پاک کے افعال پاک ہیں ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کسی فاعل کے ساتھ مشتبہ نہیں ہوگا ۔ ہر فاعل کا فعل حرکت سے ہوگا اور اس کا فعل بالنیت ہوگا ۔ اس کی مثل اعلیٰ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح بالکل بے خیالی اور بے شعوری میں انسان بلاوجہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اس سے زیادہ ہماری عقل میں نہیں آسکتا ۔ گنجائش ہی نہیں ہے کہ وہ کیسے کرتا ہے ۔ یہ معنی ہیں اس کے فعل کے پاک ہونے کے ۔

۴ ۔ چوتھی پاکی یہ ہے کہ اس کا حکم پاک ہے ۔ اس نے جو احکام دیئے ہیں وہ پاک ہیں ۔ حکم کے پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہاں جتنے احکام ہوتے ہیں وہ قانون کے تحت ہوتے ہیں اور وہ قانون انسانی منافع کے پیشِ نظر بنتا ہے ۔ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر انسانوں نے کچھ قوانین بنا لیئے ہیں یعنی ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ یعنی اگر کوئی قتل کسی کو کرے تو اس کو پھانسی دو ۔ یہ دلیل سے ثابت نہیں ہوا مگر فرمایا" لقصاص حیاتہ" قصاص میں تمہاری جانوں کی زندگی ہے ایک آدمی کو پھانسی دے دو گے تو آگے قتل کا سلسلہ بند ہو جائیگا ۔ تو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر یہ قصاص شروع ہوا ہے ۔ خواہ شرع کے ساتھ ہو یا اپنی رائے اور تجربے سے گھڑ لیا ہو ۔ کوئی دلیل نہیں ہے ۔ جس طرح آگ کو حرارت لازم ہے اس طرح قاتل کو چھوڑ دینا برا ہے اور پھانسی دے دینا اچھا ہے ۔ یہ لازم نہیں ہے یعنی جب آپ قاتل کا تصور کریں تو ساتھ ساتھ آپ کے ذہن میں یہ بھی آجائے کہ اس کو مقتول ہونا چاہیئے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ دو نقطوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں یہ اقلیدس کا بنیادی اصول ہے مگر یہ دلیل سے ثابت نہیں ہے ۔ مفادِ عامہ اقلیدس کے پیشِ نظر استاد کے حسنِ ظن سے اس بات کو قبول کر لیا گیا ہے ۔ کیونکہ تعمیرات اور انجنیری کا کام علم ہندسہ پر موقوف تھا ۔ اس لئے اس اصول کو تسلیم کیا گیا ۔ اور کسی خط کو اس کی سیدھ میں

میں جتنی دور تک چاہیں بڑھا سکتے ہیں اور ایک مرکز کو فرض کر کے جتنی دوری سے چاہیں دائرہ بنا سکتے ہیں۔ یہ تین اصول ہیں ان کا نام ہے اصل موضوع ان تینوں کو معلم ہندسہ کے حسن ظن سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عام مفاد انسانوں کے کاروبار کا اس پر موقوف تھا اس لیے تسلیم کر لیا گیا اگر ہندسوں کو نہ جانے تو رقموں کا تبادلہ نہیں کر سکتا۔ اور سارا حساب اقلیدس کی ایک شکل کا نتیجہ ہے سوائے جمع تفریق کے خواہ وہ ضرب ہو تقسیم ہو۔ سود در سود ہو۔ اکائی کا قاعدہ ہو یا اور کوئی قاعدہ ہو۔ سب ایک شکل کا نتیجہ ہیں اور وہ شکل یہ ہے کہ اگر چار مقداریں باہم متناسب ہوں یعنی ایک کو دوسرے سے وہی علاقہ ہو جو تیسرے کو چوتھے سے ہے تو پہلی اور چوتھی کا حاصل ضرب دوسری اور تیسری کے حاصل ضرب کے برابر ہوگا۔ یہ ہے اقلیدس کی ایک شکل یعنی دو کو چار سے وہی علاقہ ہے جو تین کو چھ سے ہے تو ۲:۴ = ۳:۶ کے۔ تو تین مقداریں معلوم ہوتی ہیں۔ چوتھی معلوم کرنی ہوتی ہے۔ تو حساب کی کوئی شکل اس سے باہر نہیں ہے۔ سوائے جمع تفریق کے۔ اگر ان تین اصولوں کو تسلیم نہیں کیا جائے گا تو سارا اقلیدس اور سارا حساب باطل ہو جائے گا۔

ذٰلک الا بالحق (یونس ۵) اللہ نے یہ حساب باطل نہیں بلکہ حق بنایا ہے تمام انجینئری ہوائی جہاز، موٹر لین دین، سائنس سب میں مفید ہے۔ اس لئے اتنے بڑے فائدے کے پیش نظر بلا دلیل ان کو مان لیا ہے۔ دو نقطوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں یہ غلط ہے یہ صرف جب مل سکتا ہے جب سطح ایک ہی ہو۔ اگر سطحیں دو ہونگی تو کبھی نہیں ملے گا۔ مثلاً شطرنج میں شہزادہ اور فیل کی چال پر خط مل سکتا ہے مگر گھوڑے کی چال کے دوران خط نہیں ملا سکتے۔ تو کہیں ملے گا کہیں نہیں ملے گا۔ تو سارا اقلیدس اور سارا حساب غلط ہو گیا۔ مگر مفاد عامہ کے پیش نظر معلم کے حسن ظن سے اس کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ بدیہی نہیں ہے

اگر بدیہی ہوتا تو علوم متعارفہ جو بارہ ہیں ان میں یہ شامل ہوتا۔ اگر غور طلب ہوتی تو مہندس
اشکال میں رکھ کر اس کو ثابت کرتا۔ دونوں باتیں نہیں ہیں تو معلوم ہوا کہ نہ بدیہی ظاہر ہے
اور نہ یہ دلیل کے قابل ہے۔ تو بغیر دلیل کے ان تین اصولوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یا جیسے یہ
تسلیم کر لیا کہ صدق اچھی چیز ہے۔ مگر یہ اچھی چیز نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اچھی چیز ہوتا تو جہاں
صدق کا تصور آتا فوراً اچھائی کا تصور آنا چاہیے تھا۔ مگر نہیں آتا۔ اپنے کسی عزیز کی موت
کی سچی خبر سن کر وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ ٹھیک ہے۔ دل یہی کہتا ہے کہ خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو۔
یعنی جھوٹ کی خواہش کرتا ہے۔ احسان ماننا اچھی چیز ہے۔ ماں باپ کا احسان ماننا اچھی
چیز ہے۔ یہ مفادِ عامہ کی خاطر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے چھوٹے بچے کو پکڑ کر لے
جائے اور اس کے ساتھ بہت احسان کرے۔ اچھی طرح کھلائے پلائے پڑھائے لکھائے
تو بچے پر یہ نہیں ہے کہ وہ اس کا احسان مانے بلکہ اس کو پکڑوائے اور سزا دلوائے۔
مثلاً بردہ فروش ہیں۔ یہ کسی بچے کو لے جا کر اس کے ساتھ ماں باپ کا سا اچھا سلوک کریں۔
تو بچے پر یہ واجب نہیں ہے کہ ان کی اطاعت کرے اور احسان مانے بلکہ اس کا فرض یہ
ہے کہ اگر موقع مل جائے تو ان کو فوراً پکڑوا دے کہ وہ مستحق سزا ہیں۔ لیکن اگر جہاد میں
پکڑ لیے جائیں اور تقسیم کئے جائیں اور آقا ان کی پرورش کرے اور ان سے کام لے تو ان پر
فرض ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے شکر گزار رہیں اور ان کی اطاعت کریں۔ اور اگر وہ آزاد کر دیں
تو وہ ان کے محسن ہیں۔ رہا ماں باپ کا جز، بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے مگر جزئیت علت
احسان نہیں ہے۔ ولد الزنا پر باپ کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ حالانکہ جزئیت
میں نکاح اور زنا دونوں برابر ہیں۔ ایک جگہ اطاعت فرض ہے۔ دوسری جگہ بالکل کچھ
نہیں تو مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ماں باپ کی اطاعت تسلیم کر لی گئی ہے۔ اگر جزئیت

علت ہوتی تو پہلا جز بھی قابلِ تعظیم ہوجاتا ۔ نطفہ سے پہلا جز یعنی جس سے نطفہ بنا روح ،
ربح خون ، دم ، نفس اور یہ سب جز ہیں عناصر اربعہ کے تو عناصر اربعہ بھی قابل تعظیم ہوجاتے
مگر ان میں سے کوئی بھی قابل تعظیم نہیں ہے اور اگر دودھ پلانا فرضیت کا سبب ہو تو
بھیڑ ، بکریاں ، گائیں یہ بھی دودھ پلاتی ہیں ان کی اطاعت بھی فرض ہوجائے اور شکرگزاری
لازم ہو ۔ مگر ان سب کو ذبح کرنے اور کھانے کا حکم ہے ۔ تو ماں باپ کی اطاعت و شکرگزاری
دلیل سے ثابت نہیں ہے بلکہ مفادِ عامہ کی خاطر اس کو تسلیم کرلیا گیا ہے ۔ بڑی عجیب
بات ہے غور کریں ۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا اگر تمہیں اس کا خوف ہو
کہ عدل نہیں کرسکو گے بے انصافی کروگے ۔ چار نکاح کی اجازت اس شرط پر دیدی گئی کہ
عدل کرو ۔ اور اگر عدل نہ کرسکو اور تمہیں یہ ڈر ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے تو فواحدۃ پھر
ایک ہی کرو ۔ (نساء-۳) اوما ملکت ایمانکم یا لونڈیاں رکھو اور لونڈیوں میں بے انصافی
جائز ہے ۔ (نساء-۳۶) اگر عدل اچھی چیز ہوتا تو دونوں جگہ رائج ہوتا ۔ وہاں کچھ بھی نہیں ۔ ایک سے
دن بھر کام لو ۔ ایک کو دن بھر بٹھائے رکھو ۔ ایک کو خوب پہناؤ کھلاؤ ایک کو کچھ بھی نہ دو
کچھ حرج نہیں لیکن بیویوں کے لئے سب کو برابر دینا ہوگا ۔ تو مفادِ عامہ کی خاطر اس کو تسلیم کرلیا گیا ہے
سارا یورپ مل کر بھی جواب نو کیا اسے کا سمجھ بھی نہیں سکتا ۔ وہ جانتے ہی نہیں قانون کیا ہے
کہاں ثابت ہے ۔ نفس کشی بری چیز ہے ۔ یہ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر ممانعت کردی ،
کہ جان کو مت ہلاک کرو ۔ ورنہ اس کی ذات میں کچھ خرابی نہیں ہے ۔ فاقتلوا
انفسکم ذلکم خیر لکم عند بارئکم (بقرہ-۵۴) قتل کرو اپنے آپ کو یہ
تمہارے لئے تمہارے رب کے پاس بہتر ہے ۔ خودکشی کو بہتر بتایا اور بنی اسرائیل پر فرض
بھی ہوئی تھی مگر اب خودکشی کو برا بنایا ۔ مفادِ عامہ کے پیشِ نظر دلیل سے ثابت نہیں ہے ۔

تو یہ مسلمات عامہ جو ہیں ان کے ماتحت قانون بنایا جاتا ہے خواہ وہ آسمانی قانون ہو یا عقلی قانون ہو۔ ہر چیز میں اس کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ احکام ان مفاد کے ماتحت ہوا کرتے ہیں۔ تو اللہ کا حکم پاک ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے حکم کے لئے کوئی "علت حکم" نہیں ہے۔ کسی مفاد کے پیش نظر حکم نہیں دینا ظلم ہے۔ ظلم کیا ہے۔ مال کو لوٹ لینا، قتل کر دینا۔ جان کو ضائع کر دینا یعنی دکھ دیا جائے۔ بغیر جرم سابق کے۔ تو مفاد عامہ کے پیش نظر ظلم کی برائی ہوئی۔ حقیقت اس میں کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ کثیر بچے بیمار ہوتے ہیں۔ ٹی بی ہوتی ہے کینسر ہوتے ہیں۔ کنٹھ مالا ہوتی ہے۔ اندھے پیدا ہوتے ہیں۔ بہت کثیر تعداد میں جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ بغیر جرم سابق کے یہ دکھ دیئے جاتے ہیں مگر یہ ظلم نہیں ہیں۔ اس کو حسن کہا گیا ہے تو اللہ کا حکم پاک ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حکم کسی خوبی کی وجہ سے نہیں دیا گیا اور ممانعت کسی برائی کی وجہ سے نہیں کی گئی۔ یعنی حکم کی علت حسن نہیں ہے بلکہ حسن کی علت حکم ہے جس چیز کا حکم دے دیا وہ اچھی ہو گئی اور جس چیز کی ممانعت کر دی گئی وہ بری ہو گئی۔ صورت یہ نہیں ہے کہ چیز پہلے سے بری تھی۔ اس کو منع کر دیا گیا کہ اس کو نہ کرو۔ چیز پہلے سے اچھی تھی پھر اس کا حکم دیا کہ اس کو کرو۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ کائنات میں جتنے مرکبات ہیں مفرد کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مرکبات سب مفردات سے بنے ہیں۔ بڑی مرکبات چھوٹے چھوٹے مرکبات سے بنے۔ چھوٹے مرکبات ان سے چھوٹے مرکبات سے بنے۔ وہ ان سے چھوٹے سے۔ اسی طرح سلسلہ چلتے چلتے مفردات تک پہنچا۔ اب مفردات کس شے سے بنے دو ذرات سے بنے۔ یہ سلسلہ لاانتہا نہیں جا سکتا۔ کہیں نہ کہیں اس کو ٹھہرنا چاہئے۔ تو آخری ذرہ جہاں یہ سلسلہ جا کر ٹھہرے گا وہ کسی شے سے نہیں بنا۔ پھر کیونکر بنا۔ یہ خدا کے حکم سے بنا۔ تو موجودات جتنے ہیں سب خدا کے حکم سے بنے ہیں۔ اور اچھائیاں اور برائیاں

موجودات کی صفتیں ہیں۔ وہ بدرجہ اولی اس کے حکم سے بنی ہیں۔ تو اچھائی برائی اس کے حکم کے تابع ہوئی۔ اس کا حکم اچھائی برائی کے تابع نہیں ہوگا۔ یہی شبہہ شیطانی ہے جس نے شیطان کو شیطنیت میں ڈالا۔ شیطنیت یہ ہے کہ عقل میں جو اچھی چیز ہو اللہ کو چاہیئے کہ اس کا حکم کرے۔ اور عقل میں جو چیز بری ہو اللہ کو چاہیئے کہ وہ اس کی ممانعت کرے۔ الرحمن یہ کہتا ہے کہ میں جو چاہوں کروں۔ جو کچھ میں حکم دیدوں وہ مجرد میرے کہنے سے اچھی ہے اور جس کی ممانعت کردوں وہ مجرد میرے کہنے سے بُری ہوگئی۔ کیوں کہ ان کی اچھائی برائی کا حکم ان کے وجود کے تابع ہے۔ جب ان کا وجود میرے حکم سے ہوا ہے تو ان کی صفات بھی میرے حکم سے ہونی چاہئیں۔ شیطان نے یہی کہا تھا کہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین (اعراف۔۱۲) خدا نے کہا کہ میرے حکم کے بعد کون شے تجھے مانع تھی۔ مامنعک الا تسجد اذ امرتک (اعراف۔۱۲) میرے حکم کے بعد کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شے اس کے حکم کے بعد اس کا حکم بجالانے میں مصروف ہے۔ تو جب وہ خود حکم کی اطاعت میں مشغول ہے تو وہ دوسرے کو نافرمانی پر کیسے اکسا سکتی ہے کوئی روکنے والا نہیں ہے "اذا مرتک" کا نتیجہ بہت عجیب ہے غور کریں۔ آگ کو کہا گرم ہو۔ وہ گرم ہونے میں مصروف ہے۔ برف سے کہا ٹھنڈی ہو ٹھنڈی ہونے میں مصروف ہے تو آگ کیسے کہہ سکتی ہے کہ تو خدا کے حکم کو بجا نہ لا وہ حکم تو جب دے جب فارغ ہو۔ وہ تو خود مصروف ہے تو اس نے جواب دیا کہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین مجھے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ اس میں یہ مقدمہ محذوف ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے اور جو شے بہتر سے بنے گی وہ بہتر ہوگی۔ اس شے سے جو کمتر چیز سے بنے گی۔ یعنی تیرا حکم عقل کے خلاف ہے۔ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ جو اچھا ہو اعلی ہو۔ وہ مسجود ہو اور جو کمتر ہو وہ ساجد ہو۔ اور دلیل اس نے یہ بیان کی انا خیر منہ (اعراف۔۱۲)

کیونکہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے الٹا
کر دیا کہ مجھے ساجد اور اس کو مسجود کر دیا۔ وہ یہ نہیں سمجھا کہ اچھائی شے کی صفت ہے اور شے
میرے حکم کے تابع ہے۔ انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون ہو وہ ہو گئی
(یٰسین - ۸۲)
اور اس کی اچھائی برائی سب اس کے ہونے کے اندر آ گئی۔ کائنات کا وجود جب میرے
حکم سے ہے تو اس کے احکام بھی سب میرے حکم کے تابع ہوں گے اور شیطان نے الٹا کر دیا کہ
میرے احکام کو کائنات کے حسن اور قبائح کے تحت کر دیا۔ شیطنیت رحمانیت کی الٹ ہے
اور اپنا یہی فلسفہ اس نے اپنے شاگردوں کو سکھایا تو یہ جتنے فلسفی اور حکماء ہیں سب اس کے
شاگرد ہیں کیونکہ وہ یہی کہتے ہیں کہ عقل کے مطابق ہو اور آئی موٹی بات نہیں سمجھتے کہ عقل یہ
کبھی نہیں چاہتی کہ پیدا ہو کر پھر مر جائے چاہے اس کے بعد کتنا ہی بہتر درجہ ملے۔ اب یہ بھیڑ بکریاں
دنبے سب ذبح ہونے کے وقت چیختے پیٹتے ہیں۔ حالانکہ ان کو بہترین جسم انسانی مل جاتا ہے
آدمی کھاتا ہے تو اس سے اس کا جسم بنتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے تو اتنا سا پیدا ہوا تھا اتنا جو
انسان بڑا ہوا تو یہ کیا ہے۔ یہی بکرے بھیڑیں جو کھاتے ہیں انہیں سے تو یہ جسم بنا ہوا ہے۔ مگر
اس بہتری کے باوجود وہ ہلاک ہونے کو تیار نہیں۔ پیدا ہونے کے بعد مرنے کے لئے بالکل
تیار نہیں ہے۔ انسان کو اگر یہ معلوم بھی ہو جائے کہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور مرنے کے بعد
بہت بہتر حالت ہو گی تب بھی مرنے کو تیار نہیں ہے۔ پیدا کرنے کے بعد فنا کر دینا یہ بالکل
عقل میں نہیں آتا۔ بالکل خلاف عقل ہے۔ تو اگر عقل کی مخالفت حق ہوتی اور قابل اعتماد
ہوتی تو عقل کا تقاضہ یہ تھا کہ کائنات پیدا ہی نہ ہو۔ تو حق اگر عقل کے تابع ہو جائیگا تو کائنات
تباہ ہو جائیگی۔ ولو اتبع الحق اھواءھم اگر حقیقت اور حق تمہاری عقلوں کے
تابع ہو جاتے لفسدت السمٰوات والارض ومن فیھن۔ تو آسمان اور زمین
(مومنون - ۷۱)

میں اور جوان کے درمیان ہے سب تباہ ہو جائیگا کیونکہ عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ پیدا ہی نہ ہو مرنے کے لئے پیدا نہیں ہونا چاہیئے مگر پیدا ہو بھی رہا ہے اور مر بھی رہا ہے تو معلوم ہو گیا کہ کائنات اور حقائق عقل کے تابع نہیں ہیں۔ کسقدر واضح اور بین دلیل ہے جو اللہ پاک نے ایک لفظ میں بیان کر دی۔ تمام حکماء و فلاسفہ اس غلطی میں مبتلا ہیں پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں فرق یہ ہے کہ پہلے قاعدہ کے اندر بات ہوئی تھی۔ اب اناپ شناپ بکتے ہیں سمجھتے کچھ ہیں نہیں اور بکے چلے جاتے ہیں تو اب نتیجہ حق یہ نکلا کہ اس کا حکم کسی حکم کے تابع نہیں ہے بلکہ ہر حکم اس کے حکم کے تابع ہے۔ نماز اچھی چیز ہے۔ اس لئے کہ اس نے کہا ورنہ اگر وہ نہ کہتا تو کچھ اچھی وچھی نہ ہوتی۔ اگر کوئی ابھی یہاں ناک رگڑنا شروع کر دے تو وہ فعل عبث گنا جائیگا۔ کنکریاں دیوار پر کوئی مارنے لگے تو پاگل شمار ہوگا۔ مگر حج میں یہی فعل حسن ہے۔ صفا مروہ کے درمیان اکڑ کر چلنا لازم ہے۔ یہاں کوئی چلے تو اس کو برا کہا جائیگا نماز کے تمام احکام اور حج کے تمام احکام کسی میں عقل کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔ تیمم کے لئے مٹی پر ہاتھ مارا تو اور سن گیا مگر کہا پاک ہو گیا۔ جیسا میں نے وضو سے پاک کیا۔ وہ تم نے مان لیا۔ اس کو بھی مانو۔ اب اگر یہ کہو کہ ناپاک ہے تو یہ مقصد حیات جو ہے اس کا یہ تقاضہ نہیں ہے کیونکہ ایک بہت بڑی تعداد ذی حیات کی ہے جو نالی کا پانی پیتی ہے اور کچھ برا نہیں مانتی۔ کتا، گھوڑا، بلی جب نالی کا پانی پی کر مستحق ملامت نہیں ہیں تو انسان تو تمام ذی حیات میں صرف قطرہ کے برابر ہے یہ کیسے مستحق ملامت ہوگا۔ صرف انسان کیلئے یہ حکم کر دیا کہ اگر ایسا کرو گے تو اچھے، ایسا نہیں کرو گے تو برے۔ باقی تمہارے علاوہ کل کائنات اور میں دونوں مستثنےٰ ہیں۔ خود بھوک اور پیاس کے بعد موت دیدے تو اس نے اس کا نام اچھا رکھا۔ اور اگر تم کسی کو بھوک پیاس پہنچاؤ تو اس نے اس کا نام برا رکھ دیا۔

اگر آپ کے دروازہ پر کوئی پیاسا مر جائے تو سب ہی آپ کو برا کہیں گے۔ مگر وہ سینکڑوں کو پیاسا مار رہا ہے مگر سب یہی کہتے ہیں کہ بڑا ارحم الراحمین ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے کہنے سے ہی شے اچھی یا بری بنتی ہے۔ وہ جس کو اچھی کہدے اچھی اور جس کو بری کہدے وہ بری ہے ایمان اس لئے اچھا ہے کہ اس نے اچھا کہا۔ اگر نہ کہتا تو یہ کچھ بھی نہیں فاذا نفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون۔ جب صور پھونکا جائے گا تو ناگاہ وہ اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ (یٰسین: ۵۱) قالوا یٰویلنا من بعثنا من مرقدنا کہیں گے افسوس کس نے ہماری قبروں سے ہم کو جگا دیا۔ (یٰسین۔ ۵۲) وصدق المرسلون اور تمام رسول سچے تھے۔ یہ کہتے جائینگے اور جہنم میں جاتے جائیں گے ایمان لاتے جائیں گے اور جہنم میں جاتے جائینگے تو جہنم دار المومنین ہوا؟ ھذا یوم ینفع الصادقین صدقھم آج کے دن سچوں کا سچ انکے کام آئیگا اور یہ سچ کہہ رہے ہیں صدق المرسلون لیکن (مائدہ: ۱۱۹) یہ سچ ان کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ جہنم میں جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جہاں اور جس جگہ کہوں سچ بولو۔ وہاں سچ کام آئے گا۔ یہاں اگر سچ بولوگے تو غیر معتبر۔ اس عالم میں بیداری میں شعور میں سچ بولوگے تو معتبر ہے اس کو میں تسلیم کروں گا۔ ورنہ نہیں۔ ایمان یہاں لاؤگے تو معتبر اور اگر نزع کو دیکھ کر، برزخ کو دیکھ کر جنت دوزخ کو دیکھ کر ایمان لاؤگے تو غیر معتبر۔ یہ الگ بات ہے کہ میں چاہوں تو اس کو بھی تسلیم کروں۔ میں قانون بنانے کے بعد اس کا پابند نہیں ہوں۔ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عذاب کو دیکھ کر ایمان لے آئی اس کو تسلیم کر لیا اور عذاب (یونس: ۹۸) ہٹا دیا گیا۔ مگر فرعون ایمان لایا تو اس کو تسلیم نہیں کیا۔ کوئی قاعدہ نہ رہا کوئی ضابطہ نہ رہا۔ کوئی کلیہ نہیں بس جو وہ کہدے وہی قاعدہ ہے۔ اس نے اپنے ہر فعل ہر حکم کا نام اچھا رکھ دیا۔ ہمارے بعض افعال کا نام اچھا رکھ دیا بعض کا برا رکھ دیا۔ پھر یہ بھی کہہ دیا کہ مجھ سے اجازت

بات یہ ہے کہ تمام مخلوق ادنیٰ ہے۔ کسی مخلوق کا نام اس کا نام نہ رکھو۔ یعنی کسی لڑکے کا نام اللہ رحمٰن رحیم نہ رکھو بلکہ عبداللہ، عبدالرحمٰن، عبدالرحیم رکھو۔ اللہ کا نام چونکہ اعلیٰ ہے تو اس کا نام کسی غیر اعلیٰ یعنی مخلوق کا نام نہ رکھو۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب کافر سے بات کرو تو اللہ کا نام اس طرح پیش نہ کرو کہ وہ پلٹ کر تمہارے رب کو گالی دے اس کے نام کے ساتھ بے ادبی کرے۔ ایسی اچھی طرح پیش کرو کہ وہ اللہ کے نام کو اچھی طرح ادا کرنے پر مجبور ہوں۔ ان کو اشتعال دلا کر اللہ کے نام کی برائی نہ کراؤ۔ ایسے نام کے ساتھ تسبیح کرو۔ جو نام شریعت میں وارد ہوا ہے۔ معتزلہ تو یہ کہتے ہیں کہ ایسا نام جس میں شائبہ توہین ہو۔ اس نام سے نہ پکارو خواہ شرع میں ہو یا نہ ہو۔ مگر ہمارے یہاں یہ ہے کہ انہیں صرف اسی نام سے پکارو جس میں شرع وارد ہوئی ہے۔ ایسا نام جس میں توہین نہ ہو مگر شرع وارد نہیں ہوئی۔ اس نام سے بھی اللہ کو نہ پکارو چاہے وہ کتنا اچھا نام کیوں نہ ہو مثلاً عقلمند بڑا اچھا نام ہے مگر اللہ کو اس نام سے نہیں پکار سکتے۔ اللہ تو کیا انبیاء کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی نبی کے متعلق یہ کہہ دے کہ بڑے اچھے نیک بخت آدمی تھے کہنے ہی کافر ہو جائے گا۔ یہ ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ بلکہ رسول اللہ خاتم النبیین جیسے القاب سے پکارنا چاہیئے۔ نبی کے علاوہ ہر مومن کیلئے اچھے اور نیک بخت کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں حضور صلعم کے جنازہ کی نماز اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ نماز میں جو دعا مانگی جاتی ہے اس میں گناہوں سے مغفرت کی دعا بھی مانگی جاتی ہے اور نبی کی شان کے خلاف ہے کہ نبی معصوم ہے۔ دس دس آدمی جاتے تھے اور درود و سلام پڑھ کر واپس آجاتے تھے۔ شریعت تو یہ ہے کہ نماز جنازہ ہو مگر اس میں نبی کی توہین ہوتی تھی۔ تو نبی کی توہین کے مقابلے میں شریعت کو چھوڑنا پڑا۔ یہ اصول یاد رکھیں

کہ ہمیشہ شریعت کے مقابلے میں شارع کو ترجیح دی جائیگی۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا۔ میں ڈر کے مارے ایسے لفظ نہیں بولتا۔ یہ لفظ جتنے اچھے ہیں اتنا ہی ان میں خطرہ بھی ہے اللہ محفوظ رکھے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بین یدی اللّٰہ ورسولہ اے ایمان والو رسول اللہ صلعم سے آگے مت چلو (حجرات۔۱) یہ شریعت ہے قرآن ہے مگر جب سامنے سے تیر کوئی نجاست آرہی ہو تو نبی کے آگے بڑھ کر اپنے سینے پر لینا فرض ہے۔ اس وقت اس آیت پر عمل نہیں ہوگا۔ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النّبیّ اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو (حجرات۔۲)۔ یہ شریعت ہے۔ حق ہے ٹھیک ہے۔ مگر دشمن نبی کی تلاش میں ہے کہ ان کو ایذا پہنچائے قتل کرے تو اس وقت فرض ہو جاتا ہے کہ اتنا شور مچاؤ کہ نبی کی آواز شور میں دب جائے اور دشمن ان کی آواز کو نہ پا سکے۔ بڑی نازک بات ہے۔ باریک مسئلہ ہے۔ اس سے وہ قضیہ بھی ہٹ گیا جو حضرت عباسؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق کہا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روک دیا انہوں نے وہ لکھ رہے تھے خلافت کو حضرت علیؓ کے لئے۔ حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا تھا کہ آپؐ کی حالت ٹھیک نہیں ہے آپؐ کو بہت تکلیف ہے اس وقت۔ زیادہ سے زیادہ وہ کچھ لکھواتے تو وہ شریعت ہی تو ہوتی۔ اور اس کے بغیر کتاب اللہ موجود ہے۔ کام رکتا نہیں۔ حسبنا کتاب اللہ ۔ ہم کو اللہ کی کتاب کافی ہے اگر کام رکتا تو چلو لکھوا بھی لیتے۔ نبی کو ہوتی تکلیف تو نبی کی تکلیف کے مقابلے میں شریعت کو چھوڑ دیا۔ آپؐ چپکے ہو گئے۔ اور اگر وہ شریعت ضروری ہوتی تو حضرت عمرؓ کے روکنے سے رک کیسے سکتے تھے۔ یَا اَیُّھَا الرسول بلغ ما انزل الیک بلے رسولؐ تبلیغ کر جو تجھ پر نازل ہوا۔ نہیں رک سکتے تھے (مائدہ۔۶۷)

وہ کوئی ضروری چیز نہیں تھی۔ اس لئے آپ چپ ہو گئے۔ خدا معلوم وہ کیا لکھوانے مگر
یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت لکھوانے تھے۔ یہ اسی اصول کے تحت ہے کہ شارع شریعت
سے مقدم ہے۔ اسی لئے نبی کی جان بچانے کیلئے جھوٹ بولنا فرض ہے اگر جھوٹ نہیں
بولے گا تو ابو جہل سے بھی زیادہ بڑا کافر ہے۔ سچ بول کر نبی کو پکڑوا دے ابو جہل سے
بھی بدتر ہے۔ اب ہم نے اس سے یہ قیاس کیا کہ نبی کی جان سے نبی کی عزت افضل ہے کیونکہ جان
فانی ہے عزت باقی ہے۔ اور اگر نبی کی جان کیلئے جھوٹ بول سکتا ہے تو اس کی عزت کے لئے بدرجۂ
اولیٰ جھوٹ بول سکتا ہے تو سبح سم ربک الاعلیٰ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے رب کے نام کی جو اعلیٰ ہے۔ اعلیٰ
کے معنی اونچا ہونا۔ یہ اونچا ہونا جہت کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ یا تو جہت لا انتہا جائیگی
وہ ممکن نہیں ہے تو کہیں جا کر ٹھہرے گی۔ جہاں ٹھہرے گی اس کے اوپر کی فضا اس سے
اوپر ہو گئی اور یہ نیچا تو اعلیٰ نہ رہا۔ یہ اعلیٰ بن اقتدار علو اور قدرت کا ہے۔ پھر ایک جہت
جو ہمارے لئے اونچی ہے وہ امریکہ والوں کے لئے نیچی ہے تو جسمانی علو نہیں ہے۔
اگر ایک جہت میں متناہی ہے اور ایک جہت میں لا انتہا جا رہا ہے تو لا انتہا
کی جہت متناہی کی جہت کا غیر ہو گی تو دونوں جہتیں غیر کی غیر ہو گئیں۔ اور جو ان دونوں کا
مرکب ہو تو خدا بننے کے لائق نہیں رہا کہ مرکب خدا نہیں ہو سکتا۔ تو ہمارے یہاں جو اعلیٰ کے
معنی رائج ہیں ان معنوں میں اعلیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی قدرت لا انتہا ہے۔ وہ ہر شئے
کو غلبہ کئے ہوئے ہے۔ یہ معنی ہیں ربی الاعلیٰ کے۔ وہ اس طرح اونچا نہیں ہے جس طرح
آسمان اونچا ہے کیونکہ جو ہمارے لئے اونچا ہے وہ امریکہ والوں کے لئے نیچا ہے۔ ایک
جہت سے اونچا ہوا تو دوسری جہت سے نیچا ہے کیونکہ عالم کروی ہے اس لئے جسمانی
علو نہیں ہے بلکہ اقتداری اور علمی علو ہے اس کی قدرت وسیع ہے۔

اب آپ اپنے رب اعلیٰ کی بڑائی بیان کیجئے۔

سبح اسم ربك الاعلیٰ اپنے رب اعلیٰ کے نام کی تسبیح کر۔ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو حضور نے سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھنے کا حکم دیا۔ پہلے یہ پڑھا کرتے تھے کہ یا اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا (اللھم انی اسجد الیک) اور جب یہ آیت نازل ہوئی فسبح باسم ربك العظیم تو رکوع میں سبحان ربی العظیم پڑھنے کا حکم دیا پہلے رکوع میں پڑھا جاتا تھا اے اللہ میں نے تیرے لئے رکوع کیا اللھم انی ارکع الیك۔

سبح اسم ربك الاعلیٰ اپنے رب اعلیٰ کے نام کی تسبیح کر۔ یا اپنے رب کے اعلیٰ نام کی تسبیح کر۔ اعلیٰ دونوں کی صفت بن سکتا ہے رب الاعلیٰ بھی ہے اور اسم الاعلیٰ بھی ہے۔ کیونکہ اعراب اس میں ظاہر نہیں ہیں۔ ی کا حرف لگا ہوا ہے اس پر حرکت نہیں آسکتی۔

اپنے رب کے نام کی تسبیح کر یعنی اپنے رب کا نام ایسے طریقہ سے ادا کر کہ جس میں ابتذال یا کمزوری یا غیر خشوع یہ چیزیں نہ ہوں۔ ادب سے نام لے کہ سن کر انسان لرز جائے۔ معمولی طریقہ پر نام نہ لیا جائے۔ اللہ کا نام جب لیا جائے گا دل وحشت زدہ ہوجائیگا۔ ڈر جائے گا۔ مگر یہ کب ہوگا؟ یہاں جو نام لیا جاتا ہے "یا اللہ" بالکل ڈر نہیں لگتا جیسی مثال سے سمجھ لیں کہ ڈر کیوں نہیں لگتا۔ اگر دو آدمی جنگل یا دامن کوہ میں جا رہے ہوں اور کوئی کھڑکا ہو۔ اور ایک ساتھی دوسرے کے کان میں چپکے سے کہے شیر۔ تو سنتے ہی لرز جائیگا۔ پاؤں کی جوتی ڈھیلی ہوجائے گی۔ حالانکہ ابھی شیر نظر نہیں آیا ممکن ہے شیر نہ ہو کوئی دوسرا جانور کتا ہرن وغیرہ ہو۔ مگر نام لیتے ہی دل دھڑکنے لگے گا پاؤں

بھاری ہو جائیں گے ۔ مجھے اس کا بہت تجربہ ہے ۔ اب یہاں بھی شیر کہہ کر دیکھیں کچھ بھی معلوم نہیں ہونے کا ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں تھا سناٹا اور یہاں ہے مجمع ۔ اگر یہاں بھی سناٹا ہوتا تو یہاں بھی یہی کیفیت ہوتی ۔ ڈر جاتا ۔ شیر کے کہنے کے اثر کو مجمع مانع ہوتا ہے ۔ تو یہاں خواہشات نفسانی شہوت اور غضب کا جو شور مچا ہوا ہے ۔ روٹی کپڑا فلانا ڈھمکہ ، یہ لاؤ وہ لا ۔ ظاہر عمل میں بھی ۔ اور خیال میں بھی ہر وقت اسی کا شور مچا ہوا ہے ۔ اب جو اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ شور اثر نہیں ہونے دیتا ۔ اگر اس شور سے ہٹ جائے ۔ ان خواہشات شہوت و غضب سے دوری اختیار کرے اور ان کو ہٹا دے تو جس طرح وہاں شیر سے ڈر جاتا ہے وہاں اللہ کا نام سن کر لرز جائے گا آگے یہی مضمون ہے کہ جو اس طرح خشوع و خضوع سے اپنے رب کا نام لے گا اس کا کیا انجام ہوگا ۔ رب اعلیٰ کی تسبیح کر ۔ یہ علو مکانی نہیں ہے ۔ اعلیٰ کے معنی دوری بلندی کے لئے جاتے ہیں کہ آسمان ہم سے اعلیٰ ہے تو کسی شئے کا دور ہونا اس کی تنا حمد عظمت کی دلیل نہیں ہے ۔ اگر اعلیٰ مکانی ہوگا تو کہیں جا کر ٹھہرے گا ۔ اور جہاں ٹھہرے گا اس کے جو اوپر کی فوقانی جہت ہے وہ اس کے اوپر ہوگی ۔ تو وہ اعلیٰ نہ رہا ۔ اور اگر لامحدود ہے تو اگر دونوں جانبوں میں لامتناہی ہے تو یہ محال ہے ۔ اگر ایک جانب سے محدود ہے اور ایک جانب سے لامحدود ہے تو محدود جانب لامحدود جانب کی غیر ہو گئی ۔ اور دونوں کا مجموعہ مرکب ہوا ۔ خدا مرکب نہیں ہو سکتا لہٰذا امادی علو مراد نہیں ہے بلکہ علو اختیاری ہے قدرتاً ہے ۔ احاطہ ہے ۔ احاطہ کس قسم کا ہے اس کی مثال نہیں ہے ۔ ایک طریقہ سے سمجھا سکتا ہوں ۔ اگر کوشش کریں گے تو سمجھ میں آ جائے گا ۔ طریقہ سے سمجھانے کے معنی ہیں مثل کے ۔ مثال ان کو کہتے ہیں جو تمام وجوہ سے مشترک ہو

اور مثل اسے کہتے ہیں جو بعض عوارض اور بعض خوارج میں مشابہ ہو۔ فلا تضربوا للّٰہ الامثال (نحل-۷۴) اللہ کیلئے مثالیں مت گھڑ دلیس کمثلہ شیٔ اس کی مثل کوئی شئے نہیں ہے (شوریٰ-۱۱) وللّٰہ المثل الاعلیٰ (نحل-۶۰) اس کیلئے مثل اعلیٰ ہے۔ مثل ہے اس کیلئے مثال نہیں ہے۔ اب وہ مثل اعلیٰ کیا ہے گھری ہوئی چیزیں ہیں۔ انکے تو گھرے رہنے میں کوئی شک نہیں ہے اور جو گھرے ہوئے ہیں وہ اس شئے پر مشتمل ہیں۔ مثلاً پورا اگرۂ عالم دائرہ پر مشتمل ہے پورے کرّے کو دائرہ دو حصوں میں تقسیم کر دے گا اور دائرہ قطر دائرے پر مشتمل ہے اور قطر دائرہ اپنی پوری گولائی سے ایک تہائی ہے۔ تو دائرہ اور قطر میں ۳ اور ایک کی نسبت قائم ہوئی۔ تو جن چیزوں میں نسبت قائم ہو سکے وہ محدود ہی ہونگی۔ خواہ کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہوں۔ مگر یہ احاطہ ایسا ہے کہ محیط اس احاطے سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں جتنے احاطے ہیں ان سے بچ سکتا ہے۔ جو چیز گھیرنے والی ہوگی اس سے وہ شئے جو گھری ہوئی ہے کسی نہ کسی طرح بچ ضرور جائیگی۔ جیسے جانوروں کو جمع کر کے چاروں طرف رسی سے گھیر لیں اگر ان کو شعور ہو جائے اور وہ ذرا سا سکڑ جائیں تو رسی نیچے گر پڑیگی۔ اور وہ احاطہ سے آزاد ہو جائیں۔ ان کو شعور گو نہیں ہے مگر موقع تو ہے لیکن عالم خدا سے نہیں بچ سکتا۔ تو معلوم ہوا اس جہاں میں جتنے احاطہ ہیں اللہ کے احاطہ کی کوئی مثل نہیں ہے۔ بلکہ ایسا احاطہ ہے کہ جس سے محاط بچ نہ سکے۔ اس کی صرف ایک ہی مثل ہے اس کو آپ یاد رکھیں۔ وہ تاثیر اور اثر ہے۔ یعنی تاثیر اثر کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے کہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جیسے پانی ہے اس کو بہائیے تو بہتا تو نظر آئے گا بہانا نظر نہیں آئے گا۔ اور وہ بہنا بہانے سے بچ نہیں سکتا۔ ناممکن اور محال ہے۔ بس اس قسم کا احاطہ ہے خالق اور مخلوق کا۔ تاثیر اور اثر یہ مثل ہے۔ اس کی مثال یہ بھی نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں ممکن ہیں مخلوق ہیں۔ اور وہ خالق ہے۔

وہاں صورت دوسری ہے۔ وہاں نسبت یہ نہیں ہے جو یہاں ہے۔ یہاں بھی دیکھ لیں موٹر ہے۔ اگر شعور ہو تو اس موٹر کے شعور میں اس کا بنانے والا انجینئر نہیں آ سکتا کہ وہ کیسا ہے۔ حالانکہ دونوں ممکن ہیں۔ حالانکہ اس کا امکان ہے کہ بنانے والا خود کسی وقت موٹر بن جائے یعنی ایسے انقلابات ہوں کہ وہ ہوتے ہوتے مٹی بن جائے پھر لوہا بن جائے اور پھر اس لوہے سے ایسی ہی ایک موٹر بن جائے یعنی ایسے انقلابات ہوں یہ انقلاب ہو سکتا ہے۔ مگر خالق میں یہ انقلاب نہیں ہو سکتا۔ تو ایسی کمزور حالت میں بھی موٹر کو اس کا علم نہیں ہو سکتا کہ اس کا بنانے والا کیسا ہے۔ اس کی ذات کیسی ہے۔ اس کی عقل میں نہیں آ سکتا۔ اگر اس میں عقل فرض کر لی جائے۔ جب موٹر کو اپنے خالق کا شعور نہیں تو انسان کو اپنے خالق کا شعور کیسے ہو سکتا ہے۔ موٹر کا بنانے والا اتنا قوی نہیں ہے جتنا انسان کا بنانے والا قوی ہے وہ اس کے خیال میں کیسے آ سکتا ہے پس یہی معنی تسبیح کے ہیں۔ یہ تسبیح یا ذات میں ہے یا صفات میں ہے۔ یا احکام میں ہے یا اسماء میں ہے۔ یا افعال میں ہے۔ یہ پانچ قسم کی تسبیح ہوتی ہے۔ جسکو اجمالی طور پر بیان کر دوں۔ زیر تفصیل بتائی جا چکی ہے تاکہ پھر اجتماع ہو جائے اور آگے کے مضمون سے ربط ہو جائے۔ اللہ کی ذات پاک ہے۔ یعنی اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ ہر ذات کی شان یہ ہے کہ وہ پہلے نہیں تھی پھر ہوئی مگر اس کی ذات ایسی نہیں ہے کہ پہلے نہیں تھی پھر ہوئی۔ اسکی صفت پاک ہے۔ اس کے معنی یہ ہے۔ یہاں جو صفت ہے وہ نشان ہے اس شے کی جس کی وہ صفت ہے۔ مثلاً سبزی متحقق ہو نہیں سکتی بغیر سبز کے۔ یہاں احتیاج ہے اس طرح اس کی صفت کسی شے کی محتاج نہیں ہے۔ وہاں یہ نسبت لاحق نہیں ہے کہ جس طرح طول طویل کو لاحق ہے۔ اس طرح اس کی صفت اس

کو لاحق ہے۔ ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کیسا ہے۔ اس کا کچھ جواب نہیں ہے۔ یہ عقل میں نہیں آسکتا۔ یہ بات عقل میں ضرور آتی ہے کہ وہ عقل میں نہیں آسکتا۔ جو بات عقل میں نہ آئے اسکے متعلق یہ چاہیئے کہ اس کا عقل میں نہ آنا آجائے۔ عقل میں کیسے آسکتا ہے۔ عقل میں گنجائش ہی نہیں۔ عقل اگر پہلے سے بھری ہے تو جو بات عقل میں آسکتی ہے وہ بھی نہیں آئیگی۔ جس طرح اگر کتابوں کی الماری بھری ہوئی ہے تو اور کتاب بھی اس میں نہیں آئیگی۔ چہ جائے کہ ایک بڑا عظیم الشان شہتیر اس میں کیسے آسکتا ہے یا جیسے دیگ کا سامان ہے اگر چائے کے چمچے سے نکالیں گے تو ہرگز کسی مہمان کو کھانا نہیں کھلا سکیں گے۔ اس کے لئے بڑا چمچہ لانا ہوگا۔ اگر بنانا ہے تو اتنا بڑا چمچہ بنانا چاہیئے کہ دیگ کا سامان اس سے نکالا جائے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ اس چمچے کو توڑ کر پھیلایا جائے۔ اور اتنا پھیلایا جائے کہ اس کا امتداد اتنا وسیع ہوجائے کہ دیگ کا سامان اس سے نکالا جاسکے۔ تو بس اس موجود عقل کو توڑ دینا چاہیئے تو یہ بڑی عقل بن جائے گی اس کو فنا کر دینا چاہیئے۔ اس کو توڑتے ہی بقا حاصل ہوجائیگی۔ اور وہ چیز سمجھ میں آجائیگی۔ یہ معنی اس کے صفات کے پاک ہونے کے ہیں۔ فعل کے پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جتنے افعال ہیں وہ مادہ اور مدت چاہتے ہیں۔ کسی نہ کسی زمانہ میں ہوں گے۔ کسی نہ کسی مکان میں ہوں گے۔ کسی نہ کسی اوزار کے بغیر نہیں ہوسکیں گے۔ اس طرح خدا کے فعل نہیں ہیں وہ بغیر زمانے کے ہوگا۔ بغیر مکان کے ہوگا۔ بغیر مادہ کے ہوگا۔ بغیر اوزار کے ہوگا۔ اب یہاں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام۔ آسمان اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ زمانے اور مدت کی ضرورت پڑی۔ چھ دنوں کا لفظ قرآن میں موجود ہے۔ یہ نص ہے یہ چھ دن دراصل اسکی تعمیر کے ظروف ہیں۔

ہر ہر ٹکڑا ہر ہر دن میں ہے۔ ⅙ عالم پہلے دن میں، دوسرا ⅙ دوسرے دن میں تیسرا ⅙ تیسرے دن میں اسی طرح کل عالم ۶/۶ پورا کا پورا تعمیر ہوا۔ اب اس چھ دن سے پتہ چلا کہ مدت لگی۔ نہیں بلکہ یہ چھ دن کا پورا کا پورا مجموعہ بیک آن ہے۔ وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ۔ چشم زدن سے بھی کم میں پورے کا پورا زمانہ ازل سے ابد تک بیک آن اس کے سامنے ہے۔ جو زمانے کے اندر چیزیں ہیں وہ زمانے سے اعتبار کی جائیں گی۔ خود زمانہ اور زمانے سے باہر کی چیز زمانے میں نہیں آئیگی۔ نہ زمانہ زمانے میں آئے گا نہ خالق زمانہ زمانے میں آئیگا۔ زمانیات سب زمانے میں آئیں گے۔ اس سے فلسفیات کا سارا جھگڑا حل ہو گیا۔ یہ میں نے ہی بتایا ہے مجھ سے پہلے کسی نے نہیں بتایا۔ پورے زمانے کو بیک آن ایجاد کیا۔ اور پورے عالم کو زمانے کے چھ ٹکڑا دن میں بنایا۔ ہر شے جو ایجاد ہو رہی ہے اور آگے پیچھے معلوم ہو رہی ہے یہ سب اندرون زمانہ ہے اور زمانہ زمانیات سب کا سب بیک آن اس کے سامنے ہے۔ آگے پیچھے کچھ فرق نہیں ہے۔ اور حال ہی حال ہے نہ ماضی ہے نہ مستقبل۔ حال اس کو کہتے ہیں جو دو زمانوں کے بیچ میں مشترک ہو۔ اگر حال قابل تقسیم ہوگا تو اس کا کچھ حصہ ماضی میں چلا جائے گا کچھ مستقبل میں۔ حال رہنے کا ہی نہیں۔ حالانکہ حال ایک مستقل چیز ہے۔ یہ سمجھانے کیلئے ہے۔ واقعہ نہیں ہے۔ عقل میں نہیں آسکتا حال کیا چیز ہے۔ حال کا جو مصداق ہے۔ اسی کا نام تو خدا ہے۔ وہ ہر جگہ حال ہے اس کیلئے کوئی جہت نہیں ہے جس طرح جہت کیلئے کوئی جہت نہیں ہے۔ ہمارے سامنے وہ درخت ہے۔ یہ سامنے کی جہت ہے۔ تو یہ جہت فی نفسہ کوئی چیز ہے یا نہیں اگر جہت کوئی شے نہیں ہے تو سب جہات بے کار ہو گئے۔ اور اگر شے ہے

تو جہت کیلئے کوئی شے نہیں ہے۔ یہ جہت کیا ہے۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ۔۱۱۵)
جس طرف منہ کرو اسی جہت میں اللہ ہے اگر جہت نہ ہو تو کسی چیز کا پتہ
ہی نہ چلے۔ کون کہاں ہے۔ اگر اللہ پاک نہ ہو تو کچھ پتہ ہی نہ چلے کہ میں کہاں ہوں، آپ
کہاں ہیں۔ نہ کہاں ہے نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے نہ جہاں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ وہی
جہت ہے، تمام چیزوں کی وہی جہت ہے۔ اس کے لئے کوئی جہت نہیں ہے
ہر کام کے لئے جہت ہوتی ہے۔ جہت کے لئے کوئی جہت نہیں ہے۔ یہ معنی ہیں اللہ
پاک کے افعال پاک ہونے کے۔ یہاں جتنے افعال ہو رہے ان پر آپ غور کریں تو
آپ دیکھیں گے کہ یہاں فاعل کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا فاعل ہے جیسے انسان یا
ایسا فاعل ہے جیسے غیر انسان۔ ذی شعور افعال اور بے شعور افعال۔ بے شعور افعال
کی مثال یہ ہے کہ گدھا اینٹیں لاد کر لایا اور ایک جگہ گرا دیں بے ترتیب اور ذی شعور
فعل کی مثال یہ مکان ہے کہ انہی اینٹوں کو ترتیب سے لگا کر مکان بنا لیا۔ تو اللہ پاک
کا فعل نہ ایسا ہے جیسے گدھے کا، نہ ایسا فعل ہے جیسے معمار اور انجینئر کا۔ اگر گدھے
جیسا فعل ہوگا تو مثلِ حیوان اور جمادات کے ہو جائے گا۔ اور اگر معمار اور انجینئر جیسا فعل
ہوگا تو مثل انسان کے ہو جائیگا۔ مگر وہ ان دونوں جیسا نہیں ہے۔ وہ دونوں کا خالق
ہے۔ اس لئے عقل میں نہیں آسکتا۔ اور یہی نہ سمجھنے پر تمام فلسفی اور غیر فلسفی گروہوں کو
بڑی مصیبتیں پیش آئی ہیں۔ فلسفیوں نے خدا کے افعال کو غیر اختیاری سمجھ کر مثل جانور
اور جمادات کے کر دیا۔ اور علماء متکلمین مسلمانوں نے قیاس کیا۔ انسانی قدرت پر تو انہوں نے
مثل انسان خدا کو کر دیا۔ اسی وجہ سے انہیں اتنی مصیبتیں پیش آئیں کہ آج تک
کوئی حل پیش نہیں کر سکے۔ اگر وہ اپنے رب کو ان دونوں صورتوں پر قیاس نہ کرتے

تو یہ دقتیں پیش نہ آتیں۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ اضطراری فعل کو دیکھتے ہی صاحب اضطرار قوت کا فوراً یقین ہوجائیگا۔ دھوپ کو دیکھتے ہی سورج کا یقین ہوجائیگا۔ تو اگر یہ اضطراری فعل ہوتا تو جس طرح اور اضطراری افعال کو دیکھ کر صاحب اضطرار کا یقین ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس عالم کو دیکھ کر صانع عالم یعنی خدا کا یقین ہوجاتا۔ لیکن نہیں ہوا اسی طرح جس طرح اختیاری فعل یعنی مکان کو دیکھتے ہی یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اس کو کسی صاحب اختیار نے بنایا ہے اسی طرح عالم کو دیکھتے ہی خدا کا یقین ہوجاتا مگر نہیں ہوا۔ جب یقین نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ دونوں قسم کا فعل نہیں ہے اس لئے اس کے افعال پاک ہیں۔

اس نے مکلف تو نہیں کیا مگر سوچنے اور غور کرنے کیلئے کہا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل ۳۶) جس علم کی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے اس کے پیچھے نہ پڑو۔ تم کو تو صرف ایک بات دیکھنی ہے کہ پیٹ میں درد ہوتا ہے یا نہیں۔ درد کو آدمی خوب جانتا ہے۔ اور سکھ کو بھی خوب جانتا ہے تو بس اس نے حکم دے دیا کہ سکھ کو حاصل کرو اور دکھ سے بچو۔ یہاں دکھ سے بچنے کے اسباب یہ ہیں اور وہاں دکھ سے بچنے کے اسباب یہ ہیں۔ اور عقل کو بالکل دخل مت دو۔ جتنا بھی ہوسکے دکھ سے بچنے کی کوشش کرو۔

اس دن جو دکھ سے بچ گیا "فقد رحمہ" وہی شخص ہے جس پر اللہ نے رحم کردیا۔ دکھ سے بچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ دقائق میں نہیں پڑنا چاہئے۔ کچھ حد تک مطلع ہوگا۔ پھر نامعلوم ہوگا۔ پانی کے اجزائے ترکیبی اگر معلوم ہوگئے تو ان اجزائے ترکیبی کے اجزا معلوم نہیں۔ اگر یہ معلوم ہوگئے تو ان اجزائے ترکیبی کے اجزاء کا آگے پتہ نہیں چلے گا۔ غرض یہ کہ جتنے دقیق جاننے کی کوشش کریں گے۔ اتنے ہی رہیں گے۔ کسی چیز کے کنہ عقل میں نہیں آئیگی۔ ہر مرکب بسیط پر جاکر ٹھہر جائیگا۔ اور بسیط کی حقیقت

کا کچھ پتہ نہیں۔ تم نے اور تمہارے باپوں نے یہ سب نام رکھ لیے ہیں۔ اللہ کی مرضی کے بغیر ان ھی اسماء سمیتموھا انتم واباؤکم ما انزل اللّٰہ بہا من سلطٰن (نجم ۲۳) کہیں اجازت مل بھی جائیگی۔ مگر حقیقت کا پتہ نہیں چلے گا۔ یعنی تعریف اسمی ہے حقیقی نہیں ہے۔ اور معلوم ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ اس نے کہا ہے کہ لا یحیطون بشیئ من علمہٖ (بقرہ ۲۵۵) وہ اس کے علم میں سے ذرہ برابر بھی نہیں جان سکتے۔ الا بما شاء ہاں جس قدر چاہے تو علم اس کی مشیت پر موقوف ہوگیا۔ یہ ہے نکتہ سمجھنے کا۔ اب اس کی مشیت کس طرح ظاہر ہوگی۔ انبیاء کے ذریعہ یا اجماع کے ذریعہ ظاہر ہوگی۔ یعنی قول ہو یا فعل، تو قول کا نام قرآن وحدیث ہے۔ اور فعل کا نام اجماع ہے۔ اگر سارا عالم مل جائے تو اس کی مشیت کا پتہ نہیں چل جاتا ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو سب کے متفق ہونے پر موقوف نہیں ہیں۔ ان کو بتانا پڑے گا وہ قول سے معلوم ہوگا۔ اس قول کا نام قرآن وحدیث ہے اب اگر اس قول کے ساتھ معجزہ متعلق ہے تو وہ قرآن ہے اگر معجزہ متعلق نہیں ہے تو یہ حدیث رسول اللہ صلعم ہے۔ یہ قید رسول اللہ کی میں نے لگادی ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں کچھ اور لوگوں کے قول بھی ہیں کہ نبی جو کچھ کہتا ہے اپنے دل سے نہیں کہتا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى سوائے اس بات کے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔ (نجم ۳-۴) تو حدیث بھی وحی ہے۔ صرف یہ کہ اس کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے۔ اور لوگوں کی کہی باتیں بھی اس میں آتی ہیں یعنی وہ حدیثیں جو منقطع ہوتی ہیں۔ کسی صحابی یا تابعی پر وہ وحی نہیں ہوتی۔ تو اس کے افعال پاک ہیں اسی طرح اس کے احکام پاک ہیں۔ احکام پاک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں جو حکم ہوگا وہ حسن و قبح کے تابع ہوگا۔ اچھی چیز کا حکم دیا جائے گا اور بری یا قبیح چیز سے روکا جائے گا۔ یہاں جو فیصلہ کریں گے وہ حسن و قبح کے

تحت ہوگا۔ یہ کیوں کیا؟ کیونکہ اچھا تھا۔ یہ کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ یہ برا تھا اسلئے چھوڑ دیا نہیں کیا پھانسی کیوں لگادی؟ قتل کیوں کردیا کیونکہ یہ اچھا ہے تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔ ولکم فی القصاص حیٰوۃ قصاص میں تمہارے لئے حیات ہے۔ حالانکہ قصاص میں حیات (بقرہ ۵-۱۷۹) نہیں ممات ہے۔ مگر اس ایک کی ممات ہے۔ باقیوں کیلئے حیات ہے۔ اکثر کی حیات فرد کی حیات کے مقابلے میں معتبر ہے۔ اگر کم کو نقصان اور اکثریت کو فائدہ ہو تو اکثریت کے پیش نظر اس کام کو کیا جائے گا۔ ایک آدمی کے نقصان کے پیش نظر اس کو ترک نہیں کیا جائے گا۔ کنواں ہے اس میں کوئی نہ کوئی ضرور ڈوب جائے گا۔ اگر اس خیال سے کنواں نہ کھودا جائے تو سب پیاسے مرجائیں گے۔ دوچار ہوائی جہاز میں گر پڑتے ہیں۔ دوخانی جہاز میں ڈوب مرتے ہیں مگر ہوائی جہاز یا پانی کے جہازوں کو ان کی موت کے پیش نظر روکا جائیگا تو اکثریت کا فائدہ منقطع ہوجائے گا۔ تو اللہ کا حکم ایسا نہیں ہے وہ حسن وقبح پر مرتب نہیں ہے۔ اور یہی وہ مسئلہ جس پر تمام انبیاء علیہ السلام اور تمام رحمانی علوم کا شیطانی علوم سے مقابلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک کے احکام پاک ہیں شیاطین یہ کہتے ہیں کہ نہیں اللہ پاک کے احکام پاک نہیں ہیں۔ ان کے یہاں پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عقل کے مطابق ہو۔ یعنی عقل اس میں حسن دیکھے۔ منفعت مصلحت دیکھے تو کرے اور اگر عقل اس میں نقصان دیکھے تو نہ کرے تو یہ بات ظاہر میں ایسی ہے کہ عام آدمی اس میں پھنس جاتا ہے کہ اس فعل کو کرنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بنیاد شیطان اور رحمان کے اختلاف کی صرف یہی ہے کہ شیطان یہ کہتا ہے کہ حکم حسن وقبح کے تابع ہونا چاہیئے۔ اور رحمان کہتا ہے کہ حسن وقبح کو حکم کے تابع ہونا چاہیئے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ کن حکم ہے (یٰسین ۸۲)

بیکون کائنات ہے۔ تو تمام چیزیں کن کے تابع ہوئیں۔ اور چیزوں کی اچھائیاں اور برائیاں ان چیزوں کی تابع ہیں۔ تو یہ بدرجہ اولیٰ کن کے تابع ہو گئے یعنی محاسن اور قبائح جو چیزیں وہ حسین اور قبیح کی صفت ہیں، اور حسین اور قبیح تابع ہیں کن کے تو محاسن وقبائح کن کے تابع ہو گئے۔ یہ ہے شرعی دلیل۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ ہر شئے کسی نہ کسی وجہ سے ہوگی۔ یہ شئے اس وجہ سے اور یہ وجہ اس وجہ سے۔ اور یہ وجہ اس وجہ سے۔ یہ وجہوں کا سلسلہ لاانتہا جائے گا اور یہ محال ہے۔ نہیں جا سکتا۔ لہٰذا کہیں نہ کہیں ٹھہرے گا۔ مثلاً مادی دنیا کی جتنی اشیاء مرکب ہیں عناصر پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ عناصر کسی اور اجزاء پر ختم ہو جائیں گے۔ اور وہ اجزاء اور اجزاء پر ختم ہوں گے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ کسی ایک جز پر جا کر ختم ہو جائے گا۔ وہ جز کاہے سے بنا اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مادہ تو ختم ہو گیا۔ اب وہ کسی ایسی چیز سے بنا جو مادہ نہیں ہے اب وہ شئے جو مادہ نہیں ہے وہ کیا ہے وہ امر کن ہے۔ وہ واحد جز جس سے پوری کائنات بنی وہ امر کن ہے۔ حکم الٰہی ہے۔ ایک مرتبہ دلی میں مناظرہ ہوا کہ انڈا مرغی سے اور مرغی انڈے سے پیدا ہوتی چلی آ رہی ہے یہ مشاہدہ سے ثابت ہے۔ خدا کی قدرت سے پیدا ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو ان سے سوال کیا گیا کہ تم نے جو مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے تو یہ بتاؤ تم نے ازل تک کا مشاہدہ کر لیا یا نہیں کیا۔ اگر نہیں کیا تو تمہارا دعویٰ ہی غلط ہو گیا۔ اور اگر تم یہ کہو کہ کیا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ کفر کے ساتھ تم احمق اور پاگل بھی ہو۔ تو یہ سب دہریوں کے دھوکے ہیں۔ اس کے احکام پاک ہونے کے یہ معنی ہیں جو بیان ہوئے کہ اس کا حکم کسی شئے کے تابع نہیں ہے۔ وہ مصلحت، منفعت، اثبات مضرت ہر شئے سے پاک ہے۔

اب اس کے اسماء پاک ہیں۔ اسم کے پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کوئی نام کیسے سے کیسا ذی حسن ہو اس کے لئے نہیں رکھا جا سکتا۔ اسم اس مسمیٰ کے لئے رکھا جائے گا جو مسمیٰ متصور ہو اور انسان کے خیال میں خدا کی ذات کا تصور نہیں آسکتا۔ اس لئے انسان اس کا نام نہیں رکھ سکتا۔ نام اس وقت رکھا جا سکتا ہے جب مسمیٰ شعور میں ہو اور جو شئے شعور سے باہر ہے اس کا نام نہیں رکھا جا سکتا۔ تو مخلوق میں سے کسی کو حق نہیں ہے۔ خالق کا نام رکھنے کا۔ اور اور اس نام سے وہ نہیں پکارا جائے گا۔ اب رہے کمالات کہ کمالات کی بنا پر اس کے نام ہونے چاہئیں۔ اللہ کے لئے اچھے اچھے نام ہیں لہ الاسماء الحسنیٰ (حشر ۲۴) مگر وہ اچھائی انسانی عقل کے مطابق نہ ہو۔ انسانی عقل کے مطابق اگر اچھائی ہو گی۔ اور اس اچھائی کی بنا پر اللہ کا اچھا نام رکھ دے گا تو وہ غلط ہو گا۔ جیسے ذہانت ہے وہ بہت اچھی چیز ہے۔ مگر اللہ کو ذہین نہیں کہیں گے عقل بہت اچھی چیز ہے عقل سے مشتق کر کے عقیل اور عاقل خدا کا نام رکھ دیں۔ تو یہ غلط ہے۔ بلکہ علم بڑی اچھی چیز ہے اس سے مشتق کر کے استدلالاً نام عالم اور علیم تو یہ بھی غلط ہے حالانکہ اس نے اپنا نام علیم رکھا ہے۔ بہت باریک فرق ہے۔ ایک آپ کسی شخص کا نام رکھ دیں علیم یہ اور چیز ہے۔ اور ایک علیم کے یہ معنی کہ ایسی ذات جو متصف ہو علم سے۔ اس استدلال نام رکھیں تو وہ صفت مشتقہ بن جائیگی۔ اسم علم نہیں بنے گا۔ اگر آپ کسی کا نام احمد رکھیں تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ وہ حمد سے مشتق ہے۔ کافر کا نام احمد رکھ سکتے ہیں۔ زنگی کا نام کافور رکھ دیتے ہیں۔ وہ اسم علم ہے۔ یا اللہ اور یا علیم کہتے ہیں کوئی فرق نہیں ہے یا رحمٰن کہہ دیا رحیم کہتے ہیں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ تو اس کا اسم علم ہے۔ اگر رحمت سے استدلال کر کے رحیم تو وہ غلط ہے۔ اس کا نام رحیم اسم علم ہے مشتق نہیں ہے وہ اگر

اشتقاق کرکے اپنا نام رکھے وہ کرسکتا ہے۔ اس کو اختیار ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا رحمت کے معنی نفع پہنچانے کے ہیں اور یہاں نفع نقصان دونوں پہنچ رہے ہیں۔ یا تو دو خالق ہوجائیں کہ جیسے کہ آتش پرست کہتے ہیں یا رحمت کے مشہور معنی نفع پہنچانے کے وہ غلط ہوجائیں گے۔ اگر دو ہوں گے تو نفع پہنچانے والا نقصان پہنچانے پر غالب ہے یا نہیں۔ اگر غالب ہے تو دوسرا عاجز ہوکر خدا پن سے خارج ہوگیا۔ اگر روک سکتا ہے اور پھر نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ وہ نقصان پہنچانے پر راضی ہے۔ پھر وہ ظالم ہوگیا۔ تو ظالم خدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے دو خدا نہیں ہوسکتے۔ اگر ہوں گے تو یا عاجز ہوں گے یا ظالم ہوں گے۔ اور خدا نہ عاجز ہے نہ ظالم تو خدا دو نہیں ہے۔ جب دو نہیں ہے تو لابد ایک ہے واحد ہے۔

تو اس معنی میں کہا کہ سبح اسم ربک الاعلیٰ تو اب آپ کے سمجھ میں پاکی پانچوں قسم کی آگئیں۔ ذات صفات افعال احکام اور اسماء کی اور اعلیٰ کے معنی بھی آپ کے سمجھ میں آگئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نام کی تسبیح جب ہو جب مسمیٰ ثابت ہوجائے۔ وہ کون شے ہے اس کا علم و شعور ہو۔ اور جو شئے شعور اور علم میں نہ ہو وہ ثابت ہی نہیں کس شئے کی تعریف کرے۔ کس کی تسبیح و حمد کرے بڑا مربوط کلام ہے۔ اسکی دلیل بیان کرتا ہے الذی خلق فسوی تسبیح کے قابل وہ ذات ہے۔ جس کا کام پیدا کرنا ہے۔ ایجاد کرنا ہے اور یہ طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ اس پر آپ غور کریں یہ بڑا عجیب و غریب طریقہ ہے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے ابراہیم علیہ السلام سے جب نمرود نے پوچھا تو کہا ربی الذی یحی ویمیت میرا رب (بقرہ ۲۵۸) وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ اور کائنات میں سے کسی کی خصلت میں احیاء اور اماتی

نہیں ہے تو پوری کائنات میں سے کوئی رب نہیں ہو سکتا۔ اور تو بھی کائنات میں سے ہے تو تو بھی رب نہیں ہو سکتا۔ اب اس تقریر کو سمجھیں کہ تخلیق اور احیاء کیونکر دلیل ہے۔ دو طریقے بیان کئے تخلیق اور تسویہ اور بھی دلیلیں بیان کرتا ہے۔ آج اس دلیل کو سمجھ لیں۔ جب آدمی مرتا ہے تو ہر شے اس کے سامنے ہوتی ہے۔ ماں باپ بیٹی بیٹا بہن بھائی، صراحی کٹورا، شیشیاں۔ دوا، ڈاکٹر، حکیم، تیماردار، سورج، زمین، ہوا، آسمان سب موجود ہوتی ہیں پھر مرجاتا ہے۔ بڑی حسی دلیل ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے ان سب کی موجودگی میں مرگیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کی حیات میں ان میں سے کسی شے کو دخل نہیں تھا اگر دخل ہوتا تو کبھی نہ مرتا۔ بہت سہل دلیل ہے۔ تمام دلیلیں قرآن شریف میں بہت سہل ہیں۔ اتنی سہل کہ سہولت کی شدت کی بناء پر دہ صعب ہو گئی ہیں۔ اگر بارہ بجے سورج کو دیکھیں تو زیادہ نظر آنا چاہئے مگر نہیں آتا۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ شدت ظہور باعث حجاب ہوتا ہے۔ تو تمام اشیاء کائنات جوں کی توں تھیں مگر مرگیا تو معلوم ہوا اس کائنات میں سے کسی کو دخل اس کی حیات میں نہ تھا مگر حیات تھی ضرور تو اس میں کسی کو دخل ضرور تھا۔ اب جس کو دخل تھا وہی رب ہے۔ اذا بلغت الحلقوم وانتم حینئذ تنظرون (الواقعہ-۸۳-۸۴) جب جان حلقوم میں آجائیگی تو تم تکتے کے تکتے رہ جاؤ گے۔ اور کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔ ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون اور ہم اس مردے کے تم سے زیادہ قریب ہوں گے۔ لیکن تم نہیں دیکھ سکو گے۔ (الواقعہ-۸۵) فلولا ان کنتم غیر مدینین کیوں کیا کہتے ہو۔ اگر تم کسی کے بس میں نہیں ہو اور ... تمہارا کوئی رب نہیں ہے تو ... ان کنتم صدقین اگر تم سچے ہو تو روح کو ... سانس کو اندر کیوں نہیں لوٹا لیتے ... لوٹا سکتے۔ تو تم بے بس ہو کسی اور کے بس میں ہو۔ اور جس کے بس میں ہو وہ ...

تو قرآن کے بڑے اچھے دلائل ہیں۔

الذی خلق فسوی بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ بعض اضطراری تاثیریں وجود تو ضرور پیدا کر دیتی ہیں مگر ان میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی رصلاحیت نہیں ہوتی۔ کہ جو چیز بنی ہے اس کو اس قابل کر دیں کہ وہ ہر ہر فعل کا ہر ہر جز اس قابل ہو جائے کہ وہ ہر فعل کر سکے۔ تسویہ مشکل لفظ ہے اس کے معنی سمجھ لیں۔ آپ نے مجسمہ بنا لیا۔ کان آنکھ ناک بن ضرور جاتے ہیں لیکن ان میں تسویہ نہیں ہوتا۔ یعنی وہ ہاتھ اٹھا کر کام نہیں کر سکتا آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا۔ زبان سے بول نہیں سکتا۔ تو ہر ہر چیز کو ایسی صلاحیت دے دی کہ اپنے کاموں میں لگ جائیں۔ اور مقصد حاصل کریں۔ یہ معنی فسوی کے ہیں۔

والذی قدر فھدی اور وہ وہ ذات ہے جس نے تقدیر کی۔ اندازہ کیا مخصوص مقداریں عنایت کیں۔ پھر ان کو ہدایت کر دی کے معنی ایصال الی المطلوب مطلوب کا راستہ دکھا دینا یا وہاں تک پہنچا دینا جو غیر مختار قوتیں تھیں ان میں تاثیر کرنے کی قابلیتیں پیدا کر دیں تاکہ وہ برابر تاثیریں کرتے رہیں۔ اور جو مختار قوتیں تھیں ان کے اختیارات اور اچھے اور برے نتائج دکھائے کہ یہ اچھے ہیں یہ برے ہیں۔

تسبیح کر اپنے رب اعلیٰ کے نام کی جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھاک کیا اور مقداریں دیں۔ پھر ہدایت بھی کردی۔ ایسا رب جس نے چارہ اگایا زمین سے پھر اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ کردیا۔ یہ سب دلیلیں ہیں خدا کے وجود کی۔

چارہ کو اگانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی چارہ کو اگانے والا ہے انسان کی خوراک غلہ ہے اس کے اگانے میں تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کسان اس کو اگاتا ہے۔ مگر جانوروں کی خوراک تو نہ انسان اگاتا ہے نہ جانور تو پھر کون اگاتا ہے۔ جو اگاتا ہے وہی رب ہے اسی کے نام کی تسبیح کر۔ اگر اس کو زمین اگائے تو پوری زمین پر اگے کوئی زمین خالی نہ رہے۔ اور ساری زمین پر چارہ ہی چارہ ہو۔ برابر اگا ہی رہے چارہ اگر گھاس خود بخود اگے اور ہر جگہ پایا جائے گا۔ مگر کہیں اگتا ہے کہیں نہیں اگتا تو معلوم ہوا کہ نہ یہ گھاس کا خاصہ ہے کہ اگے۔ نہ یہ زمین کا خاصہ ہے کہ اگائے بلکہ اس کو اگانے والا کوئی اور ہے۔ اگر انسان غلہ اگاتا تو جب اگاتا اگ جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی اگتا ہے۔ اور کبھی نہیں بھی اگتا۔ کبھی فصل ضائع بھی ہو جاتی ہے۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (واقعہ ۶۴)
یہ جو تم کھیتی کرتے ہو کیا تم جانتے ہو یا نہیں جانتے کہ یہ بیج جو تم ڈالتے ہو اس کھیتی کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ اگر تم اگاتے ہو تو جب چاہو اگاؤ جب چاہو اگاؤ۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تم اگاتے ہو اور نہیں اگتی جب تم نہیں اگاتے تو کوئی اور اگاتا ہے۔ یہی حال چارہ کا ہے۔ اس کو بھی کوئی اور اگاتا ہے۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے آگے فرمایا فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى پہلے اس کو (اعلیٰ ۵)

ہرا بھرا کیا۔ پھر خشک کیا۔ سیاہ ہوا اور کوڑا کرکٹ ہو گیا۔ اگر رنگ جو پتہ کا ہے
اس کی طبیعت کا خاصہ ہوتا تو ایک رنگ پر رہتا ۔ مگر نہیں رہتا۔ کبھی ہرا بھرا
ہوتا ہے۔ پھر سیاہ ہو جاتا ہے۔ پھر خشک ہو جاتا ہے۔ یہ تغیر بتاتا ہے۔ کہ
رنگ پتے کی طبیعت کا خاصہ نہیں ہے۔ اگر طبیعت کا خاصہ ہوتا تو ہمیشہ ایک ہی رنگ
پر رہتا۔ طبیعت اس قوت کو کہتے ہیں جو غیر ذی شعور ہو اور ایک ہی قسم کا فعل اس
سے صادر ہو۔ اور جو قوت غیر ذی شعور ہو اور اس سے مختلف قسم کے افعال
صادر ہوں۔ اس کو قوت نامیہ کہتے ہیں اور جو قوت ذی شعور ہو اور اس سے
ایک ہی قسم کے فعل صادر ہوں۔ اس کو قوت فلکیہ کہتے ہیں۔ مثلاً دل کی حرکت۔
اور جو قوت ذی شعور ہو اور اس سے مختلف قسم کے افعال صادر ہوں اس
کو قوت حیوانی کہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں گھاس چارہ وغیرہ بے شعور ہیں۔ ان سے
ایک ہی قسم کے فعل صادر ہو رہے ہیں۔ تو یہ تغیرات ان کی طبیعت کے تقاضے نہیں
ہیں۔ لہٰذا ان تغیرات کا کرنے والا کوئی اور ہے جو ان سے باہر ہے۔ وہی تمہارا
رب ہے۔ رب اعلیٰ کے وجود کی اتنی دلیلیں بیان کیں ایک تو یہ کہ پیدا کیا میں بیان
کر چکا ہوں کہ پیدا کرنا اور مارنا اسی کا فعل ہے۔ جب آدمی مر جاتا ہے تو تمام
چیزیں سورج چاند ہوا زمین آسمان وغیرہ سب جوں کی توں موجود رہتی ہیں
جس سے یہ پتہ چلا کہ اس کی حیات میں ان میں سے کسی شے کو دخل نہیں۔ بلکہ
کوئی اور طاقت ان سے علاوہ ہے۔ جس کو اس میں دخل ہے۔ حیات وممات
دونوں فعل اسی کے ہیں۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى جب حکم ہوا کہ تسبیح کر اپنے
رب کی تو معلوم ہوا کہ سب سے بڑھیا تسبیح قرأت قرآن ہے۔ جبریل علیہ السلام قرآن شریف

پڑھا کرتے تھے۔ تو قبل اس کے کہ وہ ختم کریں آپؐ دوہرانا شروع کر دیتے تھے اور جلدی جلدی پڑھتے تھے تو فرمایا کہ یہ تسبیح کے خلاف ہے۔ ہم آپ کو قرارت سکھا دیں گے اور یاد کرا دیں گے۔ یہاں تک کہ فَلَا تَنْسٰی آپ بھولیں گے نہیں لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت نہ دو اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامت۔ ۱۷)
ہمارے ذمہ ہے تمہارے دل میں قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا۔ اس کا طریقہ ہے کہ یا تو جبریل بار بار پڑھیں گے یا آپؐ کے دل میں اتنی قوت دیدیں گے کہ ایک ہی دفعہ سن کر آپؐ اس کو جمع کر لیں گے۔ اور یہ معجزہ ہے۔ کہ اتنی بڑی کتاب ایک مرتبہ سن کر آپؐ کو یاد ہو گئی۔ اور اللہ پاک نے یہ خبر دی کہ آپؐ ایک مرتبہ سن کر یاد کر لیں گے اور قرارت سکھا دیں گے اور نہیں بھولیں گے۔ اور یہ واقعہ بھی ہوا، کہ آپؐ کو یاد بھی ہو گیا۔ اور بھولے بھی نہیں۔ یہ اخبار بالغیب ہے۔ اس لئے یہ معجزہ ہے فَلَا تَنْسٰی اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ آپؐ کسی وقت بھی نہیں بھولیں گے۔ مگر اس وقت جب اللہ چاہے۔ یعنی آپ کا بھولنا مشیت الٰہی کے ماتحت تھا اور حکم الٰہی کے تحت تھا۔ آپؐ کی غلطی نہ تھی تو اب وہ آیات بھی صاف ہو گئیں جو انبیا کی بھول پر دلالت کرتی ہیں۔ جب مشیت الٰہی ان کی بھول کے ساتھ متعلق ہوئی تو وہ بھول گئے اور خدا تعالیٰ کو حق ہے۔ جب چاہے بھلائے۔ جیسے حضور نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا یا اور کوئی صورت ہو۔ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی
ظاہر میں جو بار بار آپؐ پڑھتے ہیں اسے بھی جانتا ہے اور دل میں جو بھولنے کا خوف ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اور ہمارے ذمہ ہے قرآن کا پڑھانا۔ اور یاد کرانا تو آپؐ اس کا بالکل خیال نہ کریں وَنُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰی ہم آپ

کے لئے آسان کردیں گے اس طریقہ کو جو آسان ہے۔ کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ طریقہ آسان کردیں گے اور کہا یہ کہ تجھ پر آسان کردیں گے۔ قدرت وہ ہے جس میں کرنے اور نہ کرنے دونوں کی طرف نسبت برابر ہو اور جب تک قدرت رہے گی فعل نہیں ہوگا۔ اور جب نسبت ایک طرف ہو تو اس کو جبر کہتے ہیں۔ بے قراری کہتے ہیں۔ اضطرار کہتے ہیں۔ قادر ہونے کو فاعل ہونا لازم نہیں ہے۔ قدرت ہر وقت ہوگی۔ اور فعل ہر وقت نہیں ہوگا۔ تو اب قدرت سے باہر کوئی اور چیز آئے گی۔ کوئی داعی ہوگا۔ کوئی سبب ہوگا۔ کوئی علت ہوگی۔ کوئی موجب ہوگا کوئی باعث ہوگا۔ کوئی وجہ ہوگی۔ جب وہ وجہ سامنے آئے گی تو فعل یا ترک فعل کی طرف جھکا دے گی۔ وہ باعث انسانوں میں کیا ہوتا ہے (۱) پہلے اس فعل کے حسن کا تصور ہوتا ہے (۲) وہ ارادہ کو حرکت دیتا ہے (۳) ارادہ قدرت کو حرکت دیتا ہے (۴) قدرت اعضاء کو حرکت دیتی ہے (۵) تب وہ فعل صادر ہوجایا کرتا ہے۔ اور وہ حسن اور خوبی خارج میں متحقق ہوجاتی ہے۔ وہ باعث تصور میں سب سے مقدم ہوتا ہے۔ اور تحقق میں سب سے موخر ہوتا ہے۔ اسی کو غایت کہتے ہیں اور علت غائی کہتے ہیں۔ یہ جو رجحان ہوا فعل کی طرف اسی کا نام تیسیر ہے آسان کرنا۔ جو فعل کراتا ہے اس کا رجحان پیدا کرنا یہی آسان کرنا ہے تو یہ فاعل کے لئے ہوا فعل کے لئے نہیں ہوا۔ یعنی آسان فاعل ہی کو کیا۔ فعل کو نہیں۔ آسان کردیں گے۔ طریقہ یا وہ طریقہ عمل جس سے جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ یا جو بالکل آسان ہے یا وہ قوت جس سے آسانی سے فعل صادر ہوں سب یسرا کے معنی ہیں۔ یسرا کے معنی

جنت کے بھی ہیں۔ طریقہ حسنیٰ شریعت بیضا کے بھی ہیں۔ اور اس عمل کے بھی ہیں جو جنت تک لے جائے فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى جب ہم نے آسانی کردی تو اب تو سمجھائے جا۔ ذکر کرائے جا۔ یاد دلائے جا۔ سمجھائے جا اگر نصیحت فائدہ دے۔ یہ بہت مشکل جگہ ہے۔ سمجھائے جا اگر سمجھانا نفع دے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اگر نفع نہ دے تو نہ سمجھا۔ حالانکہ آپؐ مبعوث ہیں۔ تمام لوگوں کے لئے خواہ وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر یہاں شرط لگائی کہ اگر سمجھانا نفع نہ دے تو نہ سمجھا۔ یہاں علماء کو بہت دقت ہوئی ہے۔ سمجھا اگر سمجھانا نفع دے۔ وہ کہتے ہیں شرط کی نفی سے مشروط کی نفی نہیں ہوتی۔ سمجھانا اگر نفع دے تو سمجھا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر سمجھانا نفع نہ دے تو نہ سمجھا تو اگر یہ ضابطہ صحیح ہو تو معنی ٹھیک ہو گئے۔ بات ختم ہو گئی۔ جلیل القدر علمائے مفسرین اور حکماء نے یہ فرمایا۔ اور اس نظریئے کی تائید میں متعدد آیتیں۔ قرآن شریف کی پیش کی ہیں۔ جو یاد آتی جائیں گی آپ کے سامنے پیش کرتا جاؤں گا۔

وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ۔۱۷۲) شکر کرو اللہ کا اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر عبادت نہیں کرتے تو اس کا شکر بھی ادا نہ کرو۔ حالانکہ شکر ہر وقت واجب ہے فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اِنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (نساء ۱۰۱) کچھ حرج نہیں ہے اگر تم نماز میں قصر کرلو اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (نساء ۱۰۱) اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار سے تمہیں کوئی فتنہ پہنچے۔ اگر فتنے کا خوف ہو تو نماز میں قصر کرلو حالانکہ فتنہ کا خوف نہ ہو تب بھی نماز میں قصر جائز ہے۔ تو شرط کی نفی سے

مشروط کی نفی نہیں ہوئی وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا (النور ۳۳)
اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ لونڈیاں گھریلو اور اچھی زندگی بسر
کرنا چاہتی ہیں۔ تو اگر بدکاری کی زندگی بسر کریں تو ان کو مجبور کرو۔ حالانکہ یہ غلط ہے
اس صورت میں بھی اجازت نہیں ہے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ شرط کی نفی سے
مشروط کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہاں بھی یہ معنی نہیں نکلتے کہ اگر نصیحت فائدہ نہ
دے تو نہ سمجھا۔ نہیں تب بھی سمجھاؤ۔ یہ علما نے جواب دیا۔ مگر یہ غلط ہے۔ اصول
بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر شرط کی نفی سے مشروط کی نفی نہیں ہوئی تو مشروط کا
وجود متحقق ہوتا رہے گا۔ اور شرط کی تعلیق بے سود ہو جائے گی۔ اس کی وضع بیکار
ہو جائے گی۔ شرط لگانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یعنی بغیر شرط جب ایک
شے متحقق ہے۔ تو شرط لگا کر اس کو متحقق کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے حسی
مثال سے سمجھیں۔ ترکاری گھیا چھینکے پر لٹکا ہوا ہے معلق ہے۔ اگر وہ معلق نہ ہو
تب بھی وہ گھیا ہی رہے گا۔ یہ ان کے بیان کی توجیہ میں میں نے مثال گھڑ دی۔ تو
نصیحت کے چھینکے میں نصیحت لٹکی ہوئی ہے۔ اگر نصیحت کے چھینکے سے اس کو
اتار لیا جائے تب بھی نصیحت، نصیحت ہی رہے گی۔ میرا اعتراض اگر شرط کے
بغیر مشروط متحقق ہوگا تو شرط کی وضع بے کار ہو جائے گی۔ شرط کا کوئی فائدہ
نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ شرط کے بغیر مشروط متحقق ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ
اس میں شرط کی وجہ باطل ہو جاتی ہے۔ اب رہیں وہ آیات جن کو استدلال
میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ استدلال بھی غلط ہے کیونکہ شرط کی نفی سے مشروط کی
وہاں بھی نفی ہو گئی ہے۔ عبادت کی نفی سے شکر کی نفی ہوتی ہے۔ مگر وہ کہتے

ہیں کہ نفی نہیں ہوتی۔ شکر ہر وقت واجب ہے۔ وہ جو شکر واجب ہے وہ کسی اور تقدیر کے اعتبار سے واجب ہے۔ وہ شکر جو عبادت کی تقدیر پر مرتب تھا اس کی قطعی نفی ہوگئی۔ وہ شکر نعمت اور احسان کی بنا پر واجب ہوا اور یہاں جو شکر واجب ہوا ہے وہ عبادت کی شرط پر واجب ہوا ہے۔ اس کی قطعی نفی ہوگئی۔ اسی طرح قصر صلوٰۃ خوف کی نفی پر بھی ہے وہ غلط ہے۔ وہاں اور عالم ہے۔ وہاں اور سبب ہے۔ وہاں اور تعلیق ہے۔ وہ سفر ہے۔ اگر تم سفر میں ہو تو قصر کر لو۔ وہ جو قصر متحقق ہوا ہے وہ دیگر تعلیقات پر ہے وہ مشروط جس شرط کے ساتھ ہے اس کی قطعی نفی ہوگئی۔ مثلاً چھینکے کی نفی سے گھیے کی نفی ہوگئی اب جو گھیا ہے وہ رکھا ہوا گھیا ہے۔ لٹکا ہوا گھیا نہیں ہے اس کی نفی ہوگئی۔ تو شرط کی نفی سے مشروط کی نفی ہو جاتی ہے۔ اگر نصیحت فائدہ نہ دے تو نہ سمجھا۔ ایک جماعت مفسرین کی یہی کہتی ہے۔ کئی بار سمجھایا ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے تو اب ان کو نہ سمجھا۔ ان کو سمجھانا بے سود ہے۔ تو بس جو سمجھ سکتے ہیں ان ہی کے لئے ہو سکتا ہے۔ عام نہیں ہے۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (ق۔ ۴۵) ان لوگوں کو سمجھا جو میری دھمکی سے ڈرتے ہیں۔ جن کو میں نے عذاب کی وعید دی ہے اور ان کو ڈر پیدا ہوا ان کو سمجھا۔ بڑے بڑے جید عالم بیٹھے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میرے خیال میں جو بات آئی ہے۔ وہ کہہ دوں تو ساری دقتیں ختم ہو جائیں گی۔ کوئی حقیقی بات تو ہے نہیں ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ذرا اس لئے مجھے خوف ہے۔ اگر اس میں کوئی سقم ہو تو مجھے اور آپ کو اللہ دونوں کو معاف کرے۔ وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (ذاریات۔ ۵۵)

سمجھائے جا مومنوں کو سمجھانا فائدہ دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اِنْ شرطیہ نہ ہو بلکہ خیانیہ کے معنی میں ہو۔ اب کوئی دقت باقی نہیں رہی۔ فَذَکِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّکْرٰی سمجھائے جا اس کی شان یہ ہے کہ سمجھانا نفع دے گا۔ اور دلیل وہ آیت ہے کہ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ اب آپ اجازت دیں تو اس کو رکھوں ورنہ کاٹ دوں۔ دقت ہی باقی نہ رہی۔ جھگڑا ہی نہیں رہا۔ دوسرے طریقے سے یہ سمجھا دیں کہ یہ اس تقدیر پر نفع بخش ہے کہ سمجھانا نفع بخش ہے۔ اگر اس سے فائدہ ہو رہا ہے تو اس کو نہ چھوڑ لو۔ یعنی نصیحت کئے جا اور جہاں فائدہ دے رہی ہے۔ وہاں نہ چھوڑنا سمجھائے جانا۔ کوئی بھی دقت باقی نہ رہی۔ ویسے تو قصر کی اجازت جہاں ہے وہاں ہے ہی مگر دشمنوں کا خوف ہو تو ضرور قصر کر لینا یوں تو برائی پر مجبور کرنا برا ہے ہی جب وہ اچھی زندگی بسر کرنا چاہیں پھر ان کو مجبور کرنا یہ تو بہت ہی بری ہے۔ اِن شرطیہ نہیں ہے۔ مخفف ہے۔ اگر آپ اجازت دیدیں تو ٹھیک ہے ورنہ توبہ کر لوں۔

سَیَذَّکَّرُ مَنْ یَّخْشٰی عنقریب نصیحت اس کے لئے فائدہ بخش ہو گی جو ڈرے گا۔ یہ سب ضابطے ہیں۔ ہر ایک کو بیان کرنے کیلئے ایک ایک دن چاہئے۔ بہت تفصیل چاہتی ہے۔ نصیحت وہ قبول کرے گا۔ جس کے دل میں ڈر ہو گا۔ جو خدا کے کمال اور اس کے جلال سے ڈرے گا۔ وہ نصیحت قبول کرے گا یا جو اپنے گناہوں کے برے انجام سے ڈرے گا۔ نصیحت اس کے لئے نفع بخش ہو گی۔ شیر سے آدمی اس لئے نہیں ڈرتا کہ وہ اس کو کسی گناہ کی سزا دے گا

اس کی ہیبت کی وجہ سے ڈرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی ہیبت اور جلال سے جو لوگ پاک باطن اور صاف دل ہیں ڈرتے ہیں۔ اس کے کمال اور اس کے جلال کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے ہیں اور جو ان سے دوسرے درجہ کے ہیں وہ اپنی بداعمالیوں کے انجام کو سوچ کر ڈرتے ہیں یہ نفس لوامہ ہیں۔ یہ بھی قابل قدر لوگ ہیں۔ اور جن میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ ان کو نصیحت فائدہ نہیں دے گا وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى نصیحت کے بعد جو بچا رہے گا وہ اشقیٰ ہیں۔ شقی اور اشقیٰ دونوں اس میں شامل ہیں۔

الَّذِي يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرَى ایسے شقی بدبخت جو بڑی آگ میں داخل ہوگا بڑی آگ جہنم کی آگ ہے۔ چھوٹی آگ دنیا کی ہے۔ جہنم کا جو سب سے نیچا درجہ ہے وہ نار کبریٰ ہے۔ دونوں معنی ہیں جہنم کی آگ یا جہنم کا سب سے نچلا طبقہ۔ منافق اس میں داخل ہوں اور اشقیٰ بھی اسی میں داخل ہوں گے

ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى معاذ اللہ نہ اس میں وہ جئے گا نہ مرے گا۔ اور نہ مرنے کی صورت یہ ہوگی کہ سانس حلقوم میں آکر اٹک جائے گا۔ نہ نکلے گا کہ مر جائے نیچے اترے گا کہ آرام پائے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى۔ جن نے سنوار لیا اپنے آپ کو وہ کامیاب ہو گیا۔ یا بعض مفسرین نے فرمایا کہ جس نے زکوٰۃ دی اور صدقہ کیا تیزکیٰ کے معنی۔ ویسے عام معنی۔ اپنے نفس کو پاک کیا۔ بداعمالیوں سے دور کیا۔ سنوارا۔ سدھارا۔ تزکیہ نفس کیا۔ کفر سے پاک کیا۔ میرے خیال میں جس نے دنیا کی محبت سے اپنے دل کو پاک کر لیا بس وہی کامیاب ہوا کیونکہ جتنے نیک اعمال جتنے ایمان ہیں۔ ہرگز مفید نہیں ہیں۔ یا کم تے

کہ ان کا اچھا اثر ظاہر نہیں ہوتا جب تک دنیا کی محبت دل میں ہے. کبھی اس کو نماز میں مزہ نہیں آئے گا. کسی نیکی کرنے میں اس کو لطف نہیں آئے گا. جیسے قوالی میں ایک شعر پر مزہ آنے لگتا ہے. حال آنے لگتا ہے اور صدہا روپیہ قوال کو دیدیتا ہے. اور اگر کسی کو کوئی نیک بات کتنی ہی اچھی بتائی جائے. نہ اس میں اس کو مزہ آتا ہے نہ جھومتا ہے. نہ ایک پیسہ دیتا ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ جب موتی جھارا بخار چڑھ جایا کرتا ہے. تو عمدہ سے عمدہ غذا بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی ۵۵ سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے ۴۰ روز کا بخار ہوا اور جس گھر میں میں رہتا تھا اس کی دیوار دوسرے پڑوسی کی تھی. وہ دیوار توڑ دی گئی اور مکان بن رہا تھا وہ میدان ہو گیا. کسی رئیس کی شادی تھی. میدان دیکھ کر وہاں کھانا پکوایا. عمدہ عمدہ کھانے پک رہے تھے. میں صحن میں لیٹا تھا. تو ان عمدہ کھانوں کی خوشبو مجھے اتنی بری معلوم ہوتی تھی. کہ میں اپنے ابا سے کہتا تھا کہ مجھے ان کی خوشبو سے اذیت ہو رہی ہے. مجھے اندر گھر میں لے چلو. اگر کھانے کی دیگ راستے میں گزرتی تو اس کی مہک سے اتنی اذیت ہوتی کہ میں پریشان ہو جاتا. اجمل خاں کا علاج کیا. ۴۵ روز میں بخار اتر گیا مگر اس کا اثر اب تک باقی ہے. تمام جوڑوں میں اب تک درد ہوتا ہے. ٹائیفائڈ ہمیشہ اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے. اگر اثر نہ چھوڑے تو جان لیجئے کہ وہ ٹائیفائڈ نہیں تھا. لیکن اس سب کے باوجود کچالو کو بڑا دل چاہتا تھا. اور یہ سخت ممنوع تھا. کیونکہ یہ بہت مضر چیز تھی. تو جب دنیا کی محبت کا ٹائیفائڈ دل کو چڑھ جایا کرتا ہے. تو اس وقت یہ عمدہ عمدہ قوت ... کہ یہ جو قرآن اور حدیث عمدہ عمدہ غذائیں ہیں.

ان کی خوشبوئیں بڑی تکلیف دیتی ہیں اور جو قوالی کے اشعار ہیں وہ کیا لو ہیں وہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اصل جو چیز ہے وہ دل کا رجحان اس دنیا کی طرف ہے۔ اور قرآن کا بہت زیادہ حصہ اعمال کے مقابلے میں اس سے بھرا ہوا ہے۔ اس دنیا کی زندگی کے دھوکے میں مت آنا غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (جاثیہ ۳۵)
جب یہ تصور ہے کہ جو مر گیا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ مر گیا مگر اپنے متعلق نہیں سمجھتا کہ میں بھی مروں گا۔ اگر اس کو یہ خیال ہو جائے کہ مجھے مرنا ہے تو جیسے سزائے موت کے مجرم کو کھانا پینا اچھا نہیں معلوم ہوتا اس کو بھی کھانا پینا اچھا معلوم نہ ہو۔ اسی لئے کہا کہ موت کو یاد کرو یہ قاطع لذات ہے۔ جب تک لذت پا رہا ہے۔ آرام سے سو رہا ہے کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مارکیٹ میں کوئی لیٹ جائے سڑک پر بھوک بھی لگ رہی ہے۔ تو کبھی کوئی چیز کھا لی۔ ورنہ یہی ہوتا ہے کہ گھر ہی چل کر کھائیں گے۔ گھر جا کر پیر پھیلا کر آرام سے سوتا ہے۔ آرام کی جگہ گھر ہے۔ اگر مارکیٹ میں بجائے خرید و فروخت کرنے کے کوئی سو جائے تو وہ پاگل ہے۔ مجنون ہے۔ تو یہ دنیا جو ہے۔ وہ مارکیٹ ہے۔ اور جنت گھر ہے۔ یہ گھر تو ایسا ہے کہ آدمی کبھی کبھی بھول جاتا ہے۔ مگر وہ گھر ایسا ہے کہ اس کو دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ یہ میرا گھر ہے کوئی بتلانے و تانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اگر یہاں آرام کیا اور پاؤں پھیلائے تو سمجھ لو کہ وہ خرید و فروخت نہیں کر سکے گا۔ نفع نہیں کمائے گا۔ یہ دھوکا ہے۔ دھوکے میں نہ آنا۔ تو دل سے دنیا کی محبت کا نکل جانا۔ یہی تزکیہ ہے۔ اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ دنیا اتنی گندی اور گھٹیا چیز ہے کہ انسان اکثر رات کو سوتے میں خواب دیکھتا

ہے اور دن میں اپنے عزیزوں سے بیان کرتا ہے. تو اس عالم کی یاد اس جہان میں داخل ہے مگر اس جہان کی یاد اس عالم میں جاکر بھول جاتا ہے. اگر یاد رہے تو وہ نیند نہیں رہے گی. تو معلوم ہوا کہ وہ عالم اتنا قوی ہے کہ اس کی یاد اس عالم میں باقی ہے اور یہ اتنا کمزور ہے کہ اس عالم کی یاد اس عالم میں جاکر محو ہو جاتی ہے. یہ بات ہے جو اللہ تعالے نے دنیا کی بے ثباتی کے متعلق میرے دل میں ڈالی. آپ دیکھیں کہ کیسی کیسی عجیب باتیں آپ سن رہے ہیں. بڑے بڑے سائنسدان کیسی کیسی عجیب و غریب ایجادات کر رہے ہیں اور ایک سکنڈ میں ہارٹ فیل ہوا اور ختم. کیسی بے ثباتی ہے اس دنیا کی. خواب میں دیکھ رہا ہے کہ پھولوں کی سیج پر باغوں میں لیٹا ہوا ہے. اور آنکھ کھلی تو دو سپاہی وارنٹ لئے کھڑے ہیں کہ چلو جلدی جیل میں. تو کہاں گئی ساری وہ کیفیت. کوئی چیز نہیں ہے. یہ دنیا بہت دھوکا ہے. اور یہ جو غریبوں کو دھوکا لگ جاتا ہے یہ بڑی غلطی ہے. اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ حجت پوری ہوگئی اگر حجت پوری نہ ہوتی تو کم سے کم لاعلمی کی وجہ سے چھوٹ مل جاتی. وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (زمر-۵۵) اتنی مہلت دے دی تھی کہ جس کو سوچنا سمجھنا ہے وہ سوچ سمجھ لے اور پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا. ایک ڈرانے والا بھی بھیجدیا.

اس غریبی میں کیا ہے. حصول کا فکر ہے. مال، کپڑا، کھانا، بلڈنگ کے حصول کا فکر ہوتا ہے اور امیر کو کیا ہوتا ہے کہ یہ جو حاصل ہے یہ کہیں ضائع نہ ہو جائے. اس کو حصول کا فکر ہے. اس کو زوال کا فکر ہے. اور زوال کا فکر

حضور کے نزدیک بہت برا ہے۔ تو دنیا کی لذت پر بعض امیر غریب بہت برا ہے۔ یہی صورت دوسرے جہان میں ہے۔ اس لئے فقر غنا سے افضل ہے۔ ہر صورت میں اس لئے غریبوں کے لئے خوشی کی بات ہے۔ انہیں گھبرانا نہیں چاہئے کہ اس کو امداد دیا مجھے اتنا کم دیا۔ وہ اونچے اونچے مکان میں رہتا ہے۔ اور میں جنگل میں رہتا ہوں تو یہ بہا ایسے اونچا معلوم ہو رہا ہے۔ تو اگر ہوا میں چلا جائے تو یہ نیچا نظر آئے گا پھر جب جائے گا تو وہ لازمی چھوڑ کر جائے گا اور تو بھی چھوڑ کر جائے گا تب بھی نفع میں تو ہی رہا۔ تیری ٹوٹی جھگی گئی اس کا باغ و بہار گیا۔ اللہ آپ کو توفیق دے اور مجھے بھی۔ اس لئے فرمایا کہ نصیحت اس شخص کو کر جس کو نفع دے۔ جس کے دل میں اللہ کی خشیت جلال اور بڑائی بیٹھی ہوئی ہے۔ یا معاصی کے انجام کا ڈر دل میں ہو۔ قد افلح من تزکی۔ یہ کلیہ ضابطہ ہے۔ اور حق ہے کہ جس نے تزکیہ کر لیا۔ وہ قطعی فلاح پا گیا۔ ایک جماعت مومنین کی ہے اس نے اس کے معنی سمجھے ہیں۔ اور ان کی نہیں سمجھا۔ وہ جماعت صوفیا کرام کی ہے میں نے جتنا بیان کیا ہے۔ میں اس سے بہت زیادہ بیان کر سکتا ہوں۔ اور مجھ سے زیادہ جاننے والا مجھ سے زیادہ بیان کرے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ باپ اس کا اس پر بہت شفیق ہے۔ مگر یہ علم حقیقی نہیں ہے۔ واقعہ تو ہے۔ مگر علم حقیقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ شعور کہ باپ کو بیٹے سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ اس کو جب ہوتا ہے جب وہ خود باپ بن جاتا ہے۔ تو ہمارا علم ایسا ہے جیسا بیٹے کا علم اور صوفیا کا علم ایسا ہے جیسا باپ بننے کے بعد شعور ہوتا ہے کہ باپ کو بیٹے سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ تو حاصل یہ نکلا کہ علم الدنیا کے

ہے اور حصول اور چیز ہے وہاں محبت کا علم ہے۔ اور یہاں محبت حاصل ہوتی ہے تو قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ-۱۴) کا علم تو ہم کو ہے۔ مگر اس کا حصول نہیں ہے۔ امیر کا بچہ ہے اس کے ہاتھ میں امرود ہے۔ کتر کتر کر پھینک رہا ہے۔ اور غریب ہے وہ جانتا ہے۔ اس کی خوبیوں کو مگر وہ چاہتا ہے۔ کہ بجائے پھینکنے کے مجھے دیدے۔ تو اس کو علم ہے۔ اس کو حاصل ہے۔ یہ اس کے برابر کبھی کبھی نہیں ہو سکتا یہ ظاہری علم کتنے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کو پہنچ جائے مگر وہ تحقیق کے علم کے ذرہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی جماعت کو یہ تحقق حاصل تھا یہی اولیاء اللہ کی جماعت ہے یہی اللہ کے خاص بندے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ نفس کو پاک کیا اور دنیا کی محبت کو جدا کر دیا۔ پھر اپنے رب کے نام کا ذکر کیا تب اس کو حلاوت آئے گی۔ تمبا کو کھانے والے کو لیموں کا نام سن کر دانتوں میں کھٹاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ اس میں صلاحیت ہے ترشی کے اثر کو قبول کرنے کی۔ اور جو تمبا کو پان نہیں کھاتے ان کے سامنے نام لیں۔ تو وہ کچھ محسوس نہیں کرتے۔ تو جس کا قلب صاف ہے۔ اس کے سامنے جب رب کا نام لیا جائے گا۔ اس کے دل میں رب کی تجلی ہو گی۔ یا جنگل میں تنہا دو آدمی چلے جا رہے ہیں اور ایک نے دوسرے کے کان میں کہا شیر فوراً اس کی جوتیاں ڈھیلی ہو جائیں گی اور گر جائے گا۔ اب آپ یہاں کہئے شیر کوئی اثر نہیں اور ہنسی آئے گی۔ یہ کیا ہے۔ مجمع ہے، شور و غوغا ہے اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہاں بھی آپ دیکھیں کہ اگر سناٹا ہو جائے۔ اور کوئی کہے کہ گاندھی گارڈن سے شیر چھوٹ گیا۔ گو شیر ابھی نہیں پہنچا مگر اس حال

ہو جائے گا۔ تو یہ شور و غل اور کثرت اس کی ہیبت کی تجلی سے رک گئی ہے
اسی طرح یہ شہوت اور غضب کا جو شور انسان کے اندر مچ رہا ہے۔ اس شور
کے وقت جو اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو وہ اس پر اثر نہیں کرتا۔ جب یہ شہوت اور
غضب سے خالی ہو جائے گا اور نفس پاک ہو جائے گا۔ اور پھر وہ اپنے رب کا
نام لے گا تو فوراً دل دہل جائے گا اور رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ فصلی پھر نماز
پڑھو۔ پہلے اپنے رب کے نام کا ذکر کر۔ خواہ تکبیر تحریمہ ہو۔ امام ابو حنیفہ کے
نزدیک تکبیر تحریمہ نماز سے باہر ہے۔ کیونکہ فصلی اسم رب کے ذکر پر عطف ہے
اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے۔ خیر یہ فقہی مسئلہ ہے وہ ذکر تو استطراداً فصلی
یہ طریقہ اور قانون بتا دیا اس نے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم کو دونوں کو توفیق عطا
فرمائے۔ اب نکتہ کی راز کی بات بتائی کہ بات اصل کیا ہے۔ یہ جو تمام خرابیاں پیدا
ہو رہی ہیں، شقاوت۔ اور اشقیٰ پن اس کی اصلی علت بیان کر دی۔ وہ جو پہلے
میں بتا رہا تھا۔ قرآن نے بھی وہی بات بتا دی کہ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا
اصل وجہ یہ ہے کہ تم دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ اور اس کو اختیار کرتے
ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معاصی اور فسق وغیرہ جو ہوتے ہیں۔ اس سب کی وجہ
یہی ہے کہ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ دنیا کو ترجیح کیوں دیتے ہو۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ اس کے منافع حسی ہیں۔ اور عقبیٰ کے جو منافع ہیں وہ غیر حسی
ہیں فرق اتنا ہے یہاں کی جو لذتیں اور راحتیں ہیں وہ حس سے معلوم ہو
جاتی ہیں اور وہاں کی جو لذتیں اور راحتیں ہیں وہ حس سے معلوم نہیں
ہوتیں۔ اگر وہ حس سے معلوم ہو جاتیں تو کبھی بھی دنیاوی منافع کو اختیار نہ کرتا

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ چونکہ حسی نہیں ہیں۔ اور یہ حسی ہیں اس لئے اس کو اختیار کیا اور اس کو ترک کر دیا تو یہ حجت نہیں ہوگی۔ کیونکہ اکثر پیٹرول پمپ پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک بورڈ لگا ہوتا ہے۔ جس پر لکھا ہوتا ہے۔ ڈینجر DANGER وہاں انسان احتیاط کرتا ہے۔ مگر کتا بالکل احتیاط نہیں کرتا۔ بڑے آرام سے وہاں بیٹھا رہتا ہے کیونکہ وہ ڈینجر حسی نہیں ہے لیکن اگر آگ لگی ہوئی ہو تو کتا بھی بھاگے گا اور آدمی بھی۔ تو محسوس سے کتا بھاگے گا غیر محسوس سے کتا نہیں بھاگے گا۔ تو اگر تم مثل کتے کے ہو تو غیر محسوس سے نہیں بھاگو گے۔ اور اگر تم مثل انسان کے ہو تو تم غیر محسوس سے اسی طرح بھاگو گے جیسے پیٹرول پمپ کے ڈینجر سے۔ اور اس کے دلائل موجود ہیں۔ جس طرح دلیل ڈینجر ہے۔ پیٹرول پمپ پر۔ اسی طرح پورا قرآن اور پوری حدیث بھری پڑی ہے۔ ڈینجر ڈینجر ڈینجر لکھا ہوا ہے جگہ جگہ کہ خطرے سے بچو، احتیاط برتو۔

اگر غیر محسوس سے نہیں ڈرتے تو تم میں اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ جو انسانیت تم کو دی تھی وہ تم نے خاک میں ملا دی۔ انسان اگر یہ کہے کہ ہمیں کبھی ایسا ہی کر دیتا کہ ہمیں بھی آخرت کی چیزیں تمام محسوس ہو جاتیں۔ آگے دلیل ہے اس کی کہ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى یہاں کی لذتوں سے وہاں کی لذتیں بہتر ہیں۔ کیونکہ یہاں کی ہر لذت میں بے لذتی پوشیدہ ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ باقی رہنے والی ہیں اور یہ فانی ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ کھانا ہر وقت اچھا نہیں لگتا۔ صرف بھوک میں کھانا اچھا لگتا ہے۔ اور پہلا لقمہ سب سے زیادہ لذیز لگتا ہے۔ پھر یہ لذت ہر لقمہ پر کم ہوتی چلی جاتی ہے

یہاں تک کہ جب لذت بالکل ختم ہو جاتی ہے تو آدمی کھانا چھوڑ دیتا ہے۔
اس وقت اس کو بے لذتی کا احساس ہوتا ہے۔ اب دل کا تقاضا کیا ہے کہ
ایسی لذت ہو جس میں بے لذتی نہ ہو۔ ایسی حیات ہو جس کی تہ میں ممات نہ ہو۔ کیا
فائدہ اس جینے سے۔ جب اس میں مرنا مضمر ہے۔ کیا فائدہ اس صحت سے جس میں
مرض مضمر ہو۔ کیا فائدہ اس علم سے جس میں جہل مضمر ہے۔ مجھے پچاس برس ہو گئے
غور کرتے ہوئے آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ غور کیا چیز ہے۔ اس پچاس برس
میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ کچھ پتہ نہیں چلا۔ بس یہ معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم۔
کیا فائدہ اس غنا سے جس کی تہ میں فقر ہو۔ ایسی لذت سے کیا فائدہ کہ اس
کی تہ میں بے لذتی ہو۔ اور مقصود بالذات لذت ہے۔ اور یہاں تحقق نہیں
ہے۔ تو ضرور کوئی دار لذت علاوہ ہونا چاہیے۔ یہ دلیل ہے اس بات
کی کہ اصل لذت وہاں ہے آگے۔ اگر نقلی لذت مقصود ہو تو جانور اور انسان
میں کوئی فرق نہیں ہے کھانے میں۔ اور فرق ضرور ہے۔ تو اس فرق کے ظہور ہونے کی
جگہ ہونی چاہیے۔ اور وہ اس عالم میں ہے نہیں لہٰذا دوسرا عالم اس کے ظہور
کے لئے ضروری ہونا چاہیے۔ اب رہا یہ کہ اس لذت کے ترک کرنے میں کوئی
تکلیف ہے۔ تو اس میں کوئی رنج نہیں کیونکہ اگر آپ رات کو بارہ بجے گھر پہنچیں۔
ہوٹل سب بند ہوں، بھوک خوب لگ رہی ہو اور گھر جا کر معلوم ہو کہ جو کھانا
آپ کے لئے رکھا تھا اس میں کتے نے منہ ڈال دیا تو آپ اس کھانے کو کھائیں گے
یا بھوکے سو جائیں گے۔ اس طرح یہاں کی لذتوں میں زہر ملا ہوا ہے۔ عقلمند
وہی ہے جو ان سے پرہیز کرے۔ ورنہ ہلاکت یقینی ہے۔ تو کیا آخرت بہتر ہے

اس سے اور دوسری خوبی یہ بتائی کہ وہاں کی لذتوں میں بقا ہے۔ ایسی اصلی لذت بھی کس کام کی جو ختم ہونے والی ہو۔ دو خوبیاں بتائیں بہتر اور باقی رہنے والی یہاں کی لذتوں میں دو عیب ایک یہ کہ بہتر نہیں دوسرا عیب کہ فنا ہونے والی. اب رہی یہ بات کہ مر جائے گا. اگر لذت حاصل نہ کرے گا تو مرے گا نہیں. جتنی زندگی کے لئے ضروری ہے وہ غذا تو میرے ذمہ ہے وہ میں دیتا رہوں گا.

گھروں میں جس طرح چھینکے میں کھانا لٹکا دیا جاتا ہے. کہ غیر مستحق، بلی، چوہا، کتا، اس تک نہ پہنچ سکے۔ اسی طرح تمہاری روزی جتنی تمہاری ضرورت کی ہے بقا کے لئے وہ میرے پاس آسمان میں لٹکی ہوئی ہے۔ وہ میں وعدہ کے مطابق تم کو پہنچاتا رہوں گا. یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو بیانہ کے طور پر کام کرنے سے پہلے مل جاتا ہے تاکہ روٹی پانی کا انتظام ہو جائے. پھر جب کام ختم ہوتا ہے مزدوری اس وقت ملتی ہے. بعینہ دوسرے جہان میں جب اس جہان میں عمل کر چکے گا تو جزا وہاں ملے گی. وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ج (عنکبوت - ۶۰)

بہت سے چوپائے زمین پر اپنی روزی لادے لادے نہیں گھومتے۔ انتہائی بلاغت ہے. کیونکہ بعض جانور ہیں جو اپنی روزی کے لئے کام کرتے ہیں۔ ان چوپایوں کو کون رزق دیتا ہے اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا اللہ ان کو رزق دیتا ہے۔ بہت بڑی اکثریت کو بغیر کمائے رزق پہنچ رہا ہے وَاِيَّاكُمْ (عنکبوت - ۶۰) اور تم کو بھی وہی دیتا ہے کمائی علت نہیں ہے۔ رزق کی۔ کمائی جب بھی رزق ملے گا۔ نہ کماؤ تب بھی رزق ملے گا. اس کا فکر مت کرو۔ یہ بڑی غلط بات ہوگئی یہ کام میرے ذمہ تھا. تم نے اپنے ذمہ لے لیا. اس کی وجہ سے جو پریشانیاں

ہو رہی ہیں وہ ہیں۔ میں تو اتنا خیال رکھتا ہوں کہ پیدائش سے قبل دو کپے دودھ کے بھر کے رکھ دیئے ہیں۔ ایسے کہ کبھی خالی نہ ہوں۔ بڑے بڑے کنویں الاڑ لگانے سے خالی ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ ماں دودھ کا ایسا کپا ہے کہ جب منہ ڈالو گے بھرا پاؤ گے۔ کبھی خالی نہیں ملے گا۔ پیدا ہونے سے پہلے انتظام کر دیا۔ غریب امیر کا کوئی فرق نہیں کیا عمدہ اور بہترین غذا مہیا کر دی۔ تم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا یہ غلطی کی۔ میرے ہی ہاتھ میں رہنے دیتے تو میں اسی طرح دیئے جاتا خیر اب تم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تو میرے حکم اور میرے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق اس کا انتظام کرو۔ تو اب بھی تمہیں تکلیف نہیں ہوگی۔ وکفیٰ بربک وکیلاً (بنی اسرائیل ۶۵) دل نہ ہو فکر نہ کرو۔ انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (عمران ۱۳۹) اگر تم مومن رہو تو تم ہی اعلیٰ رہو گے۔ تم نے ایمان کو چھوڑ دیا اس کی اطاعت کو چھوڑ دیا لازمی پریشانی ہوگی۔ بڑی عمدہ نصیحتیں ہیں بڑے اعلیٰ ضابطے ہیں۔ ایک ایک آیت ایک ایک دن میں ہونی چاہیئے تھی۔ مگر میں نے جلدی کی۔ اور ایک دن میں سب ختم کر دیں۔ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ o صحف ابراھیم و موسیٰ (اعلیٰ) یہ نصیحتیں تمام کی تمام جو اگلی کتابوں میں تھیں وہ صحیفہ ابراہیمی ہو یا موسوی۔ کل کی کل میں نے بیان کر دی ہیں۔ یا خاص کر یہ بات کہ آخرت بہتر ہے اور یہ دنیا کمتر ہے۔ یا یہ بات کہ تم دنیوی زندگی اختیار کرتے ہو۔ یا یہ بات کہ جس نے نفس کی اصلاح کی۔ وہ کامیاب ہو گیا۔ بلکہ زیادہ حق بات یہ ہے کہ کل کی کل باتیں بیان کر دی ہیں۔ شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ (شوریٰ ۱۳)

فرمایا بتاتا چلا آ رہا ہوں تمہارے لئے خاص نہیں ہے۔ تمہیں بھی سیدھا راستہ بتا دیا۔ سورۃ بہت بڑھیا ہے۔ حضورؐ نے اعلان فرمایا ہے کہ اس سورۃ کے پڑھنے والے کے لئے دس حسنات ہیں۔ جو کچھ ابراہیم و موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا اور جو کچھ حضور اکرمؐ پر نازل ہوا ہر ہر حرف پر دس دس حسنات ہیں۔ اتنے حسنات ہیں۔ اس سورۃ کے پڑھنے والے پر۔ سب صاحبان ایک مرتبہ سورۃ اعلیٰ پڑھ لیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ
خَاشِعَةٌ ۙ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ
تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ
ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝ وُجُوْهٌ
يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِيْ جَنَّةٍ
عَالِيَةٍ ۝ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝ فِيْهَا عَيْنٌ
جَارِيَةٌ ۝ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝ وَّاَكْوَابٌ
مَّوْضُوْعَةٌ ۝ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ۝ وَّزَرَابِيُّ
مَبْثُوْثَةٌ ۝ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝
وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝ فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ
الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ۝ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۝

هل أتٰك حديث الغاشية ٥ وجوه يومئذٍ خاشعة عاملة ناصبة ۔ کیا تو جانتا ہے تجھے علم ہے خبر ہے کہ قیامت آئے گی۔

حدیث = خبر۔ غاشیہ = قیامت۔ آگ۔ ڈھاکنا۔ زیادہ صحیح قیامت۔ قیامت کے حالات۔ وجوہ جمع وجہہ = لوگ۔ خاشعہ = ذلیل۔ عاملۃ = عمل۔ ناصبۃ مشقت۔

بعض مفسرین کہتے ہیں یہاں جو خدا کے حکم کے خلاف عمل اور مشقت کرتے ہیں۔ جیسی رہبان اور تیاگی وغیرہ۔ ان کی حالت قیامت میں یہ ہوگی تَصْلٰی نَارًا حَامِيَةً۔ دہکتی ہوئی گرم تیز آگ میں داخل ہوں گے۔ زیادہ لوگ صحیح یہ سمجھتے ہیں کہ کفار قیامت میں ذلیل ہوں گے اور طوق و زنجیر اٹھائے ہوں گے اور کبھی نیچے دھنسیں گے، کبھی ابھریں گے۔ اور سخت مشقت میں ہوں گے۔ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ کھانے پینے کا ذکر کیا کہ چشمہ جو بہت کھولتا ہوا ہوگا وہ اس چشمے سے پانی پلائے جائیں گے۔ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ نہ ان کے لئے کھانا ہے۔ الا من ضريع سوائے کانٹے دار زہریلی جھاڑی کے جو اونٹ بھی نہیں کھاتا لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ نہ تو وہ سمن ہوگا یعنی بدن بنائے گا اور نہ اس سے بھوک مٹے گی۔ یہ تعریف ہے جہنمیوں کے کھانے کی۔ کھانے کے یہی دو مقصد ہیں بھوک سیر ہو اور جزو بدن بنے۔ وہ پورے نہیں ہوں گے۔ یعنی وہ غذا ہی نہیں ہے۔ اور کچھ ایسے بھی ہوں گے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً۔ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ۔ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ۔ خوش خرم تر و تازہ۔ راضیہ۔ بہت خوش ہوں گے۔ کہاں؟ جنت عالیہ میں ہوں گے۔ بلند باغوں میں وہ باغ کیسے ہوں گے؟ وہاں کوئی لغویات نہیں سنیں گے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (مریم-۶۲)۔ کوئی لغوبات نہیں ہوگی۔ صرف سلام ہی سلام ہوگا کیونکہ اللہ پاک

تو مرلب ہے۔ اللہ پاک کی طرف سے سلام ہوگا۔ سلام قولا من رب الرحیم (یٰس ۵۸) رب رحیم کی طرف سے سلام ہوگا۔ ہمارے یہاں سلام کا جواب وعلیکم السلام ہوگا۔ مگر خدا کو تو یہ نہیں کہا جائے گا۔ وعلیک السلام یا اللہ، اس لئے سلام ہی سلام ہوگا جواب نہیں ہوگا۔ اور بہت سے چشمے رواں ہوں گے۔ اونچے اونچے تخت لگے ہوں گے۔ آبخورے رکھے ہوں گے۔ منگوانا نہیں پڑے گا۔ نمارق۔ تکیے ہی تکیے برابر برابر لگے ہوں گے۔ جہاں جی چاہے بیٹھو۔

اور قالین جگہ جگہ بچھے ہوں گے۔

تو یہاں بات یہ فرمائی کہ کیا قیامت کی خبر آئی۔ پھر فرمایا دو گروہ ہوں گے اور دونوں کے کھانے پینے رہنے سہنے کا ذکر فرمایا۔ گروہ کافر اور گروہ مومن۔ اب غور کریں۔ افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت کیا تم نے غور نہیں کیا اونٹ پر کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا۔ والی السماء کیف رفعت اور آسمان کو کیسا بلند کیا۔ والی الجبال کیف نصبت۔ اور پہاڑ کیسے نصب کئے۔ والی الارض کیف سطحت اور زمین کو کیسا مسطح بنایا۔ فذکر انما انت مذکر۔ بس تو ذکر کر بے شک تو ذاکر ہے۔ سمجھائے جا تو سمجھانے ہی کے لئے ہے۔ لست علیہم بمصیطر۔ تو ان پر والی مسلط دارو غہ نہیں ہے کہ ان کو سمجھا ہی کر چھوڑے لیعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ تو انہیں مجبور کرئے کہ وہ تیرے سمجھانے سے ایمان لے ہی آئیں۔ بس تیرا کام تو سمجھا دینا ہے فانما علیک البلاغ وعلینا الحساب تیرے ذمہ سمجھانا ہے اور ہمارے ذمہ سلٹنا۔ الا من تولی وکفر۔ ہاں جس نے منہ پھیرا اور کفر کیا۔ فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر۔ اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ یعنی کفر کا عذاب یا جہنم کا عذاب اور عذاب اصغر کے معنی فسق و فجور کا عذاب۔ ان الینا ایابہم۔ ہماری طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے۔ لوٹنا ہے۔ وہ لوٹ کر ہماری طرف ہی آئیں گے۔ ثم ان علینا حسابہم۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان سے

حساب لیں ان سے سلٹیں۔ تمہارا کام سلٹنا نہیں ہے۔ تمہارا کام صرف ہمارا حکم پہنچانا ہے۔
غور کرنے کی چیز یہ ہے پہلے قیامت کا ذکر کیا پھر جو قیامت میں حال ہوگا۔ دو گروہوں کا
ان کا ذکر کیا۔ ان کا اونٹ کے دیکھنے سے کیا تعلق ہے کہ دیکھو کیا عجیب الخلقت
جانور ہے۔ اس میں کس قدر فوائد ہیں اس کا گوشت بھی کھایا جا سکتا ہے۔ دودھ بھی پیا
جا سکتا ہے۔ سواری کی جا سکتی ہے۔ بار برداری کے کام آتا ہے۔ شان و تجمل کے کام
آ سکتا ہے۔ اس کے بال بھی کام آ سکتے ہیں۔ مسافت قطع کرنے کے لئے بھی ہے۔ تھوڑے
پانی میں بہت دن تک گزار سکتا ہے۔ اتنے کسی جانور میں فوائد نہیں جتنے اونٹ میں ہیں
انسان کے پانچ کام ہیں۔ یہ پانچوں میں کام آ سکتا ہے۔ کھانا پہننا۔ رہائش و حرکت اور تجمل۔
اس کا ذکر اس لئے کیا کہ قیامت کا ثبوت چاہیئے۔ قیامت کا آنا عقل میں آنا چاہیئے
اس کی یہ دلیل ہے۔ تو یہ بات کہ قیامت آئے گی غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس
کے لئے فرمایا غور کرو۔ غور تنہائی چاہتا ہے۔ تنہائی سفر میں میسر آتی ہے۔ تو جب
اونٹ پر سوار ہو کر چلتا ہے تو پہلے اس کی گردن اور کوہان نظر آئے گا۔ تو سب سے
پہلے نظر اونٹ پر جائے گی تو کہا کہ اس پر غور کرو۔ پھر آسمان پر نظر جائے گی تو کہا آسمان پر غور
کرو پھر ادھر اُدھر نظر جائے گی تو بازو کے دو طرفہ پہاڑوں پر نظر جائے گی کہا ان پر غور کرو۔
وہاں سے نظر ہٹے گی تو نیچے جائے گی۔ تو کہا زمین پر غور کرو۔ یہ اس کی ترتیب ہے۔ اب
دلیل کی تقریر پر غور کریں اور سمجھیں۔

جسم کو متضاد حالات لاحق ہیں۔ جسم یعنی وہ شے جس میں لمبائی چوڑائی اور عمق
ہو مثلاً حرکت اور سکون۔ کالا اور پیلا طرح طرح کے رنگ۔ طرح طرح کی صفتیں۔ طرح
طرح کی خاصیتیں، اور خصلتیں جسم کے اندر موجود ہیں۔ اور جتنی خصلتیں ہیں۔ ان میں ضدیں
پائی جاتی ہیں۔ کالا اور سفید۔ اونچا اور نیچا۔ حرکت و سکون یہ سب ضدیں ہیں۔ تو ضدیں
کسی شے کو لازم نہیں ہوتیں یعنی جسم بیک وقت ساکن اور متحرک نہیں ہو سکتا۔ یا ساکن

ہوگا یا متحرک ہوگا۔ کالا ہوگا یا سفید ہوگا۔ خوشبودار ہوگا یا بدبودار ہوگا۔ یعنی ایک صفت ہوگی۔ اور متضاد صفتیں لازم نہیں ہوتیں۔ لازم کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں جسم ہو وہاں وہ بھی ہو۔ روشنی سورج کو لازم ہے۔ کیونکہ جب سورج ہوگا روشنی ہوگی اور یہ ممکن نہیں ہے سورج روشن بھی ہو اور اندھیرا بھی ہو۔ یہ دونوں صفتیں متضاد ہیں اور ان کا ایک وقت ایک جسم میں موجود ہونا ممکن نہیں ہے۔ محال ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جتنی جسمانی خصلتیں ہیں وہ جسم کی ذات کو لازم نہیں ہیں۔ جب لازم نہیں ہیں تو جسم کو عارض ہوتی ہیں۔ تو کوئی اور قوت ہے جو عارض کرنے والی ہے وہ جسم کو کبھی ایک صفت کے ساتھ موصوف کر دیتا ہے کبھی دوسری صفت کے ساتھ موصوف کر دیتی ہے۔ کبھی حرکت کے ساتھ متحرک کر دیتی ہے کبھی سکون کے ساتھ ساکن کر دیتی ہے۔ ہر جسم یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس کو اور اس کی صفتوں کو دوسرے نے بنایا ہے۔ اور یہ دوسرا جو بنانے والا ہے وہ ہرگز جسم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر بنانے والا جسم ہوگا تو اس جسم کا بنانے والا کوئی تیسرا جسم ہوگا اور اس طرح تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے۔ لہٰذا بنانے والا بننے والی شے کا غیر ہوگا۔ یعنی غیر جسمانی ہوگا۔ اس کا مقابل ہوگا۔ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ پہلے نہ ہو پھر ہو بلکہ وہ ہو، ہوگا تو وہ غیر جسمانی چیز جو دائماً اور ازلی ہوگی اسی کا نام خدا ہے۔ اب اس کا یہ فعل اختیاری ہے۔ اضطراری نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ فعل اختیاری نہیں ہوگا۔ اضطراری ہوگا یعنی ایسا ہوگا جیسے سورج کے لئے روشنی دینا تو سورج روشنی سے غنی نہیں ہے بلکہ اس کی طرف محتاج ہے تو خالق اپنی مخلوق کی طرف محتاج ہو جائے گا۔ غنی نہیں رہے گا۔ تو غیر جسمانی۔ ازلی۔ غنی۔ چیز کا نام خدا ہے فان اللہ غنی عن العالمین اللہ تمام عالموں سے غنی ہے (آل عمران۔ ۹۷)۔ اگر محتاج ہوتا تو اس کے عالم ساتھ رہتا۔ تو خدا تعالےٰ کا وجود ثابت ہوگیا۔ جسم میں غور کرنے ہی سے اللہ تعالےٰ کا وجود ثابت ہوگیا۔ غیر اختیاری فعل نہیں ہے۔ بے علمی اور بے شعوری کا فعل نہیں ہے۔ ورنہ یہ اتنا مستحکم اور مرتب نہ ہوتا۔ ترتیب اس کے علم و شعور

پر دلالت کر رہی ہے۔ وجود کے ثبوت کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ شے کو پیدا کرنا پھر اس کو فنا کرنا یہ غیر معقول ہے۔ عقل میں نہیں آتا۔ اگر فنا مقصود ہے تو فنا تو عدم میں موجود تھی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تو یہ فعل عبث ہے۔ مگر فعل عبث نہیں ہے۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلا (ص ۲۷) ہم نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو شے ہے اس کو باطل پیدا نہیں کیا۔ ان پر اثر مرتب ہے اور آگے کسی شے کے لئے ان کو بنایا ہے۔ انسان کو پیدا کیا۔ اور بیکار پیدا نہیں کیا۔ بلکہ کسی کے لئے پیدا کیا۔ تو جس کے لئے پیدا کیا اس کا امر و نہی کرنا بھی خالق کو لازم آیا۔ وہ خالق ہے عالم کا۔ قادر ہے۔ غنی ہے تو آمر و ناہی بھی وہی ہوگا۔ وہی بتائے گا کہ تجھے اس کام کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ کر اور یہ نہ کر اس کے لئے تجھے پیدا نہیں کیا۔ جب آمر و ناہی وہ ہوگا تو حکومت اور اقتدار بھی اسی کا ہوگا۔ اس کا امر چلے گا۔ امر و نہی متحقق نہیں ہو سکتا۔ جب تک وعد وعید نہ ہو (وعدہ جزائے نیک اور وعید سزائے بد کو کہتے ہیں) اگر کام کرنے پر انعام مقرر نہ ہو اور نافرمانی کرنے پر سزا مقرر نہ ہو تو پھر وہ امر و نہی بے کار ہے۔ اول سانس سے آخر سانس تک برابر اجیر ہے۔ عمل کر رہا ہے۔ عمل دراصل حیات ہے اور اس حیات کا گذار دینا ہی عمل ہے۔ حرکت و سکون ہی کا نام عمل ہے۔ آخر سانس تک مکلف ہے عمل کے دوران معاوضہ نہیں ملا کرتا۔ بعد میں ملتا ہے۔ امر و نہی متحقق ہونا وعدہ و وعید کو چاہتا ہے۔ اور وعدہ و وعید یہ چاہتا ہے کہ کام ختم ہونے کے بعد جزا یا سزا ملے۔ اور عمل ساری عمر ہے تو جزا و سزا عمر ختم ہونے کے بعد ہی ملنی چاہیئے۔ پیشگی معاوضہ نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ پیشگی معاوضہ جس عمل کا ہوتا ہے وہ عمل بہت سخت ہوتا ہے سنگین ہوتا ہے۔ وہ رحیم ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ مثلاً کھانا ہے۔ کھانے کی لذت کھانے کے عمل کا معاوضہ ہے یہ اس لئے کہ اگر پیشگی معاوضہ نہ ملتا اور وہ عمل نہ کرتا تو ہلاک ہو جاتا اور منظور اس کی بقا ہے۔ اب اس پیشگی معاوضہ کا نتیجہ کیا ہے۔ پیٹ میں درد مروڑ

قے۔ دست سخت تکلیف ہے۔ اگر مزہ نہ آتا تو ہرگز نہ کھاتا۔ شادی ہے۔ اس کا بیٹھ کی معاوضہ دیا۔ اس کا نتیجہ ساری عمر کی پریشانی۔ دنیا بھر کا کھٹراگ ہے۔ اب اس سے یہ سمجھ لیں کہ جس کی اجرت بعد میں ملے گی اور عمل پہلے ہوگا تو عمل نہ کا ہوگا اور اس کی اجرت بہت سنگین اور بڑی ہوگی۔ لاانتہا انعام پائے گا۔ یعنی مرنے کے بعد جزا و سزا پائے گا۔ بعد الموت وعدہ و وعید نہ ہوگا۔ اسی بعد الموت وعدہ و وعید کا نام قیامت ہے۔ اب دیکھئے کہ جس نے قیامت کا انکار کر دیا گویا وعدہ و وعید کا انکار کر دیا۔ جس نے وعدہ و وعید کا انکار کیا اس نے امر و نہی کا انکار کر دیا اور جس نے امر و نہی کا انکار کر دیا اس نے اس کی غنا اور حکمت اور قدرت اور شعور کا انکار کر دیا۔ اور جس نے حکمت و قدرت و شعور اور غنا کا انکار کر دیا اس نے اس کی ایجاد کا انکار کر دیا اور جس نے ایجاد کا انکار کر دیا اس نے تغیرات کا انکار کر دیا اور جس نے تغیرات کا انکار کر دیا اس نے مشاہدہ کا انکار کر دیا۔ وہ کافر ہی نہیں مجنون ہے۔ بچے کے پیچھے سے چپت لگائیے فوراً مڑ کر دیکھے گا کہ یہ جو تغیر رونما ہوا اس کا کوئی کرنے والا ضرور ہے کوئی مغیر ضرور ہے۔ یہ مشاہدہ دلیل ہے اس بات کی کہ کوئی فعل کا کرنے والا ہے۔ ہر شے کا بنانے والا کوئی ہے۔ پیچھے دیکھ کر وہ دریافت کرے گا کیوں مارا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ عمل کے لئے جزا ہے۔ فطرت میں شامل ہے۔ پھر وہ شور مچائے گا کہ کوئی فیصلہ کرے انصاف کرے۔ اس کا بدلہ لے۔ اس کا بدلہ و سزا دے تو جزا کی فطری شہادت موجود ہے۔ جسم تمام تغیر پر دلالت کرتا ہے۔ اب یہ بات اور سمجھ لیں کہ جتنے فاعل ہیں ان کے فعل بالحرکت ہیں۔ حرکت کریں تو فعل ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔ آپ بیٹھے سوچتے رہیں کہ میں گھر پہنچ جاؤں تو محض ارادے سے نہیں پہنچیں گے تمام کائنات کے فعل بالحرکت ہیں یعنی سب فاعل بالحرکت ہیں اور اللہ تعالیٰ فاعل بالاختیار ہے۔ محض اپنے اختیار۔ ارادے اور مشیت سے فعل کرتا ہے۔ مجرد مشیت سے فعل متحقق ہوگا۔ جب مجرد مشیت سے فعل متحقق ہوئے۔ یہ تغیرات ہوئے اور ان تغیرات نے اس

کے وجود پر دلالت کی۔ جب اس کا وجود ثابت ہوگیا تو اس کی قدرت۔ علم۔ مشیت اور غنا ثابت ہوگیا۔ جب یہ تمام چیزیں ثابت ہوگئیں تو ایسی ہستی کا فعل ثابت ہوا کہ عبث اور بے کار نہیں ہوگا۔ باکار ہوگا۔ تو باکار ہونے کے لئے امر و نہی چاہیئے۔ لہذا وہی آمر و ناہی ہوگا۔ الا لہ الخلق والامر۔ آگاہ ہو جاؤ کہ پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور حکم کرنا بھی (اعراف۔ ۵۴) اسی کا کام ہے ایجاد و تکلیف دونوں اسی کی خاصیت ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ شے سے کہا "ہو" تو وہ ہوگئی۔ جب پہلی آن میں حادث ہوگئی۔ تو دوسری آن میں اس نے کہا کہ اب کیا کروں کہا "زندہ رہ" تو یہ دوسری آن اور اس کے بعد کی جتنی آنیں ہیں یہ سب بقا ہیں۔ اور بقا عمل کو چاہتی ہے اور عمل امر و نہی کو چاہتا ہے تو جو ایجاد کرے گا وہی بقا دے گا اور وہی آمر و ناہی ہوگا آمر و نہی جب ہی ہوسکتا ہے۔ جب اس پر جزا و سزا مرتب ہو اور اس اثر کا یقین بھی ہو۔ اگر یقین نہ ہوگا تو وثوق جاتا رہے گا۔ اگر چھوٹا سا بچہ آکر یہ کہے کہ باہر نکلو ورنہ میں تم کو مار ڈالوں گا تو اس کی اس بات کا وثوق نہیں ہوگا۔ اور کوئی باہر نہ نکلے گا۔ مگر کوئی مجسٹریٹ حاکم آکر کہے تو اس کا فوراً وثوق ہو جائے گا تو اگر اس کا وثوق نہ ہو کہ عمل کی جزا دے گا تو عمل نہیں کرے گا۔ جب یہ عمل نہیں کرے گا تو وہ آمر و ناہی نہیں رہے گا۔ تو وہ خالق نہیں رہے گا۔ جب خالق نہ ہوگا تو مخلوق نہ ہوگی۔ تو حشر کا انکار اس موجودات کا انکار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنون ہے محض کفر ہی نہیں ہے۔ تو اسی کو فرمایا انظر الی الابل کیف خلقت اگر حیوانیت کا تقاضہ اونٹ ہونا ہوتا تو ہر حیوان اونٹ بن جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ حیوانیت نہیں چاہتی اونٹ بننے کو۔ لہذا کوئی اور قوت حیوانیت سے باہر ہے جو اونٹ پن کا حیوانیت پر ٹھپہ لگا دیتی ہے۔ اونٹ بن جاتا ہے۔ گھوڑے کا ٹھپہ لگا دیا۔ گھوڑا بن گیا۔ والی السماء کیف رفعت جو شے اونچی ہوسکتی ہے وہ نیچی بھی ہوسکتی ہے تو کسی باہر کی قوت نے آسمان پر اونچائی کا زمین پر نیچائی کا ٹھپہ لگا دیا۔ زمین پر نرم اور مسطح اور پہاڑوں پر بلند اور سخت کا ٹھپہ لگا دیا۔ والی الجبال کیف نصبت پہاڑوں

کو کیا نصب کیا۔ پہاڑ کی ذات یہ نہیں چاہتی کہ وہ سخت ہو۔ وہ بھی زمین کا ایک ٹکڑا ہے جیسے اور زمین سطح تھی اس کو بھی ویسا ہی سطح ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ کوئی اور باہر کی طاقت ہے جو ٹھپہ لگاتی ہے۔ چنانچہ اس نے جیسا ٹھپہ لگا دیا ویسا ہو گیا۔ تو غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی خالق ہے۔ وہی آمر و ناہی ہے۔ وہی وعدہ و وعید دینے والا ہے تو قیامت ضرور آئے گی۔ اور وہاں کیا ہوگا۔ یہ عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ اس کی خبر دے دی کہ دو گروہ ہوں گے۔ ایک کو ثواب ملے گا۔ دوسرے کو عذاب ملے گا۔ اور جو حالات گذریں گے وہ بتلا دیئے نبی کے ذریعہ سے۔ نبی نے اس کی خبر دے دی۔ بڑا مر لوط کلام ہے مضمون ختم ہو گیا۔ اب اللہ پاک سے آپ دعا مانگیں کہ ہم کو نیک گروہ میں رکھے۔ آمین۔

اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا۔ سبحان الملک القدوس سبوح قدوس۔ سبحان اللہ الملک الحی الذی لا یموت۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔ استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ۔

اللھم انا نسئلک العفو والعافیہ فی الدنیا والآخرہ۔ اللھم انا نسئلک الیقین ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین۔

درود شریف: اللھم صل علی نبینا ومرشدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔ اللھم بارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید ۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ
وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ؕ
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ
الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۙ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ
جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۙ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۙ
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۙ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۙ
فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۚ اِنَّ رَبَّكَ
لَبِالْمِرْصَادِ ؕ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ
فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ؕ
وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ
رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ۚ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ وَتَاْكُلُوْنَ
التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا

جَمًّا ؕ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ وَّجَآءَ
رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۚ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ
بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ
الذِّكْرٰى ؕ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ ۚ
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۙ وَّلَا يُوْثِقُ
وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ؕ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۙ ارْجِعِىْٓ
اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۚ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۙ
وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۠ ع ۳۰ الفجر سورہ ۸۹)

قسم کھائی فجر کی، دس راتوں کی، طاق وجفت کی۔ مگر جس بات پر یہ قسمیں کھائی گئیں ہیں اس کا ذکر نہیں ہے محذوف ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ قرینہ آیات کا بتاتا ہے کہ وہ بات یہ ہے کہ ہم مشرکین و منکرین کو عذاب کریں گے۔ اس کو مبہم اس لئے چھوڑ دیا کہ جس طرف دھیان جائے۔ ادھر چلا جائے۔ عاد نوحؑ کا پڑپوتا ہے،

ارم کا پوتا ہے سام کا بیٹا۔ اور ارم اس شہر کا نام بھی ہے۔ جس کو ارم نے بسایا۔ ارم کی قوم عاد اولیٰ کہلاتی ہے۔ وانہ اہلک عادن الاولیٰ ہم نے عاد اولیٰ کو ہلاک کر دیا۔ اور [illegible] عاد کی اولاد اور اس کا قبیلہ عاد ثانی کہلاتی ہے۔ کیسا کیا تیرے رب نے یعنی کیسا عذاب کیا ہوا سے ان کو ہلاک کر دیا۔ ذات العماد ستون والے۔ اور ستون ایسے تھے کہ لم یخلق مثلہا فی البلاد ایسے ستون جیسے کسی نے نہیں بنائے۔ یا عماد ایسی سخت قوم پیدا نہیں کی گئی یا وہ شہر ایسا تھا کہ اس جیسا کوئی شہر نہیں بسایا گیا۔ عاد کے بیٹے سے جب کہا کہ ایمان لے آ۔ تو اس نے پوچھا کیا ملے گا۔ انہوں نے کہا کہ جنت ملے گی۔ اس نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں ایسا تو میں بھی بنوا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایک شہر بنوایا۔ جس کی

اینٹیں چاندی سونے کی تھیں۔ اور راستے کی بجری اس کی موتیوں کی ریت اس کی عنبر تھی۔ یہ تین سو سال کی مدت میں تیار ہوا۔ اس وقت جب یہ شہر تیار ہوا تو شداد کی عمر ۹۰۰ سال کی تھی۔ جب وہ اس کو دیکھنے کے لئے روانہ ہوا۔ اور ایک دن رات کی مسافت باقی رہی تو اللہ کا عذاب آیا اور وہ سب برباد ہو گیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک شخص اس کے سامنے آیا اس کو دیکھ کر شداد ڈرا اور پوچھا تو کون ہے اس نے کہا میں ملک الموت ہوں۔ اس نے اتنی مہلت مانگی کہ ایک نظر اس شہر کو دیکھ لوں مگر وہ نہ دیکھ سکا اور اس کی روح قبض کر لی گئی۔ اور وہ شہر عذاب سے برباد کر دیا گیا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس شہر کی طرف اشارہ ہے۔ تین معنی ہوئے اور تینوں یہاں لگتے ہیں۔ نہ ایسا شہر تھا نہ عماد ایسی قوم تھی۔ اس قوم کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے کہ فاما عاد فاستکبروا فی الارض بغیر الحق عاد تو ملک میں اور زمین پر ناحق اکڑتی تھی وقالوا من اشد منا قوۃ اور ہم سے طاقت ور کون ہے۔ بڑے طاقت ور قوی اور طویل قامت لوگ تھے اولم یروا ان اللہ الذی خلقهم هو اشد منهم قوۃ انہوں نے اس بات کو نہیں جانا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے۔ اس لئے ان کو ذات العماد کہا یعنی طویل القامت لوگ تھے۔ یا عماد جمع ہے عمود کی عمود ستون کو کہتے ہیں۔ یا ستون والے تھے۔ ایسے ایسے ستون انہوں نے اس باغ اور بہشت میں بنائے تھے کہ ویسے کہیں نہیں بنے۔ چنانچہ

حضرت معاویہ کے دور میں ایک شخص کا اونٹ جاتا رہا اور وہ اس کو ڈھونڈتا ہوا اس شہر میں پہنچ گیا اور وہاں اس کے عجائب وغرائب دیکھے اس کی اینٹیں اور موتی اور جواہرات جو ان سے اٹھائے گئے وہ اٹھائے۔ جب حاکم کو خبر لگی تو ان کو دمشق میں طلب کیا گیا اور پوچھا کہ تم کو خزانہ کہاں سے ملا ہے تو انہوں نے اس شہر کی تفصیل جو دیکھی تھی بیان کی۔ حضرت معاویہ نے بیان الاخبار سے دریافت کیا کہ ایسا کوئی شہر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں ہے۔ اور قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے اور یہی شہر ہے۔ لم یخلق مثلہا فی البلاد اور بتایا کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص اونٹ ڈھونڈتا ہوا وہاں پہونچے گا اور اس کا حلیہ بھی بیان کیا وہ حلیہ بھی انہی صاحب سے ملتا ہوا تھا۔ الم تر کیف فعل ربک بعاد تو فرمایا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا نہیں جانا کہ ہم نے ذات العماد کے ساتھ کیا کیا۔ یعنی کیسا عذاب دیا۔ کس طرح ان کو یک بیک ہلاک کر دیا۔ ان ان چیزوں کی قسم ہے کہ ہم عذاب کریں گے جس طرح ہم نے عذاب کیا عاد پر، ثمود پر، فرعون پر، وثمود الذین جابوا الصخر بالواد وہ ثمود قوم جو پتھر کو، پہاڑ کو چھید ڈالتی تھی، ۱۷۰۰ شہر انہوں نے سوراخ کر کے بنائے تھے، یہ نہیں کہا کہ ٹکڑے توڑ کر بنائے تھے، حیدرآباد دکن کے علاقہ میں اس قسم کی تعمیر موجود ہے جن کو اجنٹا کیوز کہتے ہیں، میلوں مندر بنے ہوئے ہیں کہ سینکڑوں برس چاہئیں ان کو بنانے کے لئے اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ جتنے بت ہیں سب کی ناکیں کٹی ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد اتنی ہے کہ ناک توڑنے کے لئے بھی کئی برس چاہئیں۔ اس قسم کے شہر وہ بنایا کرتے

تھے۔ وادی میں۔ اس وادی کا نام وادی القری ہے۔ وفرعون ذی الاوتاد۔ اوتار
وتد کی جمع ہے وتد میخ کو کہتے ہیں۔ فرعون کے پاس اس قدر بڑے
لشکر تھے کہ ان کے ڈیروں کے لئے بے شمار میخیں تھیں۔ اس لئے ان کو میخوں
والے کہا۔ الذین تغو فی البلاد اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں
اور ملکوں میں سرکشی کر رکھی تھی۔ فاکثرو فیہا الفساد اور انہوں نے شہروں
میں بے شمار بدامنی اور فساد پھیلا رکھے تھے۔ فصب علیھم ربک سوط عذاب ان
پر تیرے رب نے عذاب کا کوڑا برسایا۔ سوط معنی کوڑا، صب معنی بہایا۔ مگر
اردو میں محاورہ بہانا نہیں ہے بلکہ برسایا بولتے ہیں۔ ان ربک لبالمرصاد مفسرین
نے کہا ہے کہ قسم اس بات پر کھائی ہے کہ تیرا رب گھات میں ہے۔ مرصاد کے
دونوں معنی ہیں۔ گھات یا وہ جگہ جہاں گھات میں بیٹھا جائے۔ یہاں دونوں
معنی لگتے ہیں۔ اکثر مفسرین یہ کہتے ہیں کہ پہلے معنی قریب ہیں اس لئے وہ معنی زیادہ
بہتر ہیں۔ بہرحال دونوں جواب قسم ہو سکتے ہیں۔ عذاب دینا یا گھات لگانا
یا گھات میں بیٹھنا۔ فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ اب
یہ گھات میں کیوں لگا ہوا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ انسان کیا کرتا ہے۔ انسان
کے عمل کو دیکھ رہا ہے۔ اچھا کرتا ہے یا برا کرتا ہے۔ جب اس کا رب اس کو امتحان
میں ڈالتا ہے۔ یا اس کی آزمائش کرتا ہے۔ پھر کیا کرتا ہے۔ اس کو اعزاز بخشتا
ہے اور اس کو دنیوی نعمتیں بخشتا ہے یا اس کو جاہ و مال دیتا ہے۔ تو انسان
کہتا ہے کہ میرے رب نے میرا اعزاز و اکرام کیا۔ یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں

جب اس کا امتحان کرتا ہے اور اس کے رزق میں کمی کر دیتا ہے تو کہتا ہے،
فیقول ربی اھانن میرے رب نے میری اہانت کی ہے۔ مجھے ذلیل و رسوا
کر دیا۔ اللہ اس گھات میں لگا ہے کہ انسان ایسی ایسی باتیں کہتا ہے۔ کلا ہرگز
نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے کہ دنیوی نعمتیں جس کو دی جائیں اس کا اکرام کیا اور
جس کا رزق تنگ کر دیا ان کی اہانت کی یہ بات نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو
تمام انبیاء کرام اور اولیاء اللہ اکثر تنگ حال رہے ہیں۔ تو چاہئے کہ اللہ نے
ان کی ذلت کی ہو اور اکثر فاسق و فاجر کو نعمتیں دنیوی حاصل ہیں تو چاہئے کہ
اللہ نے ان کا اکرام کیا اور وہ اللہ کے نزدیک معزز ہیں۔ نہیں یہ بات نہیں
ہے۔ یہاں ایک باریک بات ہے وہ سمجھ لیں۔ یہ جو زجر کیا ہے جھڑکا ہے اس
نے کہا تھا کہ فیقول ربی اکرمن میرے رب نے میرا اکرام کیا۔ تو بات صحیح
کہی تھی۔ اس پر جھڑکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یعنی اللہ نے اسے مال دیا اور
اس نے کہا کہ اللہ نے میرا اکرام کیا۔ مہربانی کی۔ عنایت کی۔ تو یہ بات صحیح اور
حق ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کہا کلا۔ جھڑکا ایسا نہیں ہے۔ تو مفسرین
نے یہ کہا ہے کہ کلا پچھلے ٹکڑے کے ساتھ لگتا ہے۔ یعنی جب روزی کی تنگی ہو
اور وہ یہ کہے کہ میرے رب نے مجھے رسوا کر دیا تو کلا اس کے ساتھ لگتا ہے۔ اور
جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بھی آپ دیکھ لیں۔ باپ اگر کسی وجہ سے تنگی کر
دے اور اس کے بیوی بچے کسی سے جا کر شکایت کریں۔ تو اس کو بے حد برا معلوم
ہوتا ہے۔ تو اس بنیاد پر جھڑکا جاتا ہے۔ خدا کی شکایت نہیں کرنی چاہئے۔
درحقیقت نفع اور نقصان جو کچھ پہنچ رہا ہے۔ سب اس کی طرف سے امتحان

ہے۔ وہ سب ابتلا ہے۔ نہ اکرام ہے نہ رسوائی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ کلا
دونوں کے لئے ہے۔ وہ بات تو اپنی جگہ صحیح ہے۔ مگر اس کا استعمال غلط کیا
ہے۔ اور استعمال کی غلطی یہ ہے کہ اس کو استحقاق سمجھا۔ مال جو ملا تو اکڑنے
لگا۔ کہ میں اس مال کا مستحق ہوں۔ چاہیئے اس کو یہ تھا کہ مال ملنے پر خدا کا شکر
ادا کرتا۔ اور اس کے حکم کے مطابق خرچ کرتا تب تو وہ ٹھیک تھا۔ تو دونوں جگہ
کلا لگتا ہے۔ بے عزتی گناہ ہے۔ پریشانی بے عزتی نہیں ہے بل لاتکرمون الیتیم
یہ قول ان کا باطل ہے بلکہ اس فعل سے زیادہ برا اور تشنیع فعل یہ ہے کہ وہ یتیموں
کی تکریم نہیں کرتے یہ ولا تحٰضّون علی طعام المسکین اور مسکین کو کھانا
کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے۔ ترغیب کی دو صورتیں۔ زبان سے لوگوں کو
اس کام پر اکسانا اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود اس نیت سے لوگوں کو کھلانا
کہ لوگوں میں دیکھ کر تحریص پیدا ہو اور ان کا دوسرا تشنیع فعل یہ ہے کہ
ا تاکلون تراث اکلا لما وتحبون المال حب جماً تراث یعنی میراث اکلا لما پورے طور پر
کھاتے ہو نہ حرام دیکھو نہ حلال۔ حلال و حرام کا مجموعہ سب کھا جاتے ہو۔ یعنی
میراث میں دوسروں کا حق دبا لیتے ہو اور کھا جاتے ہو۔ اور مال سے بہت
زیادہ۔ بے شمار محبت کرتے ہو۔ اس سے زیادہ برا فعل یہ ہے۔ اس کھاتے پر
خدا لگا ہوا ہے یہ بہت بری بات ہے۔ یتیم کا اکرام کرنا چاہیئے۔ مسکینوں
کو کھانا کھلانا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینا چاہیئے اور دوسروں کا حق
نہیں مارنا چاہیئے۔ اور مال سے محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ مال
ذریعہ ہے آسائش کا۔ ذریعہ محبت کے قابل نہیں ہوا کرتا بلکہ ذو ذریعہ۔ ذریعے

سے جو شے حاصل ہوتی ہے) وہ محبت کے قابل ہوا کرتی ہے۔ فرمایا یہ بات نہیں ہونی چاہیئے
پھر کیا بات ہونی چاہیئے۔ اذا دکت الارض دکّاً دکّاً۔ اس قت پر نظر رکھنی چاہیئے جب زمین
بالکل صاف ہو جائے گی۔ کوئی عمارت وغیرہ اس پر نہیں رہیں گی یا زمین ریزہ ریزہ ہو جائیگی
دکا دکا یکے بعد دیگرے اس کو کوٹ ڈالا جائیگا یا زمین ریزہ ریزہ ہو جائیگی۔ دکا دکا
یکے بعد دیگرے اس کو کوٹ ڈالا جائے گا۔ ریزہ ریزہ کر ڈالا جائے گا۔ وہ وقت
ہے اصل میں یاد رکھنے کا۔ وجاء ربک والملک صفا صفا اور جب تیرا رب آئے
گا۔ تیرے رب کا حکم آئے گا۔ تیرے رب کا ظہور ہوگا۔ تیرے رب کا قہر آئیگا
تیرے رب کا تسلط اور سلطان آئے گا۔ یہ سب معنی یہاں لگتے ہیں۔ اور قطار
در قطار فرشتے آئیں گے وجایئ یومئذٍ بجہنم اس روز اس جہنم کو لایا جائے
گا۔ ستر ہزار اس کی باگیں ہوں گی۔ اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے کھینچتے
ہوں گے۔ اور لاکر عرش کی دوسری جانب اس کو رکھ دیں گے اور سب لوگ
دیکھ لیں گے کہ اللہ نے جو وعدہ جہنم کا فرمایا ہے وہ سچا ہے اور ہمیں اس میں
جانا ہے۔ یومئذٍ یتذکر الانسان اس دن انسان غور و فکر کرے گا۔
تاسف کرے گا۔ نصیحت پکڑے گا۔ یہ سب معنی لگتے ہیں۔ وَاَنّٰی لَہُ الذِّکْرٰی
اس وقت ذکر سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ فان لہ منفعت الذکری ہے۔ ذکر
کی منفعت اس دن میسر نہیں آئے گی۔ چونکہ ذکریٰ اور تذکرہ دونوں یہاں مقابلہ
پر ہیں۔ مگر یہاں تذکر کی نفی نہیں ہے بلکہ اس کی منفعت کی نفی ہے۔ اس
وقت ایمان لانا بےکار اور تاسف کرنا بےکار۔ پھر کیا کہے گا۔ یقول یلیتنی

حیات (حیات آخرت) کے لئے پہلے سے سامان بھیج دیتا۔ تاکہ نہ میں جہنم میں جاتا اور نہ مردود ہوتا۔ یا یہ معنی ہیں کہ اپنی حیات کے زمانے میں بہترین سامان مہیا کر دیتا کہ وہ یہاں میرے کام آتا۔ فیومئذ لا یعذب عذابہ احد اس روز اللہ کے عذاب جیسا کوئی عذاب نہیں دے گا۔ ولا یوثق وثاقہ احد اور نہ اس کی جیسی کوئی بندش کرے گا۔ ایسا کوئی نہیں باندھے گا۔ اگر عذابہ کی ضمیر اللہ کی طرف پھری تب تو یہ معنی ہوں گے جو بیان کئے اور اگر انسان کی طرف پھری تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جیسا عذاب اس انسان پر ہوگا ایسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا اور جیسا وہ انسان بندھا ہوا ہے ایسی بندش کرنے والا کوئی نہیں یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ نفس کی تین قسمیں ہیں۔ نفس امارہ۔ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ یہاں نفس مطمئنہ سے خطاب ہے۔ اے نفس مطمئنۃ اپنے رب کی طرف رجوع کر کس حالت میں اللہ کی طرف واپس آ۔ راضیۃ مرضیۃ۔ ایسی حالت میں کہ تو خدا سے خوش بوجہ انعامات کے رہے اور خدا تجھ سے خوش رہے۔ فادخلی فی عبادی ہو جا میرے بندوں میں وادخلی جنتی اور داخل ہو جا میری جنت میں۔ ترجمہ پورا ہوگیا۔ اب جو باتیں تشریح طلب ہیں ان کو غور سے سنیں۔ پہلے یہ سمجھ لیں کہ مال روپیہ راحتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ تمام حیوانات کا روزی اللہ نے اپنے ذمہ رکھی ہے۔ اور انسان کی روزی اس کے اختیار میں رے دی ہے۔ کیونکہ یہ صاحب اختیار و اقتدار بننا چاہتا تھا۔ ورنہ اگر اس کی روزی بھی اس کے اختیار میں نہ ہوتی تو جیسے ...

روزی ملی تھی۔ آخر عمر تک اسی طرح اس کو ملتی رہتی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پیدا ہونے سے قبل اس کی روزی تیار کر دی جاتی ہے۔ ماں کا دودھ اور اس کی چھاتیاں پہلے سے بنا دیتا ہے اور اتنی غذا رکھ دی کہ کسی وقت خالی نہیں ہوتا۔ بچہ برابر پیتا رہتا ہے۔ دونوں کپوں کو اتنا بھر دیتا ہے کہ کسی وقت خالی نہیں ہوتے۔ وہ برابر کہتا رہا کہ اگر تم رزق میرے ذمہ رکھتے تو جیسے دو برس تک دیا ساری عمر دیتا رہتا۔ مگر تم نے کہا ہم خود کریں گے۔ تو اس نے تمہارے حوالے کر دیا کہ لو تم کر لو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب پریشان رہتے ہیں۔ اگر خدا کے پاس ہی رہتا تو یہ دقت نہ ہوتی۔ ومامن دابۃ لا تحمل رزقھا بہت سے چوپائے ایسے ہیں جو اپنی روزی لادے لادے نہیں پھرتے۔ یعنی کاروبار نہیں کرتے۔ سب کو نہیں کہا بعض کو کہا۔ یعنی بعض گھوڑے اونٹ بیل گدھا وغیرہ محنت کرتے ہیں تب روزی پاتے ہیں۔ پھر ان کو روزی کون دیتا ہے۔ اللہ یرزقھا اللہ ان کو روزی دیتا ہے۔ وایاکم اور تم کو بھی۔ جب کام نہ کرنے والوں کو روزی پہنچ رہی تو کام کرنے والوں کو بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ ان کو بھی روزی ہم ہی دیتے ہیں۔ تو وہ اگر ہمارے بتائے ہوئے قانون کے مطابق کام کریں گے تو ان کو روزی وافر ملے گی۔ اور رزق کریم ہوگا۔ ورنہ وہ معمولی رہ جائے گا۔ ملے گا ضرور مگر معمولی ہوگا۔ رزق کریم نہیں ہوگا۔ مال ذریعہ ہے۔ مقاصد کے حاصل کرنے کا۔ کھانا۔ کپڑا۔ مکان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور ان چیزوں کو انسان تن تنہا حاصل نہیں کر سکتا۔ یعنی ایک شخص اپنی ضرورت کے کل اسباب مہیا نہیں کر سکتا

یہ مدنی الطبع ہے۔ کچھ کام یہ کرے گا کچھ دوسرے کریں گے۔ اس میں شریعت ہے۔ ایک شخص اپنا کام دوسرے سے بدلے گا۔ تبادلہ کرے گا۔ تبادلہ غلہ کا مکان سے اور مکان کا غلہ سے ممکن نہیں ہے۔ اس میں دشواری سخت ہو گی۔ کپڑے والا کہے گا مجھے غلے کی ضرورت نہیں۔ غلہ والا کہے گا۔ مجھے کپڑے کی ضرورت نہیں اور دونوں ہلاک ہو جائیں گے۔ اس لئے تبادلے کے لئے ایک ضابطہ اللہ نے مقرر فرمایا اس کا نام ہے۔ سیم و زر۔ اس کا نام ہے سکہ۔ ہر شخص اپنی حاجتیں اس سکے سے بدلے پھر سکے سے اپنی حاجتیں پوری کر لے۔ تو سکہ تبادلے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں ہے۔ محبت کے قابل نہیں ہے۔ مثلاً چھری چھیلنے اور کاٹنے کا ذریعہ ہے۔ اگر ذریعہ نہ ہوتی تو خریدا نہ جاتا۔ چھری چونکہ محض ذریعہ ہے کاٹنے کا لہذا اس سے محبت نہیں کرنی چاہئے۔ محبت اس چیز سے ہو گی جس کو وہ کاٹ رہی ہے۔ ترکاری وغیرہ۔ یعنی مقاصد سے محبت ہونی چاہئے۔ ذریعہ سے نہیں اور جس شے کا یہ ذریعہ ہے در اصل وہ بھی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذریعہ ہے کسی اور چیز کا۔ کھانا مقصود نہیں ہے کیونکہ جب تک طالب کی ذات موجود ہے۔ مقصود کو بھی موجود ہونا چاہئے تو طالب کی ذات ۲۴ گھنٹے موجود ہے مگر کھانا موجود نہیں ہے۔ اگر ایک گھنٹہ بھی برابر کھاتا رہے گا تو مر جائے گا۔ دس پانچ منٹ کھاتا ہے۔ پھر چھوڑ دیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بھوک در اصل ایک عارضہ ہوا۔ اس عارضہ کو دفع کرنے کے لئے کھانا کھایا گیا اور جب وہ عارضہ بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ تو فوراً کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ تو جس طرح مال مقصود نہیں ہے۔ مال سے جو چیزیں حاصل کی جاتی

ہیں وہ بھی مقصود نہیں ہیں وہ بھی عارضے ہیں۔ بھوک و پیاس کے جب وہ عارضہ دور ہو جائیں گے۔ اب جو وقت بچے گا۔ وہ وقت کام کا ہو گا اور وہ جس کام کے لئے ہے۔ اصل میں وہ مقصود بالذات ہے۔ وہ عاقبت ہے۔ وہی شریعت ہے۔ وہی دین ہے۔ اس لئے مال سے محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ حضور صلعم نے فرمایا غادر رائح صبح آتا ہے شام چلا جاتا ہے۔ اردو میں کہتے ہیں کہ روپیہ آنی جانی چیز ہے۔ وہ اسی حدیث کا ترجمہ ہے۔ یہ تبادلے کے لئے ہے تبادلہ ہو گیا ضرورت پوری ہو گئی پھر اللہ کی یاد میں لگ جانا چاہئے اور اس مقصد میں مصروف ہو جانا چاہیئے۔ جس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ مال اصل مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ جسمانی لذتوں کا ذریعہ ہے اور جسم کے متعلق ہر شخص کو معلوم ہے کہ قبر میں ڈالا جائے گا۔ جلایا جائے گا۔ کیڑوں کی غذا بنے گا۔ اور برے سے برا اس کا انجام ہو گا۔ اس کے لئے کتنی محنت کرتا ہے دھوتا ہے صابن لگاتا ہے۔ عطر لگاتا ہے۔ یہ سب اس کی خاطر کرتا ہے۔ جو جانوروں کی غذا بننے والا ہے۔ تو جب یہی چیز (جسم) چھوٹ جائے گی۔ تو اس کے واسطے سے جو چیزیں حاصل ہیں وہ بدرجہ اولیٰ چھوٹ جائیں گی۔ انسان کے سب سے قریب یہی جسم ہے۔ بیٹا بدن کا جز ہے۔ بیوی احباب اولاد سب جسم کے بعد ہیں جسم ان سب پر مقدم ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر بچے کے جسم پر آگ لگ جائے اور باپ اس کو بجھانے کی کوشش کرے اور اس میں اس کا ہاتھ جلنے لگے تو فوراً بچے کو چھوڑ دے گا۔ اور پہلے اپنا ہاتھ بجھانے کی فکر کرے گا۔ اور پہلے اس کو بجھائے گا۔ اگر قتل کا وقت آئے گا تو ہرگز اپنے بیٹے کے مقابلے میں اپنا

کو پیش نہیں کرے گا۔ کسی جذبے کے تحت اگر قتل ہو جائے وہ اور بات ہے مگر آگ لگے گی تو پہلے اپنی ڈاڑھی کو بجھائے گا۔ اصل مقصد بدن ہی ہے اور بدن کا حشر اور انجام جو ہے وہ نظر کے سامنے ہے۔ کتنا برا ہے۔ تو جتنی چیزیں جسم میں دخیل ہیں۔ وہ عارضے ہیں یا ذرائع ہیں مقصود نہیں ہیں۔ جب جسم ہی مقصود نہیں ہے تو اور اس کے ذرائع اور عوارض مقصود کیسے ہو سکتے ہیں یہاں جتنی چیزیں اور لذتیں ہیں اسی بدن کے لیئے ہیں۔ کھانا اسی بدن کے لیئے مکان اسی بدن کے لیئے۔ کپڑے اسی بدن کے لیئے۔ مگر ذرا سی تکلیف ہو جائے تو سب کو چھوڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد اولاد بیوی ماں باپ سب آواز دیتے ہیں۔ کسی کا جواب نہیں دیتا۔ سب سے مونہہ موڑ لیتا ہے۔ اس وقت جس طرف منہ موڑ لیا ہے۔ اس طرف منہ اب موڑنا چاہیئے۔ اس وقت موڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ باپ منع کرے بیٹے سے سانپ نہ پکڑنا کاٹ لے گا۔ مر جائے گا مگر وہ نہ مانے اور جب سانپ ڈس لے تو چیخے کہ ابا اب کہا مانوں گا۔ تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ عمل کا وقت نکل چکا۔ اب حسرت ندامت اور تاسف کا وقت ہے۔ وہ علم جو عمل کا وقت گذرنے کے بعد حاصل ہو اس سے جہل بہتر ہے تو انسان کو مال و جاہ سے منہ موڑ لینا چاہیئے سوائے بقدر ضرورت۔ دلیل یہ ہے کہ ان دونوں کے انجام دیکھیئے۔ کھانے پینے کا کتنا برا انجام ہے۔ غذا کا کچھ رتی حصہ تو جزو بدن بن جاتا ہے باقی سب کا پیشاب اور پاخانہ بنتا ہے جو نہایت مکروہ چیز ہے۔ اب جو جسم ہے وہ کیڑوں کی غذا ہے۔ اس کو فوراً گھر سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ نجاست کو تو گوارہ کر لیتا ہے۔ مگر مردہ جسم کو ہرگز برداشت نہیں

راستے سے روک دیتے ہیں۔ غلط مضامین بنا کر اور طرح طرح کے دھوکے دے کر مال حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ اگر ہمارے علما اور مشائخ ایسا کریں تو وہ بھی ان میں شامل ہیں۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ (توبہ۔ ۳۴) اور یہ لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ دیتے ہیں۔ زمین میں۔ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ یعنی خدا کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق اس کو چکر نہیں دیتے۔ اور خرچ نہیں کرتے۔ زکواۃ کا ذکر نہیں ہے اپنے صرف سے زیادہ جو مال بچ جاتا ہے اس کو مارکیٹ میں لانا چاہیئے اس کو بنک میں جمع نہیں رکھنا چاہیئے آجکل جو تباہی آرہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ چھوٹی سی جماعت کے پاس اتنا روپیہ آگیا کہ انہیں پتہ بھی نہیں۔ اگر یہ روپیہ بازار میں آجائے۔ تو یہ کساد بازاری ختم ہو جائے۔ نظام عالم قائم رکھنے کے لئے اس کو گردش دو۔ زکواۃ دینے کے بعد زمین میں مت گاڑو۔ اگر تمام پہاڑوں کے کدالیں بند کر دی جائیں تو تعمیر بند ہو جائے گی۔ اسی طرح روپیہ بند ہو گا۔ نظام عالم بگڑ جائے گا۔ اور جو ایسا کریں گے۔ فبشرھم بعذاب الیم ان کو سخت عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ (توبہ۔ ۳۴) سخت وعید ہے۔ یوم یحمی علیھا فی نار جھنم جس روز ان کو تپایا جائے گا جلایا جائے گا۔ جہنم کی آگ میں فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ان کے ماتھے ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں سب کچھ تپایا جائے گا۔ ھذا ما کنزتم (توبہ۔ ۳۵) لانفسکم۔ یہ ہے جو تم نے اپنے نفسوں کے لئے جمع کیا تھا فذوقوا ما کنتم تکنزون چکھو اب تم مال کے جمع کرنے کا مزہ۔ اس لئے فرمایا مال سے (توبہ۔ ۳۵) محبت نہ کرو۔ مال سے بہت زیادہ محبت کرنا جڑ ہے تمام گناہوں کی فرمایا

حضور اکرمؐ نے چکنا پلاؤ کھا کر اگر شیشے پر پھونک ماردیں تو شیشہ دھندلا ہو جائے گا۔ اگر نکیلی چیز سے توڑیں تو کہیں کہیں کام آجائے گا۔ دنیا کی محبت اتنی بری چیز ہے کہ دل کے آئینہ میں اتنی کدورت پیدا ہو جائے گی۔ کہ کوئی چیز صاف نظر نہیں آئے گی۔ اگر شیشہ لگا ہو اور آپ منہ پھیرلیں تو چاہئے کہ پیچھے کی چیز نظر نہ آئے مگر سب نظر آتی ہے۔ سامنے آئینے میں اگر آپ کے نفس کا آئینہ صاف ہو گا تو کل کائنات جو لوح محفوظ میں پوری منعکس ہوتی ہے نفس اس کے سامنے ہو گا اور اس میں بھی پوری کائنات منعکس ہو گی۔ تو مقصد یہی ہے کہ نفس اتنا پاک وصاف ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اس کو حاصل ہو جائے اور اس کے قریب جانے کے قابل ہو جائے۔ یہ دھوکا لگا ہے۔ یہ دنیاوی لذتیں سب اس بدن کی لذتیں ہیں اور یہ عارضی ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے تو پہلا لقمہ بہت مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا اس سے کم اسی طرح آخری لقمہ میں بالکل مزہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ تو یہ لذائذ عارضی ہیں اور جسم کے لئے ہیں۔ جسم فنا ہو جائے گا۔ بے کار ہے۔ جس طرح اس جسم کی یہ روح ہے اسی طرح روح کی روح نور الٰہی ہے وہ پاک وصاف ہے اس لئے اس روح کو بھی جب وہاں جائے پاک وصاف ہونا چاہئے۔ جب تک روح میں نور الٰہی نہ ہو۔ روح مردہ ہے۔ لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتار دیتے۔ لرءیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ تو تو دیکھتا کہ یہ جھکتا اور خضوع کرتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا خدا کی ہیبت سے (حشر-۲۱)۔ پہاڑ میں کسی قسم کی کدورت نہیں ہے۔ اصل جو حجاب ہے وہ گناہ ہے اور بعد الٰہی ہے اللہ سے جتنا دور ہو گا۔ وہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس

لئے اس میں تجلی منعکس نہیں ہوگی۔ روح میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ ایک ننھا سا پودا ہوتا ہے۔ جس میں صرف دو پتے ہوتے ہیں۔ وہ پہاڑ کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔ روح نباتی سب سے کمزور روح ہے۔ اس سے قوی روح حیوانی ہے۔ اس سے قوی انسان کی روح ہے۔ انسان کی روح قرآن ہے۔ تو جب روح نباتی پہاڑ کو توڑ دیتی ہے۔ تو قرآن جو اعظم ارواح ہے۔ وہ اس کو کیوں نہ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ تو مال کی محبت کی مذمت کی۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے پھر مال کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ اگر استعمال صحیح ہوتا تو کم سے کم درجہ میں اس گناہ سے بچ جاتا۔ اب نفس مطمئنہ کے معنی سمجھ لیں۔ کیونکہ اور کوئی عقلی بحث کی آیت نہیں ہے۔ پہلے اطمینان کے معنی سمجھ لیں اس کے معنی استقرار اور ثبات ہیں تو جس نفس میں تغیر اور تذبذب نہیں ہے۔ ثبات و استقرار ہے وہی نفس آمنہ اور مطمئنہ ہے۔ اگر آپ کا لڑکا باہر ہے اور اس کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس کے کھانے رہنے کا اچھا انتظام ہے۔ تو آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اور اس اطمینان میں جو خوشی اور راحت ہے اس کے مقابلہ میں اس سے نیچے کے جتنے مدارج ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اصل چیز اطمینان ہے۔ آپ کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے آپ نے جائیداد خرید لی۔ بینک میں دس لاکھ روپیہ ہے۔ ایک لاکھ کی جائیداد خرید لی۔ اس وقت ادا نہیں کر سکتے چھٹی کا دن ہے۔ آپ نے فوراً چیک کاٹ کر دے دیا۔ یہ ہے اطمینان۔ دوسرا درجہ لوامہ تیسرا امارہ۔ یہاں تین قسم کی چیزیں ہیں۔ (۱) ایک ایسی چیز ہے جس میں تاثیر ہے تاثر نہیں ہے (۲) ایسی چیزیں ہیں جن میں تاثر ہی تاثر ہے

تاثیر نہیں ہے۔ (۳) تیسری ایسی چیزیں ہیں جن میں تاثیر اور تاثر دونوں ہیں یعنی فعل اور انفعال دونوں ہیں۔ پہلی چیز جس میں تاثیر ہی تاثیر ہے۔ تاثر قبول اور انفعال نہیں ہے اس کو خدا کہتے ہیں۔ دوسری جس میں تاثر ہی تاثر ہے۔ دوسرے میں تاثیر نہیں کر سکتے وہ جمادات ہیں جو ثقیل اور جامد چیزیں ہیں۔ ان میں تاثر ہوگا اور جوں جوں لطیف ہوتی جائیں گی تاثیر بڑھتی جائے گی۔ مثلاً پولی زمین میں اگانے کی تاثیر ہوگی۔ سخت زمین میں نہیں ہوگی۔ تیسری چیز جس میں تاثیر و تاثر دونوں ہیں وہ نفس انسانی ہے انسان کی روح ہے۔ ہر وقت ۲۴ گھنٹہ بدن میں اثر کر رہی ہے۔ جس عضو پر اثر کرنا چھوڑ دے وہ بے کار اور مردہ ہو جاتا ہے۔ خون کی اتنی تیز حرکت ہوتی ہے۔ کہ ایک سانس کے وقفہ میں پوری کائنات انسانی کا دورہ کر لیتا ہے۔ اگر ذرا رک جائے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور دل کے علاوہ کہیں اور رک جائے تو مہلک بیماری پیدا ہو جائے گی۔ تو روح برابر تاثیر کر رہی ہے۔ اس کے اندر زور ہے آواز ہے۔ جوش ہے، شدت ہے، بڑا جذبہ ہے اور حرکت ہے۔ دیوار کو ڈھائیں گے شور ہوگا۔ جب بن جائے گی سکون ہو جائے گا۔ جب بدن کی تدبیر کرتا رہے گا۔ برابر اس میں جوش غلبہ، اضطراب رہے گا۔ تو جب تک بدن کی تدبیر کرتا رہے گا کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوگا پریشان ہی پریشان رہے گا۔ اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خالق روح سے تاثر لے رہا ہے اور اس کی ضیا اور انوار حاصل کرنے کی اس میں قابلیت ہے تو جب تک اس کے انوار لیتا رہے گا سکون میں رہے گا۔ تاثیر میں سکون

نہیں ہے۔ تاثر میں سکون ہے۔ تو تجلی الٰہی میں سکون ملتا رہے گا اور کسی شئے میں تاثیر جب تک کرتا رہے گا۔ اس کو بے سکونی ملے گی۔ بے اطمینانی اور بے ثباتی رہے گی۔ دوسرے طریقہ سے سمجھیں جب کسی کے پاس ایک پیسہ نہیں ہوتا تو ایک پیسہ مانگتا ہے اور جب پیسے آنے لگتے ہیں تو پھر پیسہ نہیں ایک آنہ مانگتا ہے۔ اسی طرح اس کی خواہش بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب دو پیسہ ملنے لگتا ہے تو پیسہ دو پیسہ کی پرواہ نہیں کرتا۔ جتنا ملتا جاتا ہے، شہوت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ بڑھیا فقیر پیسہ دو پیسہ نہیں لیتا پھینک دیتا ہے تو یہ خواہش کسی جگہ بھی نہیں ٹھہرتی۔ جو لذت آپ کو ملے گی۔ دل چاہے گا اور اس سے بہتر مل جائے۔ جب وہ مل جائے گی۔ تو دل چاہے گا اور اس سے بہتر مل جائے۔ تو طلب کی حالت یہ ہے کہ کسی جگہ نہیں ٹھہرتی۔ ایک گز زمین ملے گی تو دو گز کی خواہش کرے گا۔ پھر وہ ملی تو اور زیادہ کی طلب کرے گا۔ طلب ساقط نہیں ہوگی برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ استقرار اور سکون نہیں ہوگا۔ اگر پوری کائنات بھی مل جائے گی۔ تب بھی ثبات وسکون نہیں ملے گا۔ کیونکہ مدارج ممکنات لاانتہا ہیں۔ کسی حد پر نہیں ٹھہرتے۔ ممکنات کے مدارج دونوں طرف لاانتہا ہیں۔ قدرت کمی میں بھی بیشی میں بھی دونوں طرف لاانتہائی ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ مل جائے اس پر اضافہ ممکن ہے۔ یعنی ہے یا ہو سکتا ہے تو اس کائنات میں کوئی ایسی شئے نہیں جس سے طبیعت مطمئن ہو۔ اب صرف خالق ممکنات رہ گیا ہے۔ اگر وہ مل گیا تو اب اس پر اضافہ ممکن نہیں

الا بذکر اللہ لتطمئن القلوب۔ آگاہ ہو جاؤ کہ ثبات و قرار صرف اللہ کے ذکر ہی سے ہوگا۔ اللہ کی ذات سے ہوگا (رعد-۲۸)۔ غیر اللہ سب مل جائیں گے تب بھی ثبات و قرار نہیں مل سکتا۔ یعنی اللہ جتنے عالموں پر قادر ہے اگر وہ سب بھی دے دے تو مطمئن نہیں ہو گا۔ خدا کے ملتے ہی طلب ساقط ہو جائے گی۔ نفس حرکت نہیں کرے گا۔ ٹھہر جائے گا۔ یہ نفس مطمئنہ ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو واصل کہتے ہیں۔ اور نفس لوامہ وہ ہے جو مدارج طے کرتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ تو جوں جوں بڑھ رہا ہے بعد بڑھتا جا رہا ہے۔ ترقی کے مدارج لا انتہا ہیں۔ ان کے مقابلے میں انتہا طے کئے تو وہ محض لاشے ہیں۔ جتنا آگے بڑھے گا۔ یہ معلوم ہوگا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ بہت نیچا ہے۔ یہی کہے گا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ گنہگار ہوں۔ خدا سے دور ہوں اپنے کو لعن طعن کرے گا۔ یہ سالک ہے صوفیت کی اصطلاح میں نفس امارہ واقف ہے۔ ٹھہر گیا۔ چند قدم چل کر رک گیا۔ کچھ طبیعت کے مطابق مقصد حاصل ہو گیا۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک۔ اے نفس مطمئنہ اللہ کی طرف لوٹ۔ راضیۃ مرضیۃ تو مجھ سے راضی ہو میں تجھ سے راضی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور مجھے توفیق عنایت فرمائے۔ اور نفس مطمئنہ عطا فرمائے۔ یہاں ذرا سا شبہ ہے۔ واذ قال ابراہیم رب ارنی جب کہا ابراہیمؑ نے کہ اے خدا دکھا مجھ کو کیف تحی الموتی تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا۔ قال اولم تؤمن (بقرہ-۲۶۰) کہا۔ کیا تو اس پر ایمان نہیں لایا کہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہوں قال بلی کہا ہاں کیوں نہیں میں اس پر ایمان تو لایا ہوں وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان مل جائے (بقرہ-۲۶۱)۔ یہ اتنا مشکل مقام ہے کہ اس کا کوئی

حل نہیں ہے۔ خلیل اللہ اور اس کو اطمینان قلب نہ ہو۔ اس پر جتنی رائیں ظاہر کی گئیں ہیں۔ سب وقت ضائع کیا۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ایمان اور چیز ہے اور اطمینان قلب اور چیز ہے۔ ۱۵، ۲۰ مفسرین نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور سب نے اپنی اپنی رائے دی ہے۔ لیکن مضمون کو دوسری طرف پھیر دیا ہے۔ اطمینان خدا کی ذات قدرت وصفات کے متعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایک بڑے امام نے یہ کہا ہے کہ جس طرح قوم رسول سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی صداقت کا معجزہ لاؤ اسی طرح نبی یہ مطالبہ کرتا ہے خدا سے کہ ایسا معجزہ بھیج کہ میں یہ سمجھ جاؤں کہ تو خدا ہے اور میں تیرا بھیجا ہوا ہوں۔ تو یہاں یہ کہا کہ تو مردوں کو جلا کر دکھا تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ تو خدا ہے اور میں تیرا رسول ہوں اس آیت کی یہ سب سے بڑی تاویل ہے کہ اطمینان ہے اپنے رسول ہونے کا۔ اور یہ سب سے بہتر تفسیر ہے۔ یہ ہمارے سلسلے کے ہم استادوں کے استاد ہیں یہ بہت بڑے بزرگ اور بہت بڑے عالم دین میرے اوپر انکی بہت برکت ہے۔ اور دعا ہے۔ یہ انہوں نے فرمایا۔ مگر بات صحیح نہیں ہے۔ غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ مطالبہ اس سے کر رہے جس سے پہلے دل مطمئن ہو گیا۔ آپ اس سے دعا کر رہے ہیں۔ جب اس کو اس قابل سمجھ لیا جب ہی تو اس سے دعا کر رہے ہیں ورنہ اس سے کیوں کہتے۔ اللہ ان پر اتنی رحمت نازل کرے جتنی مغرب ومشرق کے درمیان ہے۔ انہیں دھیان نہیں رہا۔ ان کے سامنے ہمارا علم بحر میں قطرہ جتنا بھی نہیں ہے۔ بھول اور غلطی ہو گئی۔ جس سے بھول نہ ہو بس وہ نبی ہے۔ نبی کے علاوہ سب سے غلطی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اثبات اور قرار مکان پر ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیشہ خدا پر ہو گا۔ جب خدا کے

سامنے پہنچے گا اطمینان ہوگا۔ اور جوں جوں ہٹتا جائے گا بے اطمینانی بڑھتی چلی جائے گی۔ اس میں کوئی قید نہیں۔ نبی ہو۔ صدیق ہو۔ مومن ہو۔ سب کا حال یہی ہے۔ جب تک وہ خدا کے سامنے ہے اس تک پہنچ رہا ہے۔ مطمئن ہے اور جب وہ خلق کی طرف متوجہ ہوگا کیف تحی الموتیٰ جب وہ مردوں کے احیاء خلق کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں سے ہٹے بے اطمینانی ہوگئی۔ جس وقت وہ احکام الٰہی خلق کو پہنچائیںگے ان کو اطمینان نہیں ہوگا۔ ڈریں گے۔ ہر قسم کی بات ہوگی۔ ماقی نفسہ خیفۃ موسیٰ۔ جونہی جادوگرنے رسیاں پھینکیں تو موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے۔ (طٰہٰ - ۶۷-۶۸) اتنا جلیل القدر نبی مطمئن ہونا چاہیئے تھا۔ نہیں وہ جادوگروں کے تماشے کی طرف متوجہ ہوگئے ڈر گئے اگر اس وقت بھی خدا کی طرف متوجہ ہوتے تو ڈر نہ لگتا یا موسیٰ لا تخف اے موسیٰ مت ڈرو۔ انی لا یخاف لدیَّ المرسلون مرسلوں کو ڈرنے سے کیا کام۔ میرے رسول نہیں ڈرا کرتے۔ (نمل - ۱۰) یہ بہت اچھی بات ہے جو خدا نے مجھے سمجھائی اور میں نے بیان کر دی۔ مجھ سے پہلے یہ بات کسی نے نہیں کہی۔ اولیاء اللہ ہوں۔ نبی اللہ ہوں۔ جب تک خدا کے سامنے رہتے ہیں ان کو اطمینان رہتا ہے۔ نہ انہیں خوف ہوتا ہے نہ حزن ہوتا ہے اور جب وہ مخلوق کی طرف آتے ہیں اور ان کو امر الٰہی پہنچاتے ہیں۔ تو جو حالات مخلوق پر گذرتے ہیں ان پر گزرتے ہیں۔ خوف، حزن، ڈر سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ بالکل نئی بات ہے۔ بہت باریک مسئلہ تھا حل ہوگیا۔ اب آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ پھر نبی صلعم پر درود و سلام پڑھیں اور پھر دعا کریں کہ سب کو اور مجھ کو اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ عطا فرمائے۔ آمین۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۙ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۙ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۙ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۙ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۗ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۙ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۙ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۗ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۙ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۚ ۱۵ الشمس - ۹۱

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی یا اس وقت کی جب وہ اوپر چڑھ
جاتا ہے۔ ضحٰی۔ ضیار یا وقت جب وہ اوپر چڑھ آتا ہے اور قسم ہے قمر کی جب وہ
پیچھے آتا ہے (سورج کے) اور قسم ہے دن کی جب وہ ظاہر کر دیتا ہے۔ روشنی کر دیتا
ہے اور قسم ہے رات کی جب ڈھانک دیتی ہے۔ قسم ہے اس آسمان کی اور قادر قدیر
کی جس نے اس آسمان کو بنایا یہ ما من کے معنی ہیں۔ اور قسم ہے زمین کی۔ اور اس
ذات کی جس نے اس کو پھیلا دیا۔ طحٰہا کے معنی ہیں پھیلا دینا اور نفس کی اور اس
ذات کی جس نے اس کو ٹھیک ٹھاک کیا درست کیا اور اس میں قوائے روحانیہ
پہنچ گیا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں اس کا فسق و فجور اور تقویٰ اور طہارت
ڈال دیا۔ الہام معنی یک بیک دل میں کسی شے کا ڈال دینا۔ اتنی قسمیں کھائی ہیں
تو مضمون بڑا اہم ہے جس پر اتنی کثیر قسمیں کھائی ہیں اور صرف اس بات پر کھائی
ہیں کہ کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ جس شخص نے تزکیہ
کر لیا وہ اپنی مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور نامراد ہوا وہ شخص جس نے
اپنے نفس کو لتھیڑ دیا۔ دسس لفظ ہے اس کے معنی چھپانا اور مخفی کرنا۔ کمالات
ظاہر نہیں ہوئے۔ اور سب عیب ہی عیب ظاہر ہوئے۔ اس کی مثال دی کہ
ثمود نے جھٹلایا۔ سرکشی کی وجہ سے اپنے رسول کو۔ صالح کو بھی جھٹلایا اور جو
انہوں نے عذاب کی خبر دی تھی اس کو بھی جھٹلایا۔ جب ان میں سے جو سب

سے بڑا شقی تھا اٹھ کھڑا ہوا اللہ کے رسول نے ان سے کہا ناقۃ اللہ یہ کلمہ
ڈرانے کے وقت بولا جاتا ہے۔ بچو ڈرو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی کی
باری کے دن سے۔ ایک دن پانی اونٹنی کو ملتا تھا۔ اور ایک دن ان کے مویشیوں کو
ملتا تھا۔ تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ اونٹنی سارا پانی پی جاتی ہے۔ اور ان کے مویشیوں
کو کم پڑتا ہے۔ اس لئے مخالف ہو گئے تھے۔ اور کاٹنا اس کو چاہتے تھے۔ تو حضرت
صالح نے ان کو ڈرایا۔ ایسا نہ کرنا ورنہ عذاب آجائے گا۔ مگر انہوں نے ان کو
جھٹلایا۔ ان کی بات نہیں مانی اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ پھر ہلاک کر دیا ان
کے رب نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر عذاب بھیجا اور ہلاکت میں سب
کو برابر کر دیا۔ چھوٹا بڑا، بچہ سب کو ہلاک کر دیا۔ دمدم معنی ڈھا نکنا یا پیوند زمین
کرنا۔ تہس نہس کر دیا۔ اور اس کو ان کے اس برے انجام کی کچھ پرواہ نہیں ہوئی
اللہ پاک نے اتنی قسمیں کھا کر بتایا کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ اپنے مقصد
میں کامیاب ہو گیا اور جس نے پاک نہیں کیا اور نفس کو لتھیڑ لیا وہ نامراد ہو
گیا۔ تباہ ہو گیا۔ اور ایسے بہت سی جماعتیں تھیں جو ہلاک و برباد ہو گئیں۔ ان
میں سے ایک کی مثال دیدی کہ انہوں نے اپنے نفس کا تزکیہ نہیں کیا اور وہ ہلاک
ہو گئے اور نامراد ہو گئے۔ تو اب یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ فالہمہا فجورہا وتقوٰیہا
اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ نے فسق و فجور، اور تقویٰ وطہارت
دل میں پیدا کر دیا کہ بندہ کے فعل کا خالق خدا ہے۔ تو الہمہا کے معنی انہوں نے
یہ لئے کہ دل میں یا نفس میں فسق و تقویٰ پیدا کر دیئے۔ اس نے جتنی قسمیں کھائی
ہیں۔ سب مخلوق ہیں۔ ان کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح فسق و فجور اور

طہارت و تقویٰ کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا نے ہی انسان کے افعال بھی پیدا کئے ہیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ فجور اور تقویٰ پیدا نہیں کیا بلکہ یہ اس کو سمجھا دیا۔ الہام کے معنیٰ افہام کے لیتے ہیں۔ حلال و حرام حسن و قبح نیکی اور بدی سمجھا دی کہ یہ یہ ہے اور وہ یہ ہے اور دونوں پر قدرت دیدی کہ جو چاہے اختیار کر۔ یعنی انسان کے نفس کو سمجھا دی کہ یہ اچھی چیز ہے۔ یہ بری چیز ہے۔ اور دونوں میں سے ہر ایک کو حاصل کرنے کی قدرت دیدی یہ ہے عقیدہ معتزلہ، قدریہ یا اہل اعتزال کا۔ یہ تینوں ان کے نام ہیں۔ اور اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ قد افلح من زکٰھا جس نے درست کر لیا اپنے نفس کو وہ کامیاب ہو گیا۔ تو اس کو سمجھایا ہے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ جو چاہے اس کو پاک کر لے اور جو چاہے ناپاک کر لے۔ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بندہ اپنے فعل کا خالق نہیں ہے تو مدح و ذم ثواب و عتاب جنت و دوزخ کا مسئلہ بیکار ہو جاتا ہے۔ جب خدا ہی فسق و فجور پیدا کرتا ہے تو بندے کو جزاء و سزا کے کیا معنیٰ؛ اس وجہ سے قرآن میں جو آیات اس قسم کی ہیں ان کی تاویلیں کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ بندہ کو اس نے اچھائی کرنے یا برائی کرنے دونوں کی قدرت دے دی۔ اب برائی کرنے کی قدرت دینا ایسا ہی ہے۔ جیسا اس کو خود پیدا کر دینا۔ دونوں برابر ہیں۔ کچھ فرق نہیں ہے۔ کسی کو چھری سے قتل کرنا اور کسی کو چھری دینا کہ تو اس کو قتل کر دے۔ جب کہ وہ اچھی طرح یہ جانتا ہو کہ یہ ضرور قتل کر دے گا۔ ایسی حالت میں چھری دینا یا خود قتل کرنا دونوں برابر ہیں۔ یعنی فعل کرنا یا فعل کا [illegible]

کے فعل کا ہونا ہوا دیکھنا تینوں برابر ہیں۔ کوئی فرق نہیں اللہ کا فسق وفجور پیدا کرنا اور فسق وفجور پیدا کرنے کی قوت دینا یہ جانتے ہوئے کہ یہ طاقت فسق وفجور میں استعمال کرے گا۔ اس کو فسق وفجور کرتے ہوئے دیکھنا اور اس سے اس کو نہ روکنا۔ یہ تینوں برابر ہیں۔ اس تاویل سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ تاویل بیکار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بندہ نے اپنے اختیار سے کیا تو اللہ کو یہ قدرت ہے کہ اس کو برے فعل سے روک دے۔ اور پھر بھی اس نے برے فعل کرنے والے کو نہیں روکا اور اسے کرتا ہوا دیکھتا رہا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اسی کی منشار سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہر صورت میں جبر ہے۔ لہٰذا معتزلہ کا یہ عقیدہ غلط ہے۔ جبر سے کسی صورت میں نجات نہیں ملتی۔ اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ اختیاری فعل انسان اسی وقت کر سکتا ہے۔ جب اس کو اختیار حاصل ہو۔ اختیار اگر بغیر سبب کے ہوگا تو کائنات بے سبب کے ہو جائے گی۔ اور خالق کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یا پھر سبب سے ہوگا۔ اس صورت میں سبب یا بندہ ہوگا یا خدا ہوگا۔ اگر سبب بندہ ہے۔ تو بندے کو اس اختیار کو پیدا کرنے کے لئے ایک اور اختیار کی ضرورت ہوگی۔ اور اس اختیار کے لئے ایک اور اختیار ہوگا اور اسی طرح یہ سلسلہ لا انتہا جائے گا۔ اور تسلسل لازم آئے گا۔ جو محال ہے۔ اختیار بھی تو ایک فعل ہی ہے نا۔ اس لئے بندہ اپنے اختیار پر قادر نہیں ہے اپنے اختیار سے اس اختیار کو پیدا نہیں کرتا۔ جس اختیار کا یہ نتیجہ اچھا یا برا فعل ہے۔ لہٰذا ایک ہی صورت رہ گئی کہ بندے کے اختیار کا سبب خدا ہے۔ وہی بندہ میں اختیار کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس اختیار کے بعد وہ اچھا یا برا فعل

کر دیتا ہے۔ تو ہر صورت میں خدا ہی خالق ہوا۔ یہ عام دلیل ہے اور تمام آئمہ اور علمار مختلف عنوانوں سے یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ فعل اور چیز ہے اختیار اور چیز ہے۔ فعل کے لئے اختیار چاہیئے۔ اختیار اگر فعل ہوتا تو اس کے لئے اختیار ہوتا۔ حرکت سکون نماز روزہ چوری یہ سب فعل ہیں اور ان کو انسان اپنے اختیار سے کر رہا ہے۔ اختیار ایسی چیز نہیں ہے۔ جیسی کہ یہ ہیں۔ ان میں اور اختیار میں فرق ہے۔ اختیار فعل کا مبدا ہے۔ اختیار قوت کا نام ہے۔ قوت فعل نہیں ہے۔ اگر وہ فعل ہوتی تو اس کے لئے اختیار کی ضرورت پڑتی بلکہ وہ اختیار بذاتہٖ ہے اور اس اختیار سے وہ فعل کر رہا ہے۔ اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار پیدا کیا ہے۔ اس کا اس کو شعور نہیں ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اختیار مجھ میں ہے۔ جو فعل وہ کر رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ یہ اس کے شعور میں بالکل نہیں ہے کہ یہ اختیار خدا پیدا کر رہا ہے۔ یہ اس کے اندر غلطی ہوئی ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (ق ۱۶) ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں جو وسوسے ان کا نفس ان کے دل میں ڈالتا ہے۔ وسوسے کی نسبت نفس کی طرف کی۔ اس کے دل کی طرف اس کی ذات کی طرف۔ اس کے خیال کی طرف اس کے عقل کی طرف نسبت کی اللہ نے وہ خوب جانتا ہے کہ میرا نفس میرا دل اور میری عقل یہ کہہ رہی ہے۔ وہ اس کو اپنی چیز سمجھ رہا ہے۔ دوسرے کا عطیہ نہیں سمجھ رہا ہے بلکہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے کیا۔ یہ بات تو ضرور جانتا ہے کہ اللہ نے مجھے پیدا کر دیا۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ جو قوت اس کو دی ہے۔ وہ اللہ اپنی قوت سے

استعمال کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ اصول صحیح نہیں ہے۔ اس اصول پر مدح وذم ثواب وعتاب۔ امر ونہی۔ تکلیف۔ رسالت نبوت سب غلط ہو جائیں گے۔ اگر بندہ کے فعل کا خالق خدا ہوگا تو یہ نظام امر ونہی۔ مدح وذم سب باطل ہو جائے گا۔ کیونکہ جب بندہ سے سوال ہوگا کہ یہ تو نے کیوں کیا۔ وہ یہ جواب دے گا میں نے کچھ نہیں کیا یہ سب کچھ تو نے خود ہی کیا ہے۔ تو ہی اس فعل کا خالق ہے۔ اب ان کا یہ کہنا کہ بندہ کے ہر فعل کا خالق خدا ہے یہ دلیل سے ثابت ہو گیا تو بے شک عقلی اور شرعی دلیل سے یہ ثابت ہو گیا۔ واللہ خلقکم وما تعملون اللہ نے تم کو پیدا کر دیا اور تمہارے افعال کو بھی پیدا کر دیا۔ (صفٰت۔۹۶) یہ حق ہے اور بالکل حق ہے۔ لیکن انسان کو اس کا شعور نہیں ہے کہ اس کے فعل کو اللہ نے پیدا کیا۔ جیسا اس کا شعور ہے کہ درخت کو چیل کو، کوے، بندر کو اللہ نے پیدا کیا یعنی اللہ انسان کے فعل کا خالق ہے۔ اس کا اس کو شعور نہیں ہے بلکہ دلیل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ اس لئے اب کوئی دقت نہیں ہے۔ کیونکہ جس جگہ وہ فعل کا خالق ہے اس کا اس کو شعور نہیں ہے۔ اور جس جگہ شعور ہے وہاں وہ یہ جانتا ہے کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ وہاں خدا یہ نہیں کہتا کہ میں نے چوری کی یا میں نے چوری کو پیدا کیا یہ کہیں نہیں کہتا کہ یہ فعل میں کر رہا ہوں۔ نہ قرآن میں ہے نہ عقلی دلیل سے یہ ثابت ہو رہا ہے۔ انسان کے شعور میں یہ خالق ہے یہ اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ اب کوئی اعتراض نہیں باقی رہتا۔ جبر جب ہوگا۔ جب اس کے شعور میں جبر آ جائے۔ جیسے تلوار گردن پر رکھ دے اور کہے کہ پڑھ کلمہ کفر کا تو وہ مجبور ہے۔ وہ اگر کلمہ کفر کہے گا تو وہ جانتا ہے کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ اور وہ مجبوراً کہہ رہا ہے۔

مگر یہ کروڑوں کافر جو کفر کر رہے ہیں تو ان میں اور اس میں فرق ہے یا نہیں۔ اہل سنت والجماعت جس کو یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا پیدا کر رہا ہے اس کو یہ اپنے شعور میں یہ سمجھ رہا ہے کہ میں پیدا کر رہا ہوں۔ جب وہ جبر کو یہ سمجھ گیا کہ یہ میں پیدا کر رہا ہوں تو اس پر اس کی ذمہ داری آگئی کہ تو نے یہ کیا تو اس کی یہ سزا اور تو نے یہ کیا تو اس کا یہ انعام اور اس پر وہ راضی ہے۔ کوئی چور یہ نہیں کہتا کہ چوری میں نے نہیں کی۔ وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے غلطی کی اور اس پر نادم ہے اور سزا جو اسے ملتی ہے اس کو ٹھیک سمجھتا ہے فالھمھا فجورھا وتقوٰھا کے یہ معنی ہیں کہ یہ اس نے عالم واقع میں پیدا کی ہے۔ اس کے شعور میں نہیں ہے۔ اگر اس کے شعور میں فسق و فجور اور تقویٰ ہوتا تو تعلیم کی ضرورت نہ پڑتی۔ جیسے بچہ ہے۔ اس نے پیدا کر دیا۔ اس کے شعور میں ہے وہ فوراً دودھ منہ میں لے لیتا ہے۔ دفعتاً الہام ایسا ہوتا ہے۔ اگر بچے کو کھڑا کر دو تو اپنے سہارے کے لئے فوراً ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ کپڑا یا ہاتھ وغیرہ پکڑنے کے لئے یا تجربی الہام ہوتا ہے۔ کتا ہے اس کو روٹی ڈالیں دوڑ کر آتا ہے پتھر اٹھائیں بھاگ جاتا ہے۔ اس کو الہام ہوتا ہے کہ یہ لگنے کی چیز ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الہام کر دیا اگر الہام ہو جاتا تو اس میں اشتراک ہو جاتا کبھی اس کے خلاف فعل نہ کرتا۔ یا سب فاسق ہی ہو جاتے یا متقی ہو جاتے۔ مگر جب اختلاف موجود ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہے کہ ایک شے نہیں ہے بلکہ دو چیزیں ہیں اور جہاں دو چیزیں ہوں گی۔ وہاں جبر نہیں ہوگا۔ اختیار ہوگا۔ ایک چیز پر مجبور ہوتا ہے۔ دو چیزوں پر مجبور نہیں ہوتا مختار ہوتا ہے۔ یہ نکتے کی بات ہے۔ یا تو فعل ہی فعل ہوتا

یا ترک ہی ترک ہوتا۔ جیسے بکری کا بچہ کبھی کباب نہیں کھائے گا۔ جو اس کی غذا ہے وہی لے گا۔ اس کے خلاف کبھی نہیں لے گا۔ وہاں ایک ہی چیز ہے، جبر ہے۔ مگر یہاں ایک نہیں دو چیزیں ہیں۔ یہاں جبر نہیں ہو سکتا۔ منہ میں اس کے کچلیاں ہیں وہ اس کا پتہ دیتی ہیں کہ یہ گوشت کھائے گا۔ اور دھاڑیں بتاتی ہیں کہ یہ سبزیاں کھائے گا۔ دونوں چیزیں کھائے گا۔ گوشت بھی اور سبزی بھی۔ شیر بلی کتے کے سامنے پھل ڈالیں کبھی نہیں کھانے کے وہاں ایک ہی شئے ہے۔ جہاں ایک چیز نہ ہو بس وہی اختیار ہے۔ اور وہ دلیل جو انہوں نے اختیار کی تھی صحیح نہیں ہے۔ ورنہ تکلیف و رسالت نبوت سب ختم ہو جائے گی۔

اب دیکھئے قد افلح من زکھا۔ کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ یہاں دو باتیں سمجھنی ہیں کامیابی کسے کہتے ہیں اور نفس کی پاکی اور طہارت کیا شے ہے۔ کونسی گندگی ہے۔ جس گندگی سے نفس کو پاک کیا جائے گا۔ پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ کامیابی کس شئے کا نام ہے۔ یہاں جتنی راحتیں اور آسائشیں ہیں اور ان کے جتنے اسباب ہیں ان کے حاصل کرنے میں اپنا سب وقت خرچ کر دیتا ہے۔ ان راحتوں کے جتنے اسباب ہیں ان کا سبب ظاہر میں مال ہے یعنی مال کل نعمتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور کل نعمتیں سبب راحت ہیں مکان ہے۔ کپڑا ہے۔ روٹی ہے۔ یہ سب نعمتیں لذت کا سبب ہیں اور مال ان سب کا ذریعہ ہے۔ یعنی مال فی نفسہ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذریعہ ہے۔ ان سب کے حاصل ہونے کا۔ یہ تبادلے کا ذریعہ ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس زندگی کے تمام اسباب خود مہیا نہیں کر سکتا۔ کچھ اسباب ایک جماعت مہیا کرتی ہے

اور کچھ دوسری جماعت مہیا کرتی ہے اور ہر شخص کو کل اشیاء کی ضرورت ہے اس لئے تبادلے کے لئے جو چیزیں مقرر ہیں ان کا نام قیمتیں یا سکہ ہے۔ ان کے ذریعے وہ تبادلہ کرتا ہے۔ ایک آدمی کپڑا بناتا ہے۔ دوسرا آدمی روٹی بناتا ہے۔ روٹی والے کو کپڑے کی ضرورت ہے اور کپڑے والا کہتا ہے کہ مجھے روٹی نہیں چاہئے۔ اس دقت کو دور کرنے کے لئے تبادلے کے لئے قیمتیں مقرر کی گئی ہیں۔ تاکہ اس قیمت کے ذریعہ ہر شخص اپنی حاجت کو بدلے اور پھر اس قیمت سے اپنی حاجتوں کو پورا کرلے۔ اس طریقہ پر یہ سکہ اور سکے کی قیمت مقرر ہوئی۔ روپیہ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ حاجتوں کے تبادلے کا ذریعہ ہے۔ تو جتنی لذتیں اور راحتیں ہیں ان کے حاصل کرنے کا ذریعہ روپیہ اور مال ہے۔ مال فی نفسہ مقصود نہیں ہے۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو ۲۴ گھنٹے اس کے حصول میں مبتلا رہتا۔ مگر نہیں رہتا۔ کھانے پینے میں دھوکہ لگا ہے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ مقصود ہے۔ یہ مقصود نہیں ہیں۔ اگر یہ مقصود ہوں تو ۲۴ گھنٹے کھاتا رہے، ۲۴ گھنٹے پیتا رہے، ۲۴ گھنٹے آرام کرے۔ یہاں جتنے سکھ ہیں۔ ان میں ۲۴ گھنٹے مبتلا رہے۔ لیکن نہیں رہتا تو معلوم ہوا کہ یہاں کوئی سکھ ایسا نہیں ہے۔ جو ۲۴ گھنٹے حاصل ہو۔ یا حاصل کرنے کو دل چاہے، دو منٹ، چار منٹ اور دس منٹ آدھ گھنٹہ۔ بس اس کے بعد پھر خالی۔ انسان کھانے کے وقت بھی موجود ہے۔ اور خالی وقت میں بھی موجود ہے۔ دونوں وقتوں میں انسان موجود ہوتا ہے۔ اگر راحت اس وجود کا تقاضہ ہوتی تو وجود سے جدا نہ ہوتی لیکن وہ جدا ہو جاتی ہے۔ اور زیادہ دیر تک جدا رہتی ہے۔

تو اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ مقصد اصل میں نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح مال راحتوں کا ذریعہ ہے۔ راحتیں بھی کسی اور مقصد کا ذریعہ ہیں۔ اجزاء جسمانی تحلیل ہونے لگتے ہیں تو ان کی تحلیل کو رد کرنے کے لئے یہ غذا پہنچائی جاتی ہے اور پانی ان غذاؤں کو رقیق کرنے کے لئے پہنچایا جاتا ہے۔ اور شادی نسل کو باقی رکھنے کے لئے کی جاتی ہے۔ مقصد نہ یہ ہے نہ وہ کیونکہ اگر یہ مقصود ذات کا ہوتے تو اس سے جدا نہ ہوتے۔ جب یہ ملتے فوراً حاصل کر لیتا۔ سب سے زیادہ ضروری ہوا ہے۔ مگر وہ بھی ہر وقت نہیں حاصل کرتا۔ سانس لیتا ہے۔ ہوا اندر جا کر قلب کو پھیلاتی ہے۔ اس کی گرمی کو چوستی ہے۔ پھر وہ باہر پھینکی جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ہوا کو اندر لیتا ہے۔ تو اس میں بھی تھوڑا سا وقفہ ہے۔ یہ بھی ہر وقت مقصود نہیں ہے۔ تو دنیا میں ایسی راحت کوئی نہیں ہے۔ جو مقصود ہو۔ اس میں مغالطہ ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ راحت سبب لقا بنتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ ہر آن باقی رہے۔ اگر جہاز میں مال و دولت لدی ہوتی ہے اور جہاز ڈوب جائے تو جان بچانے کی فکر کرتا ہے۔ مال و دولت کی کچھ فکر نہیں ہوتی۔ ہر آن لقا چاہتا ہے۔ تو یہاں صرف یہی لقا ایسی شے ہے۔ جو ہر وقت مطلوب ہے۔ اور کوئی شے نہیں ہے۔ اور جتنے سامان یہاں ہیں سب لقا ہی کے لئے ہیں۔ تو اس میں دھوکا لگا ہے۔ یہ لقا عارضی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر بھوک لگتی ہے۔ اور غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوام نہیں ہے۔ اس کو۔ تو اس میں ہلکی سی تجلی لقا کی ہے۔ کھانا پینا اور جتنی راحتیں ہیں۔ ان میں ذرا ذرا سا اثر لقا کا ہے۔ لیکن دوام نہیں ہے۔ ہمیشگی

نہیں ہے۔ مستقل نہیں ہے۔ عارضی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے ہے۔ جس طرح
چاند کی تلاش ہو وہ آسمان میں نظر نہ آئے اور حوض میں اس کا عکس نظر آجائے
تو اگر اس کو حاصل کرنے کے لئے حوض میں کود پڑے گا تو چاند تو اس کو حاصل
نہیں ہوگا مگر پانی میں ڈوب مرے گا۔ اسی طرح دنیا کی راحتوں میں جہاں بقا کی
صرف تجلی ہو رہی ہے۔ ان میں اگر بقا تلاش کرے گا اور ان میں کود پڑے گا تو بقا
تو اس کو ملے گی نہیں مگر ہلاک ضرور ہو جائے گا۔ اب اس کی تدبیر کیا ہے۔ جس
طرح حوض میں چاند کا عکس پڑ رہا ہے۔ جب تک عکس کو دیکھتا رہے گا۔ چاند اس
کو کبھی نظر نہ آئے گا۔ اگر چاند کے عکس سے نظر ہٹالے گا۔ تب ہی چاند کو دیکھ سکے
گا۔ اسی طرح دنیا کی راحتوں میں بقا کی تجلی کی طرف جب تک دیکھتا رہے گا ابدی
راحت اس کو میسر نہ آئے گی۔ ابدی راحت حاصل اسی وقت ہوگی۔ جب وہ ان
راحتوں سے منہ موڑ لے گا۔ اس مثال سے بات بہت واضح ہوگئی ونھی النفس
عن الھویٰ ہوا سے اپنے خواہش سے اپنے نفس کو روکا۔ خواہش کا تقاضہ یہ ہے کہ پانی
میں جو تجلی چاند کی ہو رہی ہے اسے دیکھتا رہے۔ جب اس سے منہ پھیر لے گا منہ
پھیرتے ہی چاند نظر آجائیگا۔ اسی طرح جب خواہش نفسانی سے منہ پھیرلے گا تو
مقصد اصلی سامنے نظر آجائیگا۔ تو مقصود بالذات کیا چیز ہے۔ دوام راحت۔ اس
دوام راحت کا مصداق کیا ہے۔ اسے ایک اور مثال سے سمجھ لیں۔ جن لوگوں کو میری
بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ مجھ سے خوش ہوتے ہیں۔ اور ان کی خوشی سے مجھے خوشی
ہوتی ہے اور میں چلا آتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ خوش ہوں
اصل مقصد جو ہے وہ خوشی ہے۔ اگر آپ سے بڑے عالم لوگ یہاں آجائیں اور

وہ بھی آپ ہی کی طرح خوش ہوں تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوگی۔ اگر ان سے بھی بڑے عالم آئیں اور وہ بھی خوش ہوں تو مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہوگی۔ تو بڑوں کی خوشی کے تصور سے میری خوشی بھی بڑھتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا بڑا آجائے جس سے بڑا کوئی اور نہ ہو تو میری خوشی بھی اتنی بڑی ہوگی کہ اس سے زیادہ بڑی کوئی خوشی نہ ہوگی اور ایسا بڑا جس سے بڑا اور کوئی نہ ہو وہ خدا ہے۔ تو خدا اگر خوش ہو جائے تو بندہ کی اس سے بڑی خوشی نہیں ہے۔ اس کو فرمایا رضوان من اللہ اکبر (توبہ-۷۲) اللہ کا ذرا سا خوش ہو جانا بہت بڑا ہے۔ خدا کی خوشی بندے کی خوشی کا سبب ہے اور بندہ کی خوشی ہے مقصود بالذات۔ یہ کھانا پینا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس سے خوشی نہ ہو یا گرانی ہو تو کھانا نہیں کھائے گا کہے گا ہٹاؤ، لے جاؤ اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ گرانی ہوتی ہے۔ کئی کئی وقت نہیں کھاتا۔ اگر مال دولت کھانا پینا اور جتنی لذت کی چیزیں ہیں ان سے خوشی نہ ہو تو سب بے کار ہیں۔ اب وہ خوشی اسباب سے حاصل ہو یا بغیر اسباب کے حاصل ہو۔ اصل مقصد خوشی ہے۔ اور خوشی جب ہی ہوگی جب بڑا خوش ہو۔ اس کے قول سے، اس کے فعل سے، کھانے کا ہو، پینے کا ہو، چلنے پھرنے کا ہو۔ معاملہ کرنے کا ہو اور اگر ایسا بڑا آجائے جس سے بڑا کوئی نہ ہو۔ اگر وہ ہماری حرکتوں سے خوش ہو گیا بس یہی مقصد حاصل ہو گیا۔ اسی کا نام کامیابی ہے۔ قد افلح وہ کامیاب ہو گیا وہ خوش ہو گیا اور ایسی دوامی خوشی ملی کہ جس کا انقطاع نہ ہو۔ تو فلاح کے معنی ہیں۔ ایسی خوشی جس خوشی پر مزید اضافہ نہ ہو سکے اور وہ کبھی منقطع نہ ہو۔ اور یہ جب ہی حاصل ہوگی جب ایسا بڑا خوش ہو جائے

جس سے بڑا کوئی نہ ہو۔ یعنی تمہاری حرکت سے تمہارا خدا خوش ہو جائے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی خوشی ہے اور یہی تمہارا مقصد ہے۔ کروڑوں روپیہ ہے۔ مگر مسرت نہیں حاصل ہو تو تفریحیں کرتا پھرتا ہے۔ مگر بے سود تو وہ پیسہ روپیہ سب بیکار دن بھر محنت مزدوری کرتا ہے۔ خوب بھوک لگتی ہے۔ شام کو چٹنی روٹی کھاتا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ پانی پیتا ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اصل مقصد انسان کی خوشی کا ہے اور انسان کی خوشی موقوف ہے خدا کی خوشی پر تو خدا کی خوشی انسان کی حرکات کا سبب بنے گی۔ اور اگر خدا کی خوشنودی کا سبب نہ بنے تو یہ حرکات سب لعنت، پھٹکار، عذاب۔ تکلیف اور دکھ ہیں۔ اسی لیے بار بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ راضیۃ مرضیۃ دو لفظ آتے ہیں۔ وہ خود خوش ہو گیا اور خوش کیا گیا۔ یعنی دوسرے کو خوش کیا گیا۔ (فجر۔ ۲۸) اللہ بندے سے خوش ہو گیا اور بندہ اللہ سے خوش ہو گیا۔ بندے کی خوشی اللہ کی خوشی پر موقوف ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ خوش ہو جائے اور بندہ خوش نہ ہو۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ بندہ اللہ سے خوش ہو اللہ اس سے خوش نہ ہو دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ (بینہ۔ ۸) اصل مقصد رضائے الٰہی ہے خوشی الٰہی ہے اور وہ خوشی الٰہی ہماری خوشی کا سبب ہے۔ اور اس کو یقین کریں کہ اگر وہ رضائے الٰہی اس وقت اس دنیا میں کسی کو نصیب ہو جائے تو وہ ہفت اقلیم کی بادشاہت کو لات مار دے گا۔ میں نے اکثر وزیروں وغیرہ کی پارٹیوں میں دیکھا ہے کہ جو لوگ وزیر اور صدر وغیرہ ایسے بڑے لوگوں کی میز پر اس کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں چائے کی پیالی سے ایک چسکاری بھی نصیب نہیں ہوتی۔ پیالی جوں کی توں بھری رکھی

رہتی ہے۔ اور جو لوگ دور بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ خوب کیک پیسٹری مٹھائیاں کھاتے ہیں۔ اگر ان سے کہو کہ تم بھی دور میز پر جا بیٹھو تمہیں وہاں کھانے کو خوب ملے گا۔ تو ناراض ہو جائیں گے کہیں گے: نکالو اس نالائق کو اس مجلس سے۔ وہ وہاں بھوکا رہنا پسند کرتے ہیں۔ جتنی دیر بڑے سے تقرب ہوتا ہے۔ چھوٹی جتنی چیزیں ہیں سب نظر انداز ہو جایا کرتی ہیں۔ تو اگر خدا سے ایک آن بھی تقرب حاصل ہو گیا تو اس کے مقابلے میں ہفت اقلیم کی بادشاہت ٹھکرانے کے قابل ہے۔

اب دوسری بات یہ ہے کہ 'من زکہا' جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا پاک کر لیا۔ اس کو یہ خوشی نصیب ہو گی اور جس کا نفس پاک نہیں ہے۔ اس کو کبھی خوشی نہیں ہو گی۔ پہلے اس کو مثال سے سمجھ لیں کہ باریک باتیں ہیں ممکن ہے سمجھ میں نہ آئیں۔ اگر معدہ میں اعتدال نہ رہے۔ اور کوئی خلط بڑھ جائے تو کھانے کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کھا کر چاہے بیمار نہ پڑے۔ مگر اس کو لذت نہ آئے گی اور دوسرے خوب کھائیں گے۔ اور مزہ کریں گے۔ اکثر آپ نے غور کیا ہو گا کہ جب صفرہ بڑھ جاتا ہے تو میٹھی چیزیں کڑوی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اگر بلغم بڑھ جائے تو بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ جب تک یہ چیزیں اندر بھری رہیں گی باہر کی چیز مزہ نہیں دینے کی۔ سب جانتے ہیں کہ اگر معدہ کا تنقیہ نہ ہو کوئی شے لذت نہیں دے گی تبخیر ہو رہی ہے تو مٹھائیاں اور عمدہ عمدہ کھانے ایسے معلوم ہوں گے جیسے پتے کھا رہا ہو۔ مجھے پچاس برس کا تجربہ ہے کہ میں تیز تیز مرچیں کھانے لگا کہ شاید اس کی جھونک سے کوئی لذت پیدا ہو مگر نہیں پیدا ہوئی۔ آج سے چالیس برس قبل کا واقعہ ہے کہ حکیم اجمل خان کا علاج کرا رہا تھا۔ انہوں نے میرے معدہ کا تنقیہ کیا

تو اس زمانے میں بھٹیارے کے یہاں کا سالن جس میں بساند اور سراند آتی ہوتی ہیں بڑی لذت سے کھالیا کرتا۔ کبھی کھانے پینے میں دیر ہوتی اور مجھے تیز بھوک لگتی تو ایسا کر لیا کرتا تھا۔ اس میں قورمے اور پلاؤ سے زیادہ مزا معلوم ہوتا تھا اس طرح اگر نفس کا تنقیہ ہو جائے گا اور پاک ہو جائے گا تو خوشی کی لذت محسوس کرے گا اگر نفس کے معدہ میں غلاظت بھری ہو گی تو اس کو کچھ مزہ نہیں آئے گا۔ نہ نماز میں مزہ آئے گا نہ نیک کام میں مزہ آئے گا۔ اس کے لئے تنقیہ کی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کہتا ہے کہ جلاب لو۔ اور نفس کے معدہ میں جتنی گندگی آگئی ہے اس کو چھانٹ دو۔ اب ایک نکتہ کی بات بتادوں کہ جب نفس پاک ہو جاتا ہے تو خدا کیونکر خوش ہو جاتا ہے۔ اللہ کی خوشنودی بندہ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ اور انسان کی خوشنودی اس کا مقصد اصلی ہے جس نے نفس کا تزکیہ کیا وہ مراد کو پہنچے گا۔ یعنی جس کا نفس پاک ہو گا اس کو خوشی میسر ہو گی اگر تھوڑا کھانا کھاتا ہے تو پریشان سا رہتا ہے۔ اگر زیادہ کھاتا ہے تو تکلیف ہو جاتی ہے۔ اسہال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ استغراق ہوتا ہے۔ بھاری پن محسوس کرتا ہے۔ اگر کھانا مقصود ہوتا تو دائماً ہوتا ہر وقت کھاتا رہتا مگر ایسا نہیں کر سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ عارضہ ہے۔ حقیقت نہیں ہے۔ جب عارضہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اس کے رفع کے اسباب ہیں۔ اگر ایک شریف آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو اس کے سامنے دنیا کی نعمتیں رکھو ہرگز نہیں کھائے گا۔ تو ایک گھنٹہ تو کھانے میں صرف ہوا۔ باقی ۲۳ گھنٹے جو خالی رہا اس وقت مقصد کیا ہے۔ کس کی طلب ہے۔ اگر طلب نہ ہو تو معطل اور بے کار ہے۔ یعنی اگر دل میں کسی شے کی طلب اور خواہش

نہ ہو تو بے کار ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ کھانا تو ہر وقت مطلوب نہیں ہے مگر راحت اور آسائش ہر وقت مطلوب ہے تو کھانا پینا اور دوسری دنیاوی لذتیں یہ وہ راحت نہیں ہیں جو مطلوب ہے بلکہ تھوڑی دیر کے لئے راحت کے اسباب ہیں۔ راحت وہی ہوتی ہے جب ان سے فارغ ہو جاتا ہے۔ مطمئن ہو جاتا ہے۔ جب سو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ آرام کر رہا ہے۔ اس کو مت جگانا۔ تو آرام کیا کر رہا ہے۔ جتنی لذتیں ہیں ان کو ترک کر رہا ہے۔ کھانا پینا۔ اور جتنی لذتیں ہیں نیندیں ان سب کو چھوڑ رہا ہے نا۔ تو درحقیقت ترک لذت ہی کا نام اصل لذت ہوا نا۔ تو یہ تو وہ جبری کر رہا ہے اور اگر وہ ارادہ سے ترک لذت کرے تو یا وہ اپنے ارادہ سے کرے گا یا خالق کے ارادہ سے یا مراد کے ارادہ سے کرے گا۔ تو یہ مقام فنا کا ہے۔ اگر گیہوں کو آپ مٹی یا کیچڑ میں فنا کریں گے تو سڑ کے ناس ہو جائے گا۔ ضائع ہو جائے گا لیکن اگر کسی ماہر زراعت کی رائے پر عمل کریں اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کو فنا کریں تو تسکو نہ دے گا۔ اگر اپنی رائے سے اس کو دانہ گندم پیس ڈالا یا کیچڑ میں ڈال دیا تو وہ ضائع ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر لذت دیتا اس سے بھی گیا۔ اسی طرح انسان جو ترک لذت کرے گا وہ خالق کے بنائے ہوئے طریقہ پر کرے گا۔ تب تو وہ موجب بقا ہو گی اور اگر اپنی رائے سے کرے گا یا علاوہ خالق کے کسی اور کی رائے سے کرے گا تو یہ ترک لذت موجب فنا اس جہاں میں بھی ہو گی۔ اور اس جہاں میں بھی نہ یہاں کچھ ملا نہ وہاں۔ یہاں سے بھی گیا اور وہاں سے بھی۔ اس کی رائے سے نفس کو فنا کرنا ہو گا۔ اب دوسری بات یہ سمجھنے کی ہے کہ روح کا بدن سے جو علاقہ ہے۔ اس کو بھی مثال سے سمجھ لیں تو آسانی ہو جائے گی۔ زخم پر جو کمزند

آجاتا ہے۔ اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ پکا ہو جاتا ہے پکے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کھرنڈ کو اس بدن سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اب جو وہ اکھڑ جاتا ہے تو ہلکی سی سلسلاہٹ ہوتی ہے آرام معلوم ہوتا ہے اور کچے کو اگر اکھاڑ ڈالا جائے یا نوچ ڈالا جائے تو وہ خون دے جاتا ہے۔ تو کچا کیا چیز ہے کہ ابھی بدن کا تعلق کھرے سے ہے اس لئے توچنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر روح کا تعلق بدن سے ہے تو بدن کے کھرے کو جب نوچا جائے گا تو تکلیف دے گا۔ اسی کا نام عذاب ہے اور اگر ایسی صورت میں اکھاڑا جائے کہ جب اس کا تعلق بدن سے نہ ہو تو ہلکی ہلکی سلسلاہٹ محسوس کرے گا۔ راحت محسوس کرے گا۔ تو بدن کے ساتھ روح کے تین علاقے ہیں۔ قوت جسمانی۔ قوت حیوانی۔ قوت نباتی۔ ان تینوں سے روح متاثر نہ ہو۔ من نہ کہا۔ یعنی روح کو ان تینوں علاقوں سے پاک کر لیا ہے اور ان سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ یعنی جسمانیت کا اقتضا ہے کہ کسی نرم گدے پر بیٹھے۔ قوت نمو کا تقاضہ یہ ہے کہ ہاتھوں پیروں کو ہلاؤ۔ قوت حیوانی کا تقاضہ ہے شہوت اور غضب یعنی جو مناسب اشیاء مثلاً غذا وغیرہ ہیں۔ ان کو طلب کرے یہ شہوت ہے اور ان کے حاصل کرنے میں جو رکاوٹیں پیدا ہوں ان کو رفع کرے یہ غضب ہے۔ تو ان قوتوں سے روح متاثر نہ ہو۔ ان کے اقتضاء کے مطابق روح کا عمل نہ کرے ان کے تابع ہو کر وہ عمل نہ کرے۔ بس یہی معنی روح کے پاک ہونے کے ہیں۔ کہ اس کی جو حرکت ہو وہ حیوانی جذبے کے تحت نہ ہو۔ حیوانی جذبے کا تقاضہ یہ ہے کہ کھانے کی کوئی چیز رکھا ہو وہ کسی کی ہو۔ چوری کی ہو اس کا [illegible]

زہر ملا ہو۔ حیوان آئے گا فوراً منہ ڈال دے گا۔ اسے کسی بات سے مطلب نہیں تو کھانے کی چیزوں کا استعمال حیوان کی طرح نہ ہو۔ اسی طرح حرکات جسمانی قوت نامیہ کے تقاضہ کے تحت نہ ہوں۔ اسی طرح جسمانی تقاضہ کے مطابق جامد نہ ہو۔ لیٹا نہ رہے۔ پڑا نہ رہے۔ تینوں قسم کی حرکتوں سے روح متاثر نہ ہو بلکہ جو حرکت ہو وہ خالق روح خالق نفس کے حکم کے مطابق ہو تب تو وہ حرکت صحیح ہے وہ اب ایک اور مثال سمجھیں سورج کی روشنی ہے۔ وہ ہر شے پر پڑ رہی ہے گھاس پر۔ پیشاب پخانہ پر ہر جگہ پر پڑ رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی گھاس پن، پیشاب پن، پخانہ پن نہیں لگتا۔ جب سورج جاتا ہے یہ بھی اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اس میں سے کچھ گندگی اپنے ساتھ نہیں لے جاتی تو روح سورج کی روشنی سے بھی زیادہ روشن ہے۔ کیونکہ یہ پر تو ہے اللہ کا۔ قل الروح من امر ربی (اسراء۔ ۸۵) روح اللہ کا امر ہے۔ یہ امر رب ان مادی قوی پر سے ہٹنے لوان سے لگ کر نہ ہٹے۔ جس طرح سورج کی روشنی کچھ لے کے نہیں جاتی اسی طرح روح کچھ ان میں سے لے کر نہ جائے۔ بس یہی معنی پاک ہونے کے ہیں۔ سورج جو ہے وہ اس روشنی کا دوسرا رخ ہے اب جو یہاں سے روشنی پلٹی تو مبدء سورج کو گئی۔ اسی طرح روح بھی نور ہے ضیاء ہے جب یہ یہاں سے پلٹے تو مبدء نور میں چلی جائے وہی اس کی خوشی اور خوشنودی ہے۔ راحت ہے۔ آسائش ہے۔ وہ خدا کا حکم ہے۔ واپس خدا کے پاس چلا گیا۔ قد افلح من زکٰھا جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ مراد کو پہنچا کامیاب ہو گیا۔ تو کیا ہو گا۔ جس طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ بھی جو چاہے گا کرے گا لھم ما یشاؤن فیھا۔ جو وہ چاہے گا وہی

ہوگا۔ ولھم فیھا ما تدعون ۔جو وہ مانگیں گے وہی مل جائے گا۔ ان کے ارادہ سے مراد جدا۔ نہیں ہوگی۔ جس طرح خدا کے ارادے سے مراد جدا نہیں ہے۔ انما اموالکم واولادکم فتنۃ (انفال۔۲۸) اور یہ مال اور اولاد سب فتنہ ہے۔ ان کے دھوکے میں نہ آؤ۔ جب تم پیدا ہوئے تھے۔ تو تم روتے تھے اور یہ سب ہنستے تھے۔ اور جو شخص کسی کے روتے وقت اور غمی کے وقت ہنسے تو وہ اس کا دوست ہوگا یا دشمن تو یہ ماں باپ بھائی بہن سب تمہارے دشمن ہیں۔ ان سے ڈرتے رہو بچتے رہو ان کے دھوکے میں نہ آؤ اور یہ اس درجہ دشمنی کریں گے آخر وقت تک کہ جب تم مرد گے تو یہ نجاست کو تو گھر میں گوارا کریں گے مگر تم کو گوارا نہیں کریں گے۔ جلد سے جلد تم کو گھر سے نکال کر ایسے تنگ تاریک گڑھے میں پھینکیں گے کہ اس میں جانور بھی نہ رہنا پسند کرے۔ اور اسی پر بس نہیں۔ چلتے چلتے منہ پر تین تین مٹھی خاک کی مار کر آئیں گے کہ تو اسی قابل تھا ان سے کیا توقع رکھتے ہو۔ ان کے دھوکے میں مت آؤ۔ یہ سب مغالطہ ہے۔ جب یہ حقیقت کھلے گی اس وقت معلوم ہوگا اس وقت عمل کا وقت نکل چکا ہوگا۔ اس سے پہلے معلوم ہونا چاہیئے۔ باپ کہے سانپ کو مت پکڑ لو کاٹ لیگا مر جاؤگا وہ نہ مانے اور سانپ ڈس لے پھر وہ پکارے اے باپ اب کہا مانوں گا۔ اب کیا ہوتا ہے عمل کا وقت نکل چکا۔ اب بیکار ہے۔ کچھ کام نہیں آیگا۔ لم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا (مومن۔۸۵) جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے۔ اس وقت کوئی فائدہ نہیں دینے کا۔ عمل صالح کا وقت گذر گیا۔ ان سے قطع تعلق کر لو۔ ان سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔ آپ کا خاندان آپ کے دفتر کا ہے۔ اس سے اپنے حاکم خالق کے حکم کے مطابق کام لیں۔ ان کو وقت پر تنخواہ اولاد چھوٹے کلرک ہیں۔ آپ ان پر حاکم ہیں۔ اگر کوئی افسر ماتحتوں کے سا

مل جائے اور اس کا پتہ چل جائے تو کلرکوں کے ساتھ حاکم کو بھی سزا ملتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ ان سے مل گئے اور خدا کے حکم کی نافرمانی کی تو ان کے ساتھ آپ بھی سزا پائیں گے۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دیں یہی ان کی تنخواہ ہے۔ آپ مینجر ہیں۔ جیسا آپ کو حکم دیا گیا ہے اتنا ان کو دو نہ آگے دو نہ پیچھے دو اور نہ ایسا کرو کہ نہ دو۔ حکم کے مطابق دو۔ اپنی طبیعت کی رائے کے مطابق ان کو کچھ مت دو ان سے ایسا برتاؤ کرو۔ جیسے ایک مینجر اپنے عملے کے ساتھ کرتا ہے۔ تب تو ٹھیک ہے۔ اگر اپنی طبیعت کے اقتضار کے مطابق کیا اور اس کے حکم کے خلاف کیا تو نافرمانی کی سزا ملے گی۔ اس لئے کہا کہ قد افلح من زکٰھا جس نے پاک کر لیا نفس کو وہ کامیاب ہو گیا۔ پاک ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ان سے کسی سے کوئی علاقہ نہ رکھو۔ یہ آپ سے علاقہ نہیں رکھتے۔ تو آپ ان سے کیوں علاقہ رکھیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۝ وَمَا خَلَقَ
الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۝ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا
مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ
لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝ اِنَّ
عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ فَاَنْذَرْتُكُمْ
نَارًا تَلَظّٰى ۝ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ
وَتَوَلّٰى ۝ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (والیل اذا یغشیٰ) (۹۲)

۔یہاں دو گروہوں کا حال بیان کیا شقی اور سعید کا۔تمہارے اعمال اور ان کی جزائیں مختلف ہیں۔ شتّٰی :۔مختلف جو اچھا عمل کرے گا اس کا بدلہ پہلی آیت میں ہے اور جو برا عمل کرے گا۔اس کا بدلہ دوسری آیت میں بیان کیا ہے۔تین اصول اہم بتلائے۔جس نے بخشش کی خیرات کی خیرات کا کرنا نظام عالم پر دلالت کر رہا ہے۔زمین پر جتنی چیزیں ہیں کل انسانوں کے لئے ہیں۔مگر بعض چند لوگ سب اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔باقی کو محروم کر دیتے ہیں۔اکثر دعوتوں میں کبھی میں نے دیکھا ہے کہ بعض بدنیت لوگ انتظام میں شامل ہو جاتے ہیں۔اور ہزار آدمی کا کھانا ہے۔ہزار آدمیوں کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔مگر وہ کھانا اپنے گھر بھجوا دیتے ہیں۔اور بڑے آدمیوں کے سامنے پلیٹ بھر بھر کے رکھتے چلے جاتے ہیں۔وہ کہتے رہتے ہیں ضرورت نہیں ہے بس کرو مگر وہ نہیں مانتے رکھے چلے جاتے ہیں اور چھوٹے آدمی مانگتے رہتے ہیں۔ان کی بالکل نہیں سنتے جو زیادہ اصرار کرتا ہے کہتے ہیں اچھا اچھا ٹھہرو آتا ہے۔مگر ان کو نہیں دیتے تو یہاں جو کچھ پیدا کیا ہے کسی خاص جماعت کے واسطے پیدا نہیں کیا ہے۔بلکہ سب کے لئے پیدا کیا ہے۔اور چونکہ نظام عالم مبنی تھا اس پر کہ بعض لوگ چھوٹے ہوں بعض بڑے ہوں اس لئے بڑے آدمیوں سے کہا گیا کہ تم کماؤ اور جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو ان کو دے دو۔یہ مومن کی خصلت ہے اسے اختیار کر لینا چاہیئے۔اس پر نظام عالم موقوف ہے۔خیرات کرنے پر۔جو چیز اپنی

ضرورت سے زیادہ ہو۔

دوسری خصلت یہ بیان فرمائی " واتقی " جس نے اتقا کیا پرہیزگاری کی۔ اتقا کے معنی اللہ سے ڈرنے کے بھی ہیں۔ اور گناہ سے بچنے کے بھی۔ دونوں معنی ہیں۔ یعنی اللہ سے ڈرا یا گناہ سے بچنے کی کوشش کی اور اس سے بچا۔ خدا سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا یہ دوسری خصلت ہونی چاہیئے۔ یہ دونوں عملی خصلتیں تھیں۔ اور ایک اعتقادی خصلت بتائی۔ وصدق بالحسنیٰ۔ اس نے جس نے روزجزا کی تصدیق کی۔ جب تک جنت کی تصدیق نہیں کرے گا۔ اس کے تمام اعمال صالحہ مثل سراب ہوں گے کہ دور سے نظر آئیں گے مگر جب اُن کے پاس پہنچے گا تو کچھ بھی نہ پائے گا۔

حتیٰ اذا جاءہٗ لم یجدہ شیئاً = جب وہاں پہنچے گا کچھ نہ پائے گا۔
(اعراف۔ ۱۵۵)

ووجد اللہ عندہٗ۔ اور اللہ کو اپنے پاس دیکھے گا۔ اور وہ اس کا حساب پورا کردے گا۔ کوئی نتیجہ نہیں ملے گا۔ نیک عملی کے دو اصول بتلائے (۱) انفاق اور بخشش اور (۲) اتقا۔

فسنیسرہٗ للیسریٰ۔ اس کی جزا بتائی کہ اس پر آسانی کردیں گے۔ جو عمل ہوں گے ان کو آسان کردیں گے۔ نماز میں روزہ میں حج میں زکوٰۃ میں کوئی گرانی نہیں ہوگی۔ سب خوشی خوشی پوری کردے گا۔ نیک کام آسانی سے کرے گا یا جنت کا راستہ ہموار ہوجائے گا۔ اور آسان ہوجائے گا۔ یسریٰ کے معنی جنت کے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تیسیر اور آسان کرنا اپنی طرف منسوب کیا۔ اسے سمجھ لیں انسان فعل اور ترک فعل دونوں پر قادر ہے۔ تو آسان کرنے کے معنی ہیں کہ نیک اعمال کی طرف اس کے دل میں رجحان پیدا کردے گا۔ اس کی طبیعت میں ایسی حالت پیدا کردے گا کہ وہ آسانی کے ساتھ نیک

عمل کرے گا۔ یہ عقیدہ اہل سنت والجماعت کا ہے کہ وہ ان میں یہ قوت پیدا کر دے اور معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ چونکہ بندہ اپنے فعل کا خود خالق ہے اس لئے وہ ایسے اسباب مہیا کرے گا کہ نیک عمل آسانی سے ادا ہو جائیں۔ ان اسباب کو الطاف الٰہی کہتے ہیں دَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰی۔ جب وہ مر جائے گا گڑھے میں گر جائے گا۔ اس وقت اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔ انا علینا للھدیٰ۔ ہمارے ذمہ ہے ہدایت دینا۔ مگر اللہ کا ذمہ کچھ نہیں ہے وہ جس کو چاہے ہدایت دیدے۔ جس کو چاہے گمراہ کر دے۔ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ علی بمعنی وجوب کے آتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ پر (اعراف۔ ۱۵۵) واجب نہیں ہے۔ یہاں من کے معنی میں ہے۔ اللہ کی طرف سے ہے۔ چاہے ہدایت کر دیں چاہے ضلالت دے دیں کیونکہ اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰی۔ اول اور آخرت دونوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ جس کو چاہیں جنت دیں۔ جس کو چاہیں دوزخ دیں۔ چنانچہ جب پیدا کیا تو چند ارواح کو کہا۔ قبض قبضۃً بیمینہ وقال هٰذه للجنۃ ولا ابالی وقبض قبضۃً اخریٰ فقال هٰذه للنار ولا ابالی۔ جنت کیلئے ہیں۔ آگ کیلئے مجھ کو (شعرانی ۔ ۱۰۵) پرواہ نہیں یہی بات حق ہے۔ اب یہاں یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ جب یہ سب کچھ اسی کی طرف سے مقدر ہو چکا تو ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارا کیا قصور ہے۔ اس لئے ایک راز کی بات میں بتادوں کہ انسان جو برا عمل کرتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ خود کر رہا ہے۔ کوئی چور یہ نہیں سمجھتا کہ اس سے کوئی چوری کرا رہا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ خود کر رہا ہے اور اس پر نادم ہے۔ تو اللہ پاک جو انسان کے فعلوں کا خالق ہے۔ وہ اس طرح نہیں ہے

جیسے سورج۔ چاند۔ آسمان۔ زمین۔ انسان کا خالق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا خالق خدا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے فعل کا خالق خدا ہے۔ یہ بات دلیل سے سمجھ میں آئی ہے۔ بس یہی سارے علم کا خلاصہ ہے۔ اگر اس کو اس بات کا علم و شعور اس طرح ہو جاتا کہ اس کے فعل کا خالق خدا ہے۔ جس طرح اس کو یہ علم ہے کہ اس کا خالق خدا ہے تو ساری تکلیف شریعت تبلیغ سب بے کار ہو جاتی۔ اس وقت اس کی حالت دوسری ہو جاتی۔ عالم بدل جاتا۔ پھر وہ انسان نہیں رہتا۔ اختیار ختم ہو جاتا۔ جب تک اس کو یہ شعور ہے کہ یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ اسی وقت تک یہ حکم ہے کہ یہ کر یہ نہ کر۔ چنانچہ تکلیف اسی بنا پر ہے کہ بندہ اپنے فعل کو اپنا فعل سمجھ رہا ہے خدا کا فعل نہیں سمجھ رہا ہے۔ اسی لئے قرآن میں جگہ جگہ آتا ہے۔ تُجْزَوْنَ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (جاثیہ۔ ۲۸)۔ یہ جزا ہے اس کی جو تم کرتے تھے۔ یعنی اپنے شعور میں جن کو تم اپنا عمل سمجھتے ہو یہ ان کی جزا ہے۔ اگر وہ یہ جان جائے کہ اس کا فعل نہیں ہے۔ تو اس وقت کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کہ یہ کر یہ نہ کر۔ تو یہ تکلیف، امر و نہی۔ جزا و سزا۔ مدح و ذم۔ ثواب عتاب وہ اس شعور پر مبنی ہے کہ یہ فعل میں نے کیا۔ حالانکہ فعل کا خالق وہ نہیں ہے کوئی اور ہے اب یہاں یہ دقت رہ جاتی ہے کہ یہ شعور واقعہ کے خلاف ہے۔ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (تکویر۔ ۲۹) تمہاری کوئی مشیت نہیں ہے صرف مشیت رب العالمین ہے جسے تم اپنی مشیت سمجھ رہے ہو۔ وہی مشیت رب العالمین ہے تو یہ دو متضاد باتیں ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ نہیں بلکہ یہ دوسرا واقعہ ہے۔

ایک واقعہ وہ ہے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے۔ اگر اس کے خلاف کوئی اور حقیقت
پیدا کر دیتا تو وہ تیسرا واقعہ ہوتا۔ اللہ ہر شئے پر قادر ہے۔ یعنی ایک
سے ۵ تک کا مجموعہ پندرہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے بلکہ مصنوعی
ہے۔ یعنی مخلوق ہے۔ اس نے یہ قانون وضع کر دیا ہے کہ یہ مجموعہ پندرہ
ہو۔ وہ اس پر قادر ہے کہ ایسا قانون وضع کر دیتا کہ یہ مجموعہ پچیس ہوتا
یا دس ہوتا۔ دونوں جہتوں پر قادر ہے یہ قانون بنا دیا اور اس کو اس کا
شعور دے دیا اور اس شعور کے تحت وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک سے پانچ تک
کا مجموعہ پندرہ ہوتا ہے۔ مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے۔ دونوں طرف لاانتہا
جہتوں پر قادر ہے۔ جیسا چاہے قانون بنا سکتا ہے۔ اور ممکن ہے اس نے
بنائے ہوئے ہوں اور ان کا علم ہم کو نہ ہو۔ وما یعلم جنود ربک الا ھو۔
تیرے رب کے لشکروں کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا۔ (مدثر-۳۱) یہ جتنے قوانین
فطرت ہیں یہ سب مخلوق ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اسی وقت
تک ان کی حقیقت ہے جب تک ان کے ساتھ وہ امر و نہی کر رہا ہے۔ سب
لوگ دھوکے میں ہیں۔ یہ عقل اور فطرت سب مصنوعی ہے۔ ان کی کوئی حقیقت
نہیں ہے۔ وہ جب چاہے اس کے خلاف کر سکتا ہے۔ بچے کی پیدائش ماں باپ کے
ملنے سے رکھی ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ بغیر ماں کے پیدا کر دے۔ بغیر باپ
کے پیدا کر دے یا اور کسی ذریعہ سے پیدا کر دے۔ وہ تمام ذریعوں پر قادر
ہے۔ مگر یہاں اس نے ایک نظام پیدا کر دیا ہے۔ تمام احکام اسی نظام کے
[illegible]

نہیں ہے۔ یہ دوسرا واقعہ ہے۔ ایک وہ حقیقت تھی کہ خدا نے پیدا کیا وہ ایک واقعہ ہے وہ اس
شعور میں نہیں ہے۔ مگر وہ حق ہے۔ وہ اس شعور سے نہیں آیا۔ دلیل سے معلوم ہوا ہے۔ وہ دوسرا
شعور ہے۔ جیسے سورج کو دیکھیں ایک طباق سا معلوم ہوگا۔ ایک گز کی چھتری اس سے بچاؤ کیلئے
کافی ہے۔ مگر دلیل سے یہ معلوم ہوا کہ وہ اس زمین سے ۱۵۹ گنا بڑا ہے۔ اتنی بڑی چیز
کو اتنی سی چھتری کیا روک سکتی ہے۔ تو آنکھ کے مشاہدہ میں تو وہ ایک طباق کے
برابر ہے۔ مگر حقیقت میں وہ زمین سے ۱۵۹ گنا ہے۔ یہ حس میں نہیں آیا۔ دوسری
دلیل سے سمجھ میں آیا ہے۔ یا جیسے احوال چشم ہے۔ ایک کو دو دیکھتا ہے۔ تو
وہ غلط نہیں ہے۔ ایک کا دو دیکھنا۔ مگر وہ عالم احوالیت میں ہے۔ اس کو یہی شعور
ملا ہے۔ کہ ایک کو دو دیکھ۔ حقیقت میں وہ ایک ہی ہے۔ مگر کس اعتبار سے آپ اس
کو ایک کہہ رہے ہیں۔ وہ اس شعور کے اعتبار سے کہہ رہے ہیں جو عالم احوالیت سے
باہر ہے۔ اور اللہ اس بات پر قادر ہے کہ سب کو بھینگا کر دے۔ اس وقت
سب ایک کو دو دیکھیں گے۔ اور دو چار جو درست آنکھ والے ایک کہیں تو
سب اُن کو کہیں گے کہ یہ پاگل ہیں۔ تو خداوند عالم نے ایک عالم میں یہ بتایا کہ وہ
خود تمام فعلوں کا خالق ہے۔ اور دوسرے عالم میں یہ بتایا کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق
ہے اور اسی عالم کے اعتبار سے یہ قرآن اور حدیث اور تبلیغ اور تکلیف ہے۔ اور جب وہ عالم اس عالم
میں آجائیگا تو بندہ مسخ ہوگیا۔ وہ عالم جذب میں ہے۔ اس پر کوئی شریعت لاگو نہیں ہے۔ وہاں اس
سے یہ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کر یہ نہ کر۔ تو جزا و سزا اس شعور کے اعتبار سے
ہے۔ جو ہم کو فطرت کیا گیا ہے۔ وہ عالم عالم ایجاد ہے۔ اس میں امر و نہی ہے۔
امر و نہی۔ سزا و جزا۔ مدح و ذم اس شعور کے اعتبار سے ہے۔ جس میں دو

سمجھ رہا ہے۔ کہ یہ میں کر رہا ہوں۔ جیسے یہاں سزا ملتی ہے۔ وہاں سزا ملے گی،
کچھ فرق نہیں ہے۔ اگر یہاں جبر ثابت ہو جائے۔ مثلاً اتفاقاً کسی کو گولی لگ جائے
تو یہاں مارنے والے کو پھانسی نہیں ہوگی یا کفر پر کسی کو مجبور کر دیا جائے اور وہ
جان بچانے کے لئے کفر کے کلمے کہے تو اس پر اس کو کوئی گناہ نہیں۔ الا من اکرہ
وقلبہ مطمئن بالایمان۔ جس کو مجبور کر دیا گیا ہو اس کا قلب مطمئن ہو ایمان
کے ساتھ تو وہ مستثنیٰ ہے۔ فانذرتکم نارا تلظی لا یصلٰہا الا الاشقی الذی
کذب وتولی۔ میں تم کو دہکتی ہوئی آگ سے ڈراتا ہوں اس میں سوائے
اشقیا کے کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔ جس نے جھٹلایا اور منہ حق سے پھیرا
مسلمانوں کا ایک فرقہ ہے مرجیہ وہ اللہ سے امید ہی رکھتے ہیں اور ان کو کوئی
خوف وخطر نہیں ہے۔ اور ان کی دلیل یہ آیت ہے کہ صرف اشقیا جہنم میں جائیں گے
جنہوں نے حق کی تکذیب کی اور اس سے منہ پھیرا اور مسلمان چاہے جتنے گناہ کرے
وہ جنت ہی میں جائے گا۔ کلما القی فیہا فوج سالہم خزنتہا الم یاتکم نذیر قالوا بلی ...
پوچھا جائے گا کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا۔ کہیں گے ہاں آیا۔ قد
جاءنا نذیر فکذبنا۔ جب ڈرانے والا آیا تو ہم نے اس کو جھٹلایا وقلنا ما نزل
اللہ من شیء۔ اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی شئے نہیں اتاری تو اللہ کی تکذیب کی،
بدکرداری کی وجہ سے جہنم میں نہیں جائے گا۔ بلکہ بد اعتقادی کی وجہ سے جہنم میں
جائے گا۔ یہ مرجیہ کا عقیدہ ہے۔ اور ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ اور ایسی بہت سی
آیتیں ہیں۔ قرآن شریف میں۔ سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض
السماء والارض۔ دوڑو اپنے رب کی طرف مغفرت اور جنت کے لئے ایسی جنت

جس کا عرض زمین و آسمان جیسا چوڑا ہے۔ یہ تشبیہ ہے۔ بڑی سے بڑی چیز کے لئے کہ ہمارے سامنے سب سے بڑی چیز یہ آسمان و زمین ہے۔ حالانکہ جنت زمین و آسمان سے بہت بڑی ہے۔ اعدت للذین امنوا باللہ والرسولہ۔ یہ ان کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ (حدید۔ ۲۱) ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیتہ۔ اے رب جس کو تو نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو رسوا کر دیا۔ (عمران۔ ۱۹۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ داخل نار رسوا ہے۔ یوم لا تخزی اللہ النبی والذین امنوا معہ۔ وہ دن ایسا ہے کہ اس دن اللہ نبی کو اور مومنوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ (تحریم۔ ۸) مومن رسوا نہیں ہے۔ اور داخل نار رسوا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مومن داخل نار نہیں ہے۔ یہ آیتیں ہیں اور ایک قیاس ہے ان کا کہ جس طرح کافر کو اس کی نیکیاں فائدہ نہیں پہنچاتیں اسی طرح مومن کو اس کی بدیاں کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ ایمان کفر سے زیادہ قوی چیز ہے۔ تو جب کافر کو فائدہ نہیں پہنچتا تو ایمان کو گناہ اور معصیت کیسے مضر پڑے گی۔ مگر یہ ان کا عقیدہ غلط ہے۔ ان آیتوں کا جواب تو یہ ہے وماسلککم فی سقر۔ جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے داخل کیا۔ (مدثر۔ ۴۲) قالوا جواب دیں گے۔ لم نک من المصلین۔ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے ولم نک نطعم المسکین اور غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ (مدثر۔ ۴۴) وکنا نخوض مع الخائضین اور مذاق اڑانے والوں کیساتھ مذاق اڑایا کرتے تھے وکنا نکذب بیوم الدین اور روز جزا کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ (مدثر۔ ۴۶) تمام سبب بیان کر دیئے جو جہنم میں داخلے کے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کفار ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے اور یہ تھوڑے عرصہ

کے لئے۔ تو آیتوں کا جواب تو ان آیتوں میں ہے جن میں برائیوں کی وعید ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ اللہ صرف شرک کو نہیں بخشے گا۔ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ باقی اگر چاہے گا تو دوسرے گناہ معاف کر دے گا۔ (ن-۱۱۶) جب اختیار ہوا تو دونوں باتوں کا احتمال ہو گیا۔ چاہے بخشے یا نہ بخشے اور جب نہ بخشنے کا احتمال ہو گیا تو جہنم میں جانے کا بھی امکان ہو گیا قیاس کا جواب میں اپنی طرف سے دے دیتا ہوں۔ کفر و ایمان میں ایسا مقابلہ ہے۔ جیسے موت و حیات میں۔ بینا و نابینا میں۔ کافر مردہ کی مثل ہے اور مومن زندہ کی۔ مردہ کے لئے اسباب راحت مفید نہیں ہوتے۔ مگر زندہ کو مضرت کے اسباب مضرت پہنچا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ قیاس مع الفارق ہے اور قانون عقل کے خلاف ہے اگر دونوں ایک ہی حالت میں ہوتیں اور پھر مقابلہ ہوتا تو صحیح ہوتا۔ اور قانون کے اندر جواب یہ ہے کہ وہ اس کے خیال میں نیکی ہے در اصل نیکی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نیکی اس کو کہتے ہیں جو خدا کے حکم کے مطابق ہو اور اپنی رائے سے نیکی کرنا در حقیقت نیکی نہیں ہے۔ جب تک وہ تسلیم نہ کرے۔ مثلاً اگر مالک کے گلے میں نوالہ اٹک گیا ہو اور وہ پانی مانگے اور ملازم اس کو فوراً پانی لا دے تو یہ موجب مالک کی خوشی کا ہوگا اور انعام پائیگا۔ مگر بے ضرورت گلاس پہ گلاس رکھتے چلا جائے تو یہ فعل موجب ناراضگی ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو نکال دیا جائے تو انعام کا مستحق جب ہی ہوگا جب حکم کے مطابق عمل کریگا اور اور سا گر وہی کام اپنی عقل سے کرے تو وہ غلط ہوگا اور ناراضگی کا باعث ہوگا۔ تو جتنے غیر مسلم ہیں وہ جو نیکیاں کر رہے ہیں وہ چونکہ خدا کے احکام کی فرمانبرداری میں نہیں کر رہے ہیں

لہذا وہ مستحق انعام نہیں ہیں۔ وہ جب تک اپنے خیال میں نیکی کر رہے ہیں وہ ان سے ضرور خوش ہو رہے ہیں اور یہاں تھوڑی سی برکت وغیرہ ضرور ہوگی اور جوں ہی شعور بدلے گا اصلیت ظاہر ہوگی اور وہ خوشی ختم ہو جائے گی۔
اصل بات یہی ہے کہ جزا اس کی ملے گی۔ جو جزا دینے والے کے حکم کے مطابق ہو تو آیات دونوں قسم کی ہیں۔ فیصلہ وہ ہوگا جس پر تمام مومنین متفق ہوں یعنی ایمان کا بدلہ دائمی ہے اور عمل صالح کا بدلہ اس وقت ملے گا جب ایمان ہو۔ اگر بغیر کسی نیکی کے مرگیا اور ایمان ہے تو اس کے لئے دائمی جنت ہے۔ اور یہ سب شرائط اس وقت ہیں جب توبہ کرکے نہ مرا ہو۔ اگر توبہ کرکے مرا ہے۔ تو شریعت نے اس کو پاک کر دیا وہ جنتی ہے۔ تو یہ مثل صابن کے ہے کہ میلے کپڑے کو صاف کر دیتا ہے اسی طرح توبہ گناہوں اور معصیت سے پاک کر دیتی ہے۔
توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔ اگر بغیر توبہ کے کفر پہ مرا تو جہنمی اور برائیوں پر مرا تو اس کا وزن اعمال ہوگا اگر نیکی کا پلہ ذرہ برابر بھاری ہوگا تو برائیاں معاف ہو جائیں گی اور جنت میں جائے گا۔ جس کا پلہ ذرا بھی بھاری ہے وہی کامیاب ہے۔ پاس ہو گیا امتحان میں۔ ذرا سی چٹکی میں پلہ جھک جاتا ہے۔ پھر اس کے الطاف وکرم ورحمت کی ہوا چلتی ہے تو ہلکا پلہ بھی جھک جاتا ہے۔ جیسے ہوا سے یہاں پلہ جھک جاتا ہے۔ وزن اعمال کے بعد سفارش ہوگی، جو وہاں رہ گیا سفارش پر نکل جائے گا۔ اس کے بعد جو باقی بچیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ پھر سفارش ہوگی اور آپ اس وقت تک خوش نہ ہوں گے جب تک آخری مومن وہاں سے نکل نہ آئے۔ لیکن جہنم میں جائے گا ضرور اب

وہاں عذاب کس قسم کا ہوگا وہ علم اللہ ہی کو ہے۔

اس کا شان نزول یہ ہے کہ امیہ ابن خلف بعض میں ابی لہب بعض میں ابوجہل آیا ہے ان میں سے کسی ایک کے پاس حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور وہ انہیں بہت تکلیف دیتا تھا۔ گرم ریت پر لٹاتا اور کہتا کہ ہم سب بتوں کو کرو مگر وہ احد احد کہتے رہتے تھے کہ عبادت کے قابل صرف خدا ہے۔ ایسی حالت میں اتفاق سے رسول اکرم ادھر سے گذرے آپ نے سنا اور کہا کہ احد اس کو بچائے گا۔ اور حضرت ابوبکر رض سے فرمایا کہ خدا کے بارے میں اس پر عذاب ہو رہا ہے۔ اس کو بچاؤ۔ اور حضرت ابوبکر رض نے ایک غلام اور کچھ روپیہ دے کر ان کو چھڑا لیا۔ تو یہ آیتیں امیہ ابن خلف اور حضرت ابوبکر کے بارے میں نازل ہوئیں۔ کہ وہ اشقی اور یہ اتقیٰ ہیں۔ حضرات شیعہ اس آیت کو حضرت علی رض کے بارہ میں بتلاتے ہیں ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون وہ زکوٰۃ دیتے ہیں جب وہ رکوع میں ہوتے ہیں۔ یہ وہ اتقیٰ ہے۔ یہ سنی اور شیعہ حضرات کے مختلف فیہ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تم میں سے افضل وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ یہ قانون ہے۔ وسیجنبها الاتقی الذی نارًا تلظّٰی وہ دہکتی آگ سے اتقیٰ کو بچائے گا۔ یہاں سوال ہے کہ اتقیٰ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں یا حضرت ابوبکر صدیق رض۔ جو ثابت ہو جائے وہ حضرت رسول اکرم کی امت میں افضل ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اتقیٰ سے مراد حضرت ابوبکر رض ہیں۔ حضرت علی رض نہیں ہیں۔ اتقیٰ کی تعریف یہ ہے کہ وہ مال خرچ کرتا ہے۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس پر کوئی احسان

ایسا کسی کا نہیں ہے جو پلٹے کے قابل ہو۔ حضورؐ کا احسان تو سارے عالم پر ہے۔ مگر وہ بدلے کے قابل نہیں ہے۔ حضرت علیؓ پر احسان حضورؐ کا ہے۔ پرورش کیا اُن کو حضور نے اور کوئی ایسا احسان ابوبکرؓ پہ نہیں ہے۔ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى (والیل ۱۹) اس پر کسی کا احسان نہ ہو اور پھر وہ احسان کرے اور زکوٰۃ دے اگر وہ مراد ہے تو ایسے شخص حضرت ابوبکرؓ ہیں حضرت علیؓ نہیں۔ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ۔ وہ کسی احسان کے بدلے میں نہیں، طلب جنت یا کسی خوف سے نہیں، بلکہ اپنے رب کی خوشنودی کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ کی شان یہ ہے اور یہ اس سے کمتر ہے کہ انما نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ہم اللہ ہی کے لیے تم کو کھانا کھلاتے ہیں لا نرید منکم جزاء ولا شکورا انہم تم سے اس کا بدلہ چاہتے ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا شکر کرو (دہر ۹) یا خوشامد کرو اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا۔ ہم اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اور اس دن سے جو بڑا سخت اور افسوس کا دن ہے (دہر ۱۰)۔ ان کو خدا کا خوف بھی ہے۔ خدا کی خوشنودی بھی ہے۔ اور خوف روز جزا بھی ہے۔ یعنی ان دو وجوہ سے انھوں نے نیک کام کیا۔ لیکن یہاں کچھ نہیں ہے۔ سوائے اپنے رب کی خوشنودی کے۔ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى اور عنقریب وہ راضی ہو جائیگا۔ اسکا رب اس سے راضی ہو جائیگا۔ تمام علماء یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات ایسی نہیں ہے کہ اسکی طلب ہو یا اس سے ہوا اور وہ محبوب ہو۔ اللہ کی جو طلب ہوتی ہے۔ وہ دراصل اسکی عنایتوں، رحمتوں اور الطاف کی تلاش ہوتی ہے۔ محبت ارادہ کی نوع ہے۔ جب ارادہ

کی قسم ہوئی تو فعل اختیاری ہوگیا تو ارادہ سے متعلق ہوگیا اور محبت ارادہ سے متعلق ہوگئی۔ اور اللہ کی ذات انسان کے ارادے سے پاک ہے۔ اس لئے اللہ کی ذات محبوب نہیں ہوسکتی۔ یہ تمام علما متکلمین کا عقیدہ ہے یہ آیت۔ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ دلالت کر رہی ہے۔ وجہ بمعنی ذات ربہ الاعلیٰ کی ذات کی طلب و تلاش ہے۔ یہ مقام صدیقین کا ہے کہ خدا کی ذات سے محبت کریں۔ غور کریں اللہ کی ذات قابل محبت ہے محبت نوع ارادہ نہیں ہے۔ یہ اضطراری فعل ہے۔ وہ غلط سمجھے محبت طبیعت کا میلان نہیں ہے۔ کیونکہ طبیعت کا میلان تمام جذباتی چیزوں کی طرف ہے۔ پیاس لگی، پانی کی طرف طبیعت کا میلان ہوا۔ بھوک لگی، کھانے کی طرف مائل ہوئی۔ وہ غیر شعوری قوت جس سے ہمیشہ ایک ہی قسم کے فعل سرزد ہوں اس کو طبیعت کہتے ہیں۔ سورج ہمیشہ روشنی دیگا۔ آگ ہمیشہ حرارت دے گی۔ وغیرہ۔ اس میں تمام حیوان اور جانور بھی شریک ہیں تو یہ سب ارباب محبت ہو گئے غلط ہے۔ یہ سب اضطراری فعل ہیں یہ عالم معاملہ ہے۔ اس میں یہ قابل مدح و ستائش ضرور ہوگی محبت نہیں ہے۔ پیاس لگی پانی پیا۔ بھوک لگی کھانا کھایا۔ اب یہ سیر ہوگیا۔ اور تیار ہوگیا۔ اب جو میلان ہوگا۔ یا اختیاری ہوگا یا اضطراری ہوگا۔ اگر میلان اختیاری ہے تو یہ شریعت ہے اور غیر اختیاری ہوگا تو یہ محبت ہے جب تک بھوکا پیاسا ہے تو انسان ہی نہیں ہے۔ کھا پی کر جب تیار ہوگیا تب انسان بنا تو اب یہ کس لئے۔ اب یہ جس کے لئے ہے وہ جو میلان ہوگا وہ یا شریعت

ہے یا محبت ہے۔ والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ (بقرہ ۱۶۵) ایمان والے اللہ کی محبت
میں بڑے محبت کرنے والے ہیں۔ پہلے وہ دلائل سے ایمان لائے گا اور
جب ایمان مکمل ہو گیا۔ پھر غیر اختیاری طلب ہو گی۔ اس لئے محبت کے
قابل صرف اللہ ہی ہے۔ جب کوئی عزیز مر جائے تو فوراً اس کو دفن کرتا ہے
اتنی دیر بھی نہیں رکھتا جتنی دیر نجاست گھر میں رکھی جاتی ہے۔ اگر محبت کا
سبب اس کی جزئیت اور ذات ہو تو اس کی جزئیت اور ذات تو موجود ہے
اس لئے کہ مردہ جو ہے وہی تو اس کا اصل جزو ہے۔ بیٹی بیٹا (گوشت و
پوست ہڈی) معلوم ہوا کہ جزئیت کی بنا پر محبت نہیں ہے۔ کیونکہ جزئیت
موجود ہے اس کو نہیں رکھتا یعنی جزئیت اور ذات محبت کے قابل نہیں ہے بلکہ محبت
اس کو اس کی روح سے تھی جو نہ اس کا جز ہے نہ اس سے متعلق ہے بلکہ امر ربی ہے لہٰذا
محبت کے قابل امر رب ہے قل الروح من امر ربی (اسراء-۸۵) تو اصل میں محبت کے قابل خدا کی
ذات ہے اور کوئی نہیں اسی لئے صدیقین صرف خدا ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی سے نہیں
رکھتے اور جو اعمال صالحہ کرتے ہیں وہ صرف اس کی خوشنودی اور رضا کے
لئے کرتے ہیں اور وہ اپنی خوشنودی کے لئے اپنے مہمان کو جس مقام پر
رکھتا ہے اس کا نام جنت رکھ دیا اور وہ چاہتا تو اور کسی مقام میں رکھتا اور
پھر ان سے یہی بات کہتا۔ یہ پھر بھی اس کی رضا کی خواہش کرتے۔ مقصد
حاصل ہو جاتا۔ جنت جو ہے وہ تو دراصل نہایت اعلیٰ قسم کی حیوانیت ہے۔
یہاں تو کچا گوشت نہیں کھاتا۔ وہاں کچا گوشت کھائے گا یعنی بڑا
حیوان بن جائے گا۔ یہاں ۴، ۵ گز زمین میں رہتا ہے وہاں میلوں جگہ مل جائے گی

زیادہ کھانا، زیادہ پینا اور کیا ہے جنت میں۔ حور و قصور کیا ہیں۔ یہاں ایک بیوی سے شادی کرتا ہے۔ وہاں دس، بیس، پچاس سہی۔ تو جنت کی طلب کرنے والا کمال حیوانیت کی طلب کرتا ہے۔ اور حیوانیت سے بلند تو اس دنیا میں ہوگیا۔ انسان بن گیا۔ تو جنت میں جا کر انسانیت سے نیچے کا درجہ پایا۔ یہ مقصد کہاں ہوا۔ حرکت نام ہے قبح کو چھوڑنا اور حسن تک پہنچنا۔ تو جب اس مقام کا قبح نظر آئے گا اور دوسرے مقام کا حسن تو آپ فوراً یہاں سے چل کھڑے ہوں گے۔ چاہے کوئی روکے یا نہ روکے۔ تو یہاں حیوانیت سے بہت بلند مرتبہ انسانیت میں ہے۔ اب جو یہاں سے دوسرے عالم میں حرکت کرے گا۔ تو اس سے زیادہ بلند مرتبہ میں جائے گا۔ نہ کہ پستی میں جائے گا۔ یہ تو اعلیٰ کا رجحان ادنیٰ کی طرف ہوا۔ نہیں بلکہ نقطۂ انسانیت سے حرکت کرے گا تو الوہیت کی طرف جائے گا کہ وہ نقطۂ حسن ہے۔ وہاں تک پہنچے گا اور جب تک وہ نقطہ نہیں ملے گا اس کی طرف حرکت جاری رہے گی۔ انسانیت سے اگر یہاں گرے گا تو حیوان کہلائے گا۔ اتنا کھا گیا۔ ننگے پھر رہا ہے۔ بالکل جانور ہوگیا ہے۔ یہ کہتے ہیں یاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لہم (۱۲:۴۷) جو لوگ جانوروں کی طرح کھاتے ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ حیوانیت کے مشابہ ہونا تو درحقیقت جہنم میں جانا ہے اور جنت میں کمال حیوانیت ہے۔ وہ کیا جنت ہوئی۔ تو پتہ چلا کہ اصل راحت اور اصل جنت صرف خدا کی ذات ہے۔ مطلوب بالذات خدا ہی ہے۔ اب اس مطلوب کی راحت اور لذت حاصل کرنے کے لئے کوئی ذریعہ بنا ہونی چاہئے۔ اس

مقام کا نام جنت ہے اور مطلوب خدا کی ذات ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے جو فرمایا وہ ٹھیک ہے کہ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی اللہ کا چہرہ اور ذات دیکھنا چاہتے ہیں وجوہ یومئذٍ ناضِرة الٰی ربہا ناظرة (قیامۃ ۲۲۔۲۳)
وہاں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے رب کا چہرہ دیکھ کر تروتازہ ہو جائیں گے۔ اور کسی سے تروتازہ نہیں ہوں گے۔ تو مطلوب بالذات مقصود بالذات خدا ہی کی ذات ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا چار رکعت نماز جنت کے لئے پڑھتا ہوں۔ سب یہی کہتے ہیں اور یہی سکھایا گیا ہے کہ خالص اللہ کے لئے نماز کی نیت کرتا ہوں نہ حور و قصور کے لئے نہ جہنم سے بچنے کے لئے۔ کسی کے لئے نہیں صرف لوجہ اللہ۔ مقصد اللہ تک پہنچنا ہے۔ اللہ ہی کی ذات مطلوب ہے اور جو خدا سے ملنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ خدا اس سے ملنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ جو خدا کو تلاش کرتا ہے۔ خدا اس کو تلاش کرتا ہے اور اس کا مبداء موت ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو فرمایا کہ کوئی خلیل ایسا بھی ہے جو اپنے خلیل کو مارے۔ اللہ کی طرف سے جواب ملا کوئی ایسا بھی خلیل ہے جو اپنے خلیل سے ملنے سے ہچکچائے۔ آپ نے فرمایا فوراً روح قبض کر لو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۫ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۭ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۧ

ترجمہ: شروع ہے اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

انجیر اور زیتون شاہد ہیں۔ اور طور سینا بھی گواہ ہے اور یہ
بلد الامین بھی گواہ ہے کہ بے شک ہم نے انسان کو بہترین قوام سے پیدا
کیا۔ پھر ہم نے اس کو اسفل السافلین میں تھونک دیا۔ سوائے ان لوگوں
کے جو ایمان لائے اور نیک عمل بھی کئے۔ پس ان کے لئے ایسا انعام ہے جو کبھی
منقطع نہیں ہوگا اتنے بیّن دلائل کے بعد تو کیسے جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اللہ
احکم الحاکمین نہیں ہے۔

تفسیر:۔

بعض مفسرین کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اللہ ان معمولی چیزوں کی قسم

کھائے۔ تو انھوں نے کہا کہ اس سے مراد وہ زمینیں ہیں جہاں یہ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ زمین نبیوں کے آنے کی وجہ سے متبرک ہے۔ اس لئے اس زمین کی قسم کھائی بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ دو پہاڑ ہیں جن پر انجیر اور زیتون بکثرت پیدا ہوتے ہیں اور اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہی دو پھل ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ سخت پتھر پر ایسے نرم اور دہنیت ولے پھل پیدا ہوں حضور اکرمؐ کی خدمت میں ایک طباق انجیر کا پیش کیا گیا۔ آپؐ نے کھایا اور فرمایا کہ کھاؤ۔ اگر میں کسی پھل کو کہتا کہ جنّت کا پھل ہے تو میں اسی پھل (انجیر) کو کہتا اس میں خوبی یہ ہے کہ پھل بھی ہے غذا بھی ہے اور دوا بھی ہے۔ بواسیر اور نقرس کے لئے مفید ہے اور اس کا ظاہر اور باطن یکساں ہے۔ بعض پھل باہر سخت اور اندر نرم ہوتا ہے مثلاً اخروٹ، بادام وغیرہ۔ بعض باہر نرم اور اندر سخت ہوتے ہیں جیسے آم وغیرہ۔ مگر یہ نرم ہی نرم ہے اور اندر سے سخت ہے نہ باہر سے۔ دونوں طرف سے نرم ہے اور جنّت کے جتنے پھل ہیں بغیر گٹھلی کے ہیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں دہلی میں نواب فیض احمد خاں کے یہاں بیٹھا ہوا تھا اور وہاں بڑے ذی علم لوگ آیا کرتے تھے۔ حکیم اجمل خاں اور آجکل (۱۹۶۷ء) جو امام جامع مسجد کے ہیں ان کے والد۔ یہ سب لوگ ایک ہی جماعت تھے۔ وہاں علمی بحثیں ہوا کرتی تھیں تو اس وقت کئی لوگ جمع تھے۔ حکیم اجمل خاں نے لفافے میں آم بھیجا کہ شائق کے لئے تحفہ بھیجتا ہوں وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بلکہ نہال ہو گئے اور آم کی تعریف کی اور لوگ جو وہاں بیٹھے تھے ہر شخص نے آم کی تعریف کی۔ میں بھلا اس میں کیا حصّہ لیتا۔ فضول سی بات تھی

مجھے خاموش دیکھ کر لوگوں نے مجھے چھیڑا کہ تم کیوں خاموش ہو تم بھی کچھ کہو میں نے کہا آپ لوگوں نے جو کچھ کہا وہ غلط ہے کیونکہ آم ہے غذا اور اچھی غذا وہ ہے جو ہضم ہونے کے بعد جزو بدن بن جائے اور جس غذا سے بدن نہ بنے وہ زہر ہے یعنی آپ کوئی چیز کھائیں اور بلغم بن جائے یا صفرا بن جائے یا کوئی سمیت پیدا کر دے تو وہ اچھی چیز نہیں ہے مہلک ہے اور ایسی موٹائی نہ پیدا کر دے جو ایک ہی طرف ہو وہ بھی عیب ہے۔ جیسے استسقا رکہ صرف پیٹ بڑھ جاتا ہے بلکہ لمبائی چوڑائی اور موٹائی تینوں جانبوں میں بڑھائے وہ غذا ہے صحت ہے ورنہ وہ بیماری ہے تو غذا وہ ہے جو جسم بنائے، جو جسم نہ بنائے وہ غذا نہیں ہے اور اچھی غذا وہ ہے اچھا جسم بنائے اور حضور صلعم کے جسم سے خدا نے کوئی بہتر جسم نہیں بنایا یعنی کعبہ کا جسم بلکہ عرش بریں بھی اتنا اشرف نہیں ہے جتنا حضورؐ کا جسم ہے۔ کعبہ کے جسم پر تو پیر رکھ سکتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو اندر جا کر بھی نماز پڑھ لیتے ہیں مگر حضورؐ کے جسم کو پیر سے چھونے ہی کافر ہو جائے گا یعنی حضورؐ کا جسم اشرف الاجسام ہے تو جس غذا سے جسم محمد صلعم نہیں بنا وہ کیسے اشرف ہو سکتی ہے۔ حضورؐ نے آم کبھی تناول نہیں فرمایا کیونکہ یہ وہاں پیدا ہی نہیں ہوتا تھا لہذا آم اچھی چیز نہیں ہے بہتر غذا وہی ہے جو حضورؐ نے کھائی اور جو نہیں کھائی وہ بہتر غذا نہیں ہو سکتی۔ گوہ کا گوشت حضورؐ نے تناول نہیں فرمایا اس سے کراہت کی انجیر کو حضورؐ نے نوش فرما لیا تو یہ بہترین غذا ہے اچھی چیز ہے یہ تو خیر

واعظانہ بات تھی جو سمجھنے اور غور کرنے کی بات ہے وہ یہ ہے کہ قسم کھانے کے لئے شرافت کی ضرورت نہیں۔ یہ مجھے علم نہیں ہوا کہ یہ بات پہلے کبھی کسی نے کہی ہو یہ بات میں ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ اصولی غلطی ہے کہ شریف چیز کی قسم کھائی جائے۔ فرمایا۔ ووالد وما ولد۔ باپ اور بیٹے دونوں کی قسم کھائی ہے والد اگر آدم علیہ ہوں تو ان کی اولاد میں کثیر تعداد کافروں کی ہے اور کافروں کی بابت فرمایا کہ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلّ (اعراف - ۷۹) (البلد - ۳)

یہ سب مثل چوپایوں کے بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔ جب چوپایوں سے بدتر چیزوں کی قسم کھائی تو شرافت کا سوال نہ رہا۔ تو مفسرین کا جو یہ خیال ہے کہ اشرف کی قسم کھانی چاہیئے یہ غلط ہے یہ ان کی رائے ہے رائے میں غلطی ہو سکتی ہے ہاں اگر رسول اکرمؐ فرما دیتے تو وہ نص ہوتا وہ حق ہے۔ اصول یہ ہے کہ پہلے یقینی دلائل سے سمجھایا جاتا ہے اگر اس سے نہ سمجھے تو موعظہ حسنہ سے سمجھایا جاتا ہے یعنی عام مسلمات سے۔ اگر کوئی ایسا غبی اور کم عقل آدمی ہو کہ اس سے بھی نہ سمجھے تو ایسے طریقہ پر سمجھانا پڑتا ہے جس میں قسم کی ضرورت پڑتی ہے قسم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تیرے نزدیک یہ بات یقینی ہے اسی طرح جو میں کہہ رہا ہوں وہ یقینی ہے انجیر کی قسم ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح انجیر یقینی تیرے خیال میں تیرے شعور میں ہے اسی طرح جو بات کہی جا رہی ہے وہ حق ہے یعنی تشبیہ بالتحقیق ہے بالکل نئی چیز ہے اگر صحیح ہے تو یہ بہت ہی عجیب چیز ہے اور اگر بدعت ہے تو اللہ محفوظ رکھے آپ کو بھی اور مجھے بھی۔ تو شرافت قسم کے لئے ضروری نہیں ہے

سینا اس میدان کو کہتے ہیں جہاں پہاڑ ہے اور پہاڑ کو طور کہتے ہیں بلد الامین یا محفوظ یا محافظ شہر مکہ ہے۔ تو جس طرح یہ چاروں چیزیں تیرے شعور میں حق ہیں بالکل اسی طرح یہ بات حق ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ انسان کو ہم نے بہترین قوام پر پیدا کیا۔ مرکب میں جن اجزاء کا لانا بہتر اور مناسب ہو ان اجزاء کا لانا تقویم ہے میں نے اس کا ترجمہ قوام کر دیا ہے اب یہ سمجھنا ہے کہ اللہ پاک نے جو فرمایا کہ اس کو بہترین قوام سے بنایا تو اس میں کیا چیز بہتری کی ہے۔ مفسرین کے اس میں مختلف اقوال ہیں میں ان کو بیان کر دیتا ہوں۔ بعض نے کہا کہ اس کو چوپائے کی طرح نہیں بلکہ سیدھا پیدا کیا کہ ہاتھ سے کھاتا ہے اور دو پیروں سے چلتا ہے۔ ایک واقعہ ہے امام ابو یوسفؒ ہارون رشید کے دسترخوان پر کھانے بیٹھے۔ ہارون رشید نے چمچے منگوائے تو انھوں نے فرمایا کہ تیرا دادا احسن تقویم کی تفسیر یہ کرتا ہے انسان ہاتھوں سے کھاتا ہے اور چمچے واپس کر دیئے۔ یہ میں نے کتاب میں دیکھا ہے اللہ بہتر جانتا ہے جو میں نے پڑھا تھا۔ آپ کو بتا دیا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اس کی بابت میں نے دو دلیلیں جمائی ہیں ایک تو یہ ہے کہ کھانا مقصود ہے۔ ہاتھ ذریعہ ہے کھانے کو منہ تک پہنچانے کا۔ مقصود کا بغیر ذریعہ کے حاصل ہو جانا افضل ہے ذریعہ سے حاصل ہو جانے سے۔ یعنی جو شے بغیر ذریعہ کے حاصل ہو سکتی ہے اس کے لئے واسطہ تلاش کرنا فعل عبث ہے اور ذریعہ مقصود سے ادنیٰ ہوتا ہے تو ہاتھ واسطہ ہے کھانے کا تو ہاتھ کا ہونا اعلیٰ پن نہیں ہوا۔ ہاتھ اعلیٰ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہنا ہاتھ

تو بہت اچھی چیز ہے بلکہ ہاتھ کا ذریعہ بننا اعلیٰ نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ بندر بھی ہاتھ سے کھاتا ہے۔ تو ہاتھ سے کھانا اس کی شرافت اور کرامت کی دلیل ہو یہ بات صحیح نہیں ہے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ قد میں سیدھا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ درختوں کے قد بھی سیدھے ہیں اور انسان سے بہت لمبے ہیں تو سیدھا اور لمبا قد ہو جانا یہ کوئی احسنیت نہیں۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ اس کو نطق حاصل ہے یہ ٹھیک ہے یہ علمی بات ہے۔ عقل میں آتی ہے۔ یہ کائنات میں سوائے انسان کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ احسن کے معنی یہ ہیں کہ ایسی چیز حاصل ہو جو کسی دوسری شے میں موجود نہ ہو۔ افضل صرف ایک ہی شے ہوتی ہے دو نہیں ہوتیں اس سلسلے میں میں نے ایک رسالہ لکھ دیا ہے احسن تفضیل کا صیغہ ہے اگر اس سے بہتر یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور شے ہو گی تو پھر یہ احسن نہیں رہے گی گویائی انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے فرشتے حور و قصور جن و شیاطین سب گویا ہیں:

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوۡا عَلٰی وَادِ النَّمۡلِ ۙ قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ۔ (نمل - ۱۸)

ایک چیونٹی نے کہا۔ اے چیونٹیو اپنی بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان کا لشکر بے خبری میں پیس ڈالے فتبسم ضاحکا من قولها (نمل - ۱۹) سلیمان علیہ السلام مسکراتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے ان کی بات پر یعنی ان میں گویائی موجود تھی اس سے بحث نہیں کہ معجزانہ ہو یا غیر معجزانہ ہو بہر حال

انسان کے علاوہ اور بہت سی چیزوں میں گویائی موجود ہے۔ بیان کلام اور نطق بہت سی چیزوں میں موجود ہے انسان کیلئے مخصوص نہیں ہے لہٰذا یہ تفسیر صحیح نہیں ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسان کو علم تحریر یعنی خط و کتابت حاصل ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ تحریر فرع ہے تقریر کی۔ اگر تحریر سے کافر ہوگا اور تقریر سے مومن ہوگا تو اعتبار ایمان کا ہوگا۔ کفر کا نہیں ہوگا۔ تو تحریر قول سے ادنیٰ ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ افضلیت کی دلیل ہوتی تو حضور میں ضرور ہوتی۔ مگر حضورؐ لکھنا نہیں جانتے تھے اس لئے یہ افضلیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم جب معراج میں تشریف لے گئے تو قلموں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی تو یہ بھی انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے بعض مفسرین علماء کی جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہاں چار قسم کی چیزیں ہیں (۱) ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی (۲) ہمیشہ سے ہیں ہمیشہ نہیں رہیں گی (۳) ہمیشہ سے نہیں ہیں ہمیشہ رہیں گی۔ (۴) ہمیشہ سے نہیں ہیں ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ خدا کی ذات ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ نہیں رہے گی یہ احتمال عقلی ہے ایسی کوئی شے نہیں ہیں ہمیشہ سے نہیں ہے ہمیشہ رہے گی۔ یہ انسان ہے اور نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی وہ دنیا ہے: افضلیت یہ ہے کہ انسان ہمیشہ سے نہیں ہے مگر ہمیشہ رہے گا یہ بھی غلط ہے کیونکہ ہمیشہ رہنا افضلیت کا موجب ہوگا تو تمام ملائکہ حوریں، یہ سب افضل ہوں گے بلکہ جہنمی بھی افضل ہوں گے کیونکہ وہ

ہے کہ انسان مجموعہ ہے عقل اور نفس کا۔ نفس شہوت اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ کائنات میں کسی میں یہ دونوں جمع نہیں ہیں۔ کوئی محض عقل ہیں۔ جیسے ملائکہ۔ کچھ ایسے ہیں جن میں صرف نفس ہے جیسے حیوانات و شیاطین وا جنۃ۔ یہ حکمار کی دلیل ہے اور کچھ دل کو لگتی ہے۔ مگر صحیح نہیں ہے غلط ہے۔ کیونکہ اگر نفس اچھی چیز ہے تو حیوان تمام اچھے ہو جائیں گے اگر بُری چیز ہے تو اچھے اور بُرے کا مجموعہ اچھے سے کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ جیسے خالص اور غیر خالص گھی کا مجموعہ خالص گھی سے کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ جامع ہے۔ اس لیئے اچھا ہے۔ یہ غلط ہے اچھا تو جب ہو گا جب اس کے کل اجزار اچھے ہوں اور اگر اس میں ایک جز ایسا برا ملا ہوا ہے جو اچھے کی اچھائی کو بھی کھو دے تو وہ کیا اچھا ہوا لبعض حضرات نے یہ کہا کہ تمام کائنات کن سے پیدا ہوئی اور انسان کو اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بھول ہے ان کی ان سے لغزش ہوئی ہے ان مثل عیسیٰ عِندَ اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون (عمران۔۵۹) اللہ نے انسان کو بھی کُن سے پیدا کیا ہے یہ تخصیص صحیح نہیں ہے تفسیر رائے ہے۔ رائے غلط ہو سکتی ہے اگر سند رسول صلعم سے مل جائے اور عقل میں نہ آئے تو بھی وہ حق ہے یہ مسلمان کا ایمان ہے۔ بَلْ اَحیَاءٌ وَّلٰکِن لَّا تَشْعُرُوْن (بقرہ۔۵۴) جو شہید ہو گئے۔ ان کے لیئے کہہ دیا کہ وہ زندہ ہیں۔ ہم نے مان لیا کہ بہت اچھا۔ ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ بیّن تو کوئی بات نہیں ہو سکتی اب ہم بیان کرتے ہیں کہ انسان افضل یا احسن تقویم کس بات میں ہے ایک

ضابطہ بنے گا۔ وہی معیار ہو گا۔ جہاں افضل کی تلاش ہو گی وہاں وہ جاری ہو گا۔ جو چیزیں انسان اور غیر انسان میں مشترک ہیں وہ نکال دیجیے۔ وہ کبھی افضلیت کا سبب نہیں بنے گی یمکن انسان بھی ہے اور غیر انسان بھی۔ جوہر اس میں بھی ہے اور غیر انسان میں بھی۔ امتداد اس میں بھی ہے غیر انسان میں بھی۔ ان میں سے کوئی شے افضلیت کا موجب نہیں ہو گی حس و حرکت اور حیات سب میں مشترک ہے اب روحانیت کو لیں۔ اس میں عقل ہے جو اس عالم میں اور کسی میں نہیں ہے۔ عقل کے معنی ہیں حسن و قبح کی تمیز۔ ان معنوں میں عقل ملائکہ میں بدرجہ اتم موجود ہے انسان سے بہت زیادہ ہے لَا یَعْصُونَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُوْنَ جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے (تحریم ۶) ان کے پاس تک نہیں پھٹکتے جس کا حکم دیا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے کیونکہ وہ فعل برا ہے تو برے سے بچنے کی قوت ان میں موجود ہے۔ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ اور اس کے اشارہ پر چلتے ہیں۔ وہ کام کرتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ اس کے سامنے (انبیاء ۲۷) دم نہیں مارتے۔ تو یہ طاعت وغیرہ یہ بھی فضیلت کی علت نہیں ہے عقل کے جتنے مقاصد ہیں وہ سب کے سب جبری ہیں یعنی عقل جس چیز کو تسلیم کرے گی یا عقل جس چیز کا حکم دے دیگی اس کے ماننے پر پوری طبیعت انسانی اور فطرت انسانی متفق ہے۔ مثلاً دو لفظوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں اس پر سارا عالم کسی عقیدہ کا ہو سب متفق ہیں۔ یعنی عقل کے احکام پر فطرت انسانی مجبور ہے مذہب پر مجبور نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ

مذہب عقل نہیں ہے۔ عقل جبری چیز ہے۔ وہ کمال نہیں ہے وہ ایسی ہی شے ہے جیسے حس ہے۔ شہوت ہے۔ غضب ہے۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ مثلث کے دو ضلعے تیسرے سے بڑے ہوتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ خدا نہیں ہے یا رسولؐ برحق نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس طرف چلا جائے۔ عقل جب اضطراری اور جبری چیز ہو گئی تو وہ افضلیت کا سبب کیسے بن سکتی ہے اور مفسرین نے فرمایا انا عرضنا الامانت علی السموٰت والارض والجبال ہم نے آسمان زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی۔ (احزاب-۷۲) فابین ان یحملنھا سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا واشفقن منھا اور اس سے ڈرے وحملھا الانسان اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کیوں برداشت کر لیا وانہٗ کان ظلوماً جھولا بڑا ظالم و جاہل تھا۔ یعنی اس کی بربادی کا سبب تو یہ عقل ہی ہے نا۔ عقل کی معقولیت عقل کے بھی خلاف ہے اور شریعت کے بھی خلاف ہے تو یہ موجب افضلیت کیسے ہو سکتی ہے۔ عقل کی نامعقولیت عقل میں آ سکتی ہے۔ یہ بات کہ عقل میں نہیں آتی۔ عقل میں آ جاتی ہے لہذا عقل اچھی چیز نہیں ہے یا افضلیت کا سبب نہیں ہے بلکہ معیار یہ ہے کہ مٹنے والی شے ادنیٰ ہو گی اور جس پر مٹے گی نثار ہو گی وہ شے اعلیٰ ہو گی بس یہ ہے ضابطہ۔ شعور کو مٹایا جاتا ہے نثار کر دیا جاتا ہے۔ جب آپریشن ہو آپ کو بے ہوش کر دیا جاتا ہے تو شعور افضل نہیں ہو سکتا اگر سر پر لکڑی مارے تو ہاتھ سامنے کر لیتے ہیں یعنی ہاتھ کو سر پر سے نثار کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سر افضل ہے ہاتھ سے تو

وہی چیز افضل ہے جس پر عقل نثار ہو ؎

کرتا ہے دل وہ باتیں جو عقل میں نہ آئیں
گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

کوئی آوارہ شخص ایسا نہیں ہے کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اوباشی کا
نتیجہ برا ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے تو یہی کہے گا کہ یہ برا ہے۔ مگر جب
اس سے پوچھو کہ پھر کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ دل نہیں مانتا۔ وہ دل کیا
شے ہے۔ یہی وہ اختیار ہے۔ چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ یہ عقل اور
جتنی قوتیں ہیں سب اسی اختیار کے ماتحت ہیں اور یہی اختیار ہے
جو مخاطب رب العالمین ہے اگر اختیار نہ رہا تو سب بے کار۔ مرنے
کے بعد اختیار چلا جاتا ہے۔ پھر کوئی خطاب نہیں۔ تمام نظام دین و
دنیا شریعت اور عقل سب اسی اختیار پر مبنی ہیں۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن
تقویم کے معنی یہ ہیں کہ جتنے کائنات کے اجزا ہیں وہ سب ہیں اور
خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (مسند احمد جلد ۲ ص ۲۴۴) اس میں صورت رحمٰن کا جزو شامل کر کے انسان
بنا۔ صورت رحمانی ہی اس کی افضلیت کی موجب ہے صورت رحمانی
کیا ہے۔ یہ یہی مکمل اختیار ہے اور انسان کیا ہے۔ ناقص اختیار کا نام
ہے۔ ایک مکمل اختیار، ایک ناقص اختیار اور باقی جتنی چیزیں ہیں۔
سب بے اختیار۔ خطاب کرنے والا کامل اختیار اور سننے والا مخاطب
یہ ناقص اختیار۔ تو کہا، ہم نے اس کو اختیار سے پیدا کیا۔ بہترین نعمت

ہے۔ وہ حکم کے خلاف نہیں کر سکتے۔ مگر انسان کر سکتا ہے اور کرتا ہے یقین ہونے کے بعد کہ اس کا انجام برا ہے تب بھی کرتا ہے انسان اچھی طرح جانتا ہے کہ مریگا کوئی طاقت اس کو نہیں بچا سکتی یہ جانتے ہوئے لہو لعب میں پڑنا قطعی عقل میں نہیں آتا، عقل برابر منع کر رہی ہے مگر پھر بھی وہ کر رہا ہے یہ کون کر رہا ہے۔ یہی اختیار ہے جو کر رہا ہے۔ اس نے یہی کہا ہے اگر تو میری رائے پر چلا تو یہ قدرت ابد تک تجھ کو دے دی جائے گی۔ یہ پوری کائنات تیری ہے لہم مایشاؤن فیہا (ق۔۳۵) جو جی چاہے کرے۔ جس طرح میں جو جی چاہے کرتا ہوں اسی طرح جو یہ جی چاہے کرے۔ بالکل میری مشابہ قدرت اس کو حاصل ہو گی۔ ایک بلڈنگ بنانی ہے تو میلوں لمبی چوڑی عمارت مزین مجرد اس کے ارادے پر بن جائے گی۔ تو انسان کو بہترین قوام سے پیدا کیا۔ یہ بہترین قوام اختیار ہے اسی کے ساتھ یہ مکلف ہے اور تمام انبیا علیہم السلام اسی سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لائے کہ اس کا صحیح استعمال ہو چونکہ ضمناً یہ بات آگئی ہے۔ اسے بھی سمجھ لیں کہ صحیح استعمال کیا ہے۔ اختیار سے نیچے کی جتنی قوتیں ہیں ان کا تابع اختیار نہ ہو۔ بس یہی اس کا صحیح استعمال ہے۔ اختیار اگر ان کا تابع ہو گیا تو یہی تمام کائنات سے گھٹیا ہو گیا اور یہی اسفل السافلین ہے اختیار سے نیچے عقل ہے۔ پھر شعور ہے، اس کے نیچے حس ہے جس سے نیچے لزوم ہے۔ لزوم سے۔ نیچے جمود ہے۔ سخت بھوک لگ رہی ہو عمدہ نفیس اور لذیذ کھانا موجود ہو۔ کوئی دیکھنے والا نہ ہو اور کوئی شئے

مانع نہ ہو پھر خدا کا حکم ہو جائے کہ نہ کھا اور نہ کھایا۔ بس اختیار اس کی رائے کے مطابق استعمال ہو گیا۔ اختیار امر الٰہی کے تابع ہونا چاہیئے ارادہ الٰہی کے تابع نہیں۔ کیونکہ جتنی کائنات ہے ارادہ الٰہی کے تابع ہے۔ ارادہ الٰہی کے تابع ہونے کے معنی ساری کائنات کے تابع ہونے کے ہیں اور کائنات انسان سے گھٹیا ہے۔ نہیں بلکہ خدا کے امر کے تابع ہو۔ کیونکہ مخالفت امر میں ہو سکتی ہے ارادہ میں نہیں ہو سکتی۔ ارادہ ہو گا تو ہو کر رہے گا۔ امر ہے چاہے ہو چاہے نہ ہو۔ یہ تمام معمار آئین کو بھی دھوکا لگا ہے۔ ارادہ سے انسان کا کیا تعلق ہے۔ انسان کا تعلق امر سے ہے۔ یہ کر یہ نہ کر۔ ارادہ کی جتنی مرادیں ہیں ارادہ سے جدا نہیں ہیں۔ ارادہ کی جتنی مرادیں انسانیت کے منافی ہیں۔ اگر خدا خود سامنے آکے کہے کہ یہ کر اور یہ نہ کر تو کس کی مجال ہے کہ اس کے خلاف کرے۔ تو مجبور ہو گیا۔ انسانیت سے خارج ہو گیا۔ اگر کائنات میں سے کوئی شے کلمہ پڑھنے لگے تو یہ معجزہ ہوا اور معجزہ کو دیکھ کر ایمان لایا تو بھی مجبور ہو گیا تو نہ خدا خود تعلیم دینے کے قابل ہے نہ کائنات میں سے کوئی علاوہ انسان کے تعلیم دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں مجبور ہو جائے گا۔ اختیار جاتا رہے گا انسانیت سے خارج ہو جائے گا۔ ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ امر کرے اور اختیار باقی رہے چاہے مانے یا نہ مانے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان تعلیم کرے۔ اللہ کی طرف سے امر کرنے والا انسان ہو اور یہی انسان

نبی ہے۔ اصل معلم نبی ہے۔ نبی کے واسطے سے جو حکم ہوگا اسی کا نام امر الٰہی ہے۔ نبی کے علاوہ کسی واسطے سے آئے یا بلا واسطہ آئے وہ سب انسانیت سے خارج ہے۔ اس پر مجبور ہے۔ اختیار مرنے سے کچھ پہلے جاتا رہتا ہے کمزور ہو جاتا ہے۔ جب تک اختیار ہے۔ اسی وقت تک مکلف ہے اختیار جانے کے بعد جو اعمال ہوں گے غیر معتبر ہیں دوسری آن اوّل تو یقینی نہیں اور اگر آگئی تو اس کا امکان ہے کہ وہ معتبر نہ ہو تو جو کچھ کرنا ہے اسی آن کرنا چاہیئے فیقول رب لولا اخرتنی الیٰ اجلٍ قریب فاصدق واکن من الصّالحین۔ تھوڑی تھوڑی سی ڈھیل دی۔ تھوڑی مہلت دی۔ صدقہ (منافقون-۱۰) دینا ہے اور نیکوں میں سے ہو جاتا ہے اختیار کے وقت جو کرنا ہے وہ کرو۔ نہ کیا تو وہ ٹائم بیکار ہو گیا ایک آن میں سعادت حاصل ہو جاتی ہے ثم رددنٰہ اسفل السافلین پھر ہم نے جھونک دیا۔ اس کو اسفل السّافلین میں۔ اسفل سب سے نیچا۔ سافل نیچا۔ سافلین سافل کی جمع مفسرین کا ایک گروہ جو اس کا قائل ہے کہ صورت اچھی بنائی یہ بھی غلط ہے کیونکہ حور عین کی صورت انسان سے اچھی ہے اگر اچھی نہ ہوتی تو ان کی ترغیب نہ دی جاتی۔ حسن صورت کوئی چیز نہیں کیونکہ کسی بدصورت کو بھی اپنی صورت بُری نہیں معلوم ہوتی۔ خواہ کتنا ہی چیچک رو ہو اور بڑی صورت ہو تو دیکھنے والا تو برا جانے گا۔ مگر صاحبِ صورت اپنی صورت کو برا نہیں جانتا۔ اگر اپنے روز مرّہ کے واقعات دیکھیں تو

حسن صورت کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں بڑھاپے میں چہرہ بدنما ہو جاتا ہے ۔کمر جھک جاتی ہے اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جہنم میں نیچے سے داخل ہوگا یعنی ایسا بڈھا کر دیا کہ قابلِ عمل نہ ہو ۔مگر میں نے جو عقلی بحث ایجاد کی ہے ۔وہ بتاتا ہوں اس کا تعلق مفسرین سے نہیں ہے وہ اس بات کو نہیں جانتے یہ عقلی اور عملی بات ہے ایک لکڑی لیں بس اس کو سیدھا کھڑا کریں اس کے دو حصے فرض کریں اب ایک حصہ اوپر کا ہوگا ۔ایک حصہ سافل ہوگا اور جو سب سے نیچے کا سرا ہوگا وہ اسفل ہوگا ۔اور سافل میں شامل ہوگا وہ اسفل السافلین نہیں ہوگا ۔ سافلین کا آخری درجہ ہوگا جو سافلین سے اسفل ہے وہ سافلین میں نہیں رہا ۔تب ہی تو کہے گا یا لیتنی کنت ترابا (النبأ ۴۰) کیونکہ مٹی سب سے نیچا درجہ رکھتی تھی ۔کاش میں مٹی ہوتا ۔جب مٹی پر رشک کرے گا تو مٹی جیسا نہ ہوا ۔بلکہ اس سے بھی کمتر ہوا ۔اللہ سب پر اپنا فضل کرے ۔سافل کے جتنے درجات ہیں وہ سب واقعات ھیں حقیقتیں ہیں ۔یہ ان سے سب سے نیچا ہے یعنی مرتبہ سافلین میں بھی نہیں رہے گا ۔پھر کیا ہوگا ۔غیر مناسب کا شعور ہوگا ۔اس جہاں میں جتنے شعور ہیں نیچے سے نیچے درجے میں چلے جائیے کہیں نامناسب کا ادراک نہیں ملے گا مناسب کے شعور کا نام لذت اور نامناسب کے شعور کا نام درد ، دکھ ہے ۔غیر مناسب کا شعور سافلین میں سے کہیں نہیں ہے ۔مدارج دیکھیے ، انسان ، فرشتہ ، جن ، شیاطین ،

جانور، شجر، حجر، مٹی اور اس کے نیچے جو آپ کے خیال ہیں ہو کسی غیر مناسب کا شعور نہیں ہے۔ غیر مناسب ہی کا نام عذاب ہے۔ وہ کیا ہے تفریق ہے۔ فراق ہے۔ انگلی کٹ جاتی ہے۔ کھالیں الگ الگ ہو جاتی ہیں تکلیف ہوتی ہے درد ہوتا ہے۔ وہ درد کیا ہے۔ دونوں جدائی کا ماتم کرتے ہیں کہ ہم میں تم میں جدائی ہو گئی۔ جب کھرنڈ آجاتا ہے۔ دونوں مل جاتے ہیں درد ختم ہو جاتا ہے۔ کمال مفارقت نہ اس عالم میں ہے نہ اس عالم میں۔ کسی عالم میں کسی شے میں نہیں ہے اب وہ کونسی شے ہے جو ہر جز کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ وہ آگ ہے۔ سالن پک گیا بوٹی گل گئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بوٹی کا جز، جز سے الگ ہو گیا۔ کتنا ہی باریک قیمہ کریں جز جز سے جدا نہیں ہو گا ورنہ قیمہ کو پکانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بغیر پکائے کھا لیتے۔ تو سبب مفارقت آگ ہے۔ تو آگ سب سے زیادہ غیر مناسب شے ہے اس کا دائمی حضور و شعور ہو گا وہ جدا نہیں ہو گا اللہ محفوظ رکھے، مکمل شعور ہو گا۔ یہاں تو ذرا تکلیف ہوتی بے ہوش ہو گیا تکلیف ختم ہو گئی۔ یہ دائمی شعور غیر مناسب سافلین میں سے کسی کو ہو گا ہم نے اس کو ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں دائماً شعور غیر مناسب ہو گا الا الذین امنوا وعملوا الصالحات فلهم اجر غیر ممنون۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے اجر و ثواب

غیر مقطوع ہے۔ دائماً ہے۔ یہاں غیر ممنون کے معنی المفسرین نے یہی بیان کیے ہیں۔ ممنون مشتق ہے، منت سے معنی احسان۔ ایسی روزی ملے گی جس کا احسان کسی پر نہیں جتایا جائے گا کیونکہ احسان جتانے سے تکلیف ہوتی ہے یا اس کے معنی یہ ہیں۔ غیر مقطوع کبھی قطع نہیں ہوگا امام ابن خرم سے ایک ملحد کا مناظرہ ہوا۔ اس نے کہا تم اور تمام مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ثواب منقطع نہیں ہونیکا۔ مگر یہ آیت ہے وانا لموفوهم نصيبهم غير منقوص (ہود-۱۰۹) ہم ان کا حق اور نصیب پورا پورا دیں گے۔ پورا دینے کے یہ معنی یہ ہیں کہ وہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ باقی رہا تو پورا نہیں ہوا۔ پورا ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ مقطوع ہو جائے۔ بڑا مشکل شبہ ہے تو تمام علماء نے اس کا اناپ شناپ جواب دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بات اگر قاعدہ کے اندر ہو تو بڑی سہولت ہو جاتی ہے اور لائن سے ہٹا تو ایسا گرتا ہے کہ کہیں نہیں ٹھہرتا۔ صحیح جواب میں بتاتا ہوں اسے سن لیں حقیقی بات یہ ہے کہ پورا کرنے کے معنی میں مغالطہ ہوا کسی لمبائی چوڑائی والی چیز کے پورا کرنے کے معنی تو ختم کرنے کے ہیں۔ مثلاً کپڑا دس گز لینا ہے دس گز ناپ دیا پورا ہو گیا اور منقطع ہو گیا۔ مگر وعدہ پورا کرنے کے معنی قطع کرنے کے نہیں ہیں بلکہ مطابقت کے ہیں اس نے لا انتہا کا وعدہ کیا ہے اس کے مطابق دائمی اجر ملے گا۔ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہاں یہ مغالطہ ہوا کہ چیز کے پورا کرنے کو وعدہ

پورا کرنے کے ساتھ ملا دیا فما یکذبک بعد بالدین کون جھٹلائے گا اتنے واضح اور بیّن دلائل کے بعد جو اوپر بیان کر دیئے۔ اگر اثر اس کی ذات کو لازم ہوتا تو یہ تغیرات ظاہر نہ ہوتے۔ ایک حال پر رہتا۔ جب تغیر ہو رہا ہے تو ضرور تغیر کا کرنے والا کوئی ہے اگر وہ ہے تو اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ تغیر اور قدرت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فوراً کر سکتا ہے اور حکمت دلیل ہے، اس بات کی کہ یہ بے کار نہیں بنی۔ تو عمل کی جزا ضرور ہو گی۔ اتنی دلیلوں کے بعد جزا کا انکار کون کرے گا اثر کی ترتیب یہ بتا رہی ہے کہ جو قادر ہے قطعی حکیم ہے ورنہ اثر مرتب نہ ہوتا۔ مثلاً اگر اینٹیں چنی جائیں گی تو مکان بن جائے گا اگر گدھا لڑھکا ئے گا تو ایک لایعنی ڈھیر بن جائے گا۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا (ص۔ ۲۷) ہم نے زمین و آسمان بے کار پیدا نہیں کیے۔ اس دنیا کا اثر ضرور مرتب ہو گا۔ تو اب کون جھٹلائے گا اتنے بیّن دلیل کے بعد۔ الیس اللہ باحکم الحاکمین کیا اللہ احکم الحاکمین نہیں ہے یہ بہت دقیق بات ہے میں اختصار سے بیان کر دیتا ہوں۔ حاکم حکم کرنے والا۔ احکم بڑا حاکم۔ اگر ہم کسی شے کا حکم دیں تو حاکم ہم بھی ہو جائیں گے۔ ہر شخص حکم کرتا ہے بیٹوں کو، بیوی کو، نوکر کو، ماتحتوں کو تو سب حاکم ہیں، اللہ حاکم نہیں ہے احکم ہے یعنی حاکمین پر احکم ہے یہ نکتہ کی بات ہے۔ ہم حاکم ہوں اور وہ ہم پر حاکم ہو ایسا

نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام حاکموں پر احکم ہے جو لوگ دوسروں کو حکم کر رہے ہیں وہ اس کے حکم سے ہی حکم کر رہے ہیں۔ اب عقلی دلیل سے یہ ثابت کرنا ہے کہ اللہ حاکم ہے اور دوسری بات یہ ثابت کرنی ہے کہ وہ احکم ہے۔ حکم دو قسم کے ہیں (۱) تکوینی (۲) تکلیفی۔ تکوینی ایسا ہو، پیدا ہو، ذات ہو، جوہر ہو صفت ہو۔ یہ حکم تکوینی کہلائیں گے۔ ذات وصفات میں حکم تکوینی ہے تکلیفی حکم یہ ہے کہ ایک شے موجود ہے پھر اس کو حکم دیا تو یہ کر یہ نہ کر۔ تو اللہ تعالیٰ حاکم بحکم تکوینی بھی ہے اور حاکم بحکم تکلیفی بھی ہے۔ یعنی تکوین و تکلیف دونوں کا حاکم ہے۔ حاکم تکوینی کیونکر ہے یعنی یہ کیسے معلوم ہو کہ اس کے حکم سے ہوا۔ اس کی دلیل کیا ہے۔ یہ بہت نازک بات ہے آپ غور کریں۔ وجود مادہ سے نہیں بلکہ حکم سے ہوا ہے۔ ایک شے ہے یہ کسی اور شے سے بنی پھر وہ کسی اور شے سے بنی پھر وہ شے کسی اور شے سے بنی اس طرح سلسلہ چلتا چلا گیا۔ اس کا نام مادہ ہے۔ دہریے یہی کہتے ہیں کہ جب ہم نے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ لڑکا باپ سے باپ دادا سے دادا پر دادا سے پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے اور یہ سلسلہ لا انتہا چلا جاتا ہے۔ کہیں نہیں رکتا۔ یہ جو مشاہدہ، مشاہدہ بکتے ہیں ان سے یہ پوچھا جائے کہ تم نے ازل تک کا مشاہدہ کیا ہے یا نہیں۔ اگر کہیں کیا ہے تو کفر کے ساتھ ساتھ جنون بھی ہوا اگر کہیں نہیں کیا تو خود اپنے دعویٰ

کو جھٹلا دیا۔ ہماری لڑائی تیر و تفنگ کی نہیں ہے۔ ہماری لڑائی برہان کی ہے۔ سارے یورپ کے فلسفی اور ساری دنیا کے دہریئے جمع ہو جائیں بالکل نہیں بول سکتے۔ اتنے عظیم دلائل قرآن کریم میں موجود ہیں۔ کتنی غلط بات ہے کہ مشاہدہ کیا، کہاں تک کا مشاہدہ کیا، تو یہ سلسلہ لاانتہا جاتا ہے۔ جسم اس شے کو کہتے ہیں جس کو لمبائی چوڑائی اور موٹائی اجتماعی طور پر یہ تینوں خصلتیں لازم ہوں یہ تینوں خصلتیں ذاتی ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے اوصاف ہیں وہ جسم کی ذات کو لازم نہیں ہیں جیسے حرکت وسکون، سیاہی، سپیدی، اچھائی اور برائی ہے۔ وغیرہ وغیرہ ان میں تعدد ہے تزوج ہے اگر لازم ہوتی تو ایک ہوتی۔ مِن کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ۔ (ذاریات - ۴۹) سب کو ہم نے جوڑے جوڑے پیدا کیا۔ یہ تزوج نہیں پایا جاتا مثلاً جسم کو جس طرح لمبائی چوڑائی موٹائی لازم ہے اگر اسی طرح سفیدی سرخی بھی لازم ہوتی تو ہر جسم سفید ہوتا یا سرخ ہوتا مگر ایسا نہیں ہے یہ تزوج مزوج کی دلیل ہے ورنہ یہ ایک ہی ہوتی ہے اس کی ضد نہ پائی جاتی۔ کوئی شے حرکت وسکون سے خالی نہیں ہے۔ یعنی دونوں چیزیں ہر شے میں موجود ہیں۔ یہ دونوں ضد ہیں معلوم ہوا کہ یہ ذاتی فعل نہیں ہے۔ عارض ہوئی ہیں۔ جب عارض ہیں تو جسم کے باہر سے آئیں اور جب باہر سے آئیں تو ضرور ان کا کوئی بھیجنے والا ہے۔ جو قدرت شے کو کسی صفت سے موصوف کر دیتی ہے

اسی کا نام خالق ہے۔ اگر مواد کا سلسلہ لا انتہا جائے گا تو خالق کا محتاج نہیں رہے گا لیکن خالق کی احتیاج ضروری ہے تو سلسلہ لا انتہا نہیں جائے گا۔ جب سلسلہ لا انتہا نہیں جائے گا تو لابد اوّل ہو گیا۔ اب جو پہلی چیز بنے گی وہ مادہ سے نہیں بنے گی بلکہ امر کن سے بنے گی۔ لہذا احکم الحاکمین کل اشیاء اور کائنات کا وہی ہوا اور حاکم تکلیفی بھی وہی ہے۔ پہلے شے کو کہا کہ ہو اور وہ پیدا ہو گئیں اب دوسرا خطاب اس کی طرف ہو گا کہ یہ کر یہ نہ کر، شعور ہو گا اختیار ہو گا۔ فعل کرنے کی قدرت ہو گی۔ پیدا کرنا ایک آن میں ہے۔ ہو جا کہا اسی آن ہو گئی۔ اب موجود ہو کر پوچھتی ہے کیا کروں۔ اگر مزید اطاعت نہیں ہے تو بعد کی آیتیں لغو ہو گئیں اور لغو ہو نہیں سکتیں تو ان سے زبان حال سے پوچھا اور زبان حال سے یہ جواب دیا کہ یہ کر یہ نہ کر۔ پہلی آن میں حادث ہوئی دوسری آن میں بقا ہوئی۔ جو محدث ہے وجود کا، وہی معطی ہے بقا کا۔ جو پیدا کرے گا وہی باقی رکھے گا اور باقی رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ تکلیف دینا اور وحی کرنا، یہ کر یہ نہ کر، حاکم وجود بھی وہی ہے اور آمر تکلیف بھی وہی ہے تو ڈبل حاکم ہو گیا بس یہی معنیٰ احکم الحاکمین کے ہیں یا یہ معنی ہیں کہ حاکم کے حکم کو منسوخ کر دے۔ یہاں بھی بڑا حاکم چھوٹے حاکم کے حکم کو مسترد کر دیتا ہے اور غور کریں کہ جتنے حاکم ہیں وہ قانون کے تابع حکم کرتے ہیں اگر قانون کے تحت حکم نہیں کرے گا تو وہ مجرم ہو جائے گا اب قانون کیا ہے۔ ان حقائق کے تجربہ

کرنے سے جو باتیں مفاد انسانی کے لئے مفید تھیں ان کا چھانٹ کر جمع کرنا۔ تو وہ مصالح اور مقاصد اسی نے پیدا کئے ہیں تو وہ مصلحت کو مفسدت سے اور مفسدت کو مصلحت سے بدل سکتا ہے لہذا وہ احکم الحاکمین ہے یعنی حاکم قانون کا پابند ہے اور وہ قانون پیدا کرتا ہے وہ جو فیصلہ کردے وہی قانون ہے دوسری طرح یوں سمجھیئے کہ جرم قانون کی دفعہ کے تحت ہے مگر قانون جو وضع کیا گیا ہے وہ کس قانون کے تحت ہے وہ لا قانون ہے۔ یہ لاقانون تمام قانونوں کا مبدار ہے اور وہی خدا ہے مثلاً ایک گز کپڑا گز سے ناپ دیا یہ قانون کے مطابق ہوا اور قانون ہوا۔ گز جس سے ناپا گیا وہ گز کیسے بنا کسی اور گز سے بنا اور وہ کسی اور سے۔ یہاں تک کہ پہلا گز آگیا جو کسی گز سے نہیں بنا۔ یہ گز کیونکر بنا۔ خدا نے نبی کو بھیجا اس نے بتایا کہ اس لمبائی کو گز کہو۔ یعنی پہلا گز اللہ کے حکم سے بنا اور اب جو اس گز کے تحت حکم چلے گا وہ ہمارا حکم ہوگا۔ یعنی ہم حاکم ہیں اور وہ احکم ہے۔ یہی معنی احکم الحاکمین کے ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین ؁
(مواعظ۔ ۱۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ
الْقَدْرِ ۭ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ڏ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۭ تَنَزَّلُ
الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛ
سَلٰمٌ ڕ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۧ

بے شک ہم نے اس کو لیلتہ القدر میں اتارا۔ آپ کو کیا پتہ کہ لیلتہ القدر کیا ہے۔ لیلتہ القدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس لیلتہ القدر میں روح اور فرشتے اپنے رب سے اجازت لے کر ہر ایک کام کی وجہ سے اترتے ہیں یہ لیلتہ القدر طلوع فجر تک سلامتی ہی سلامتی ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ۔ جمع کا صیغہ ہے، کبھی یہ جمع کے لئے آتا ہے۔ متکلم مع الغیر متکلم ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اور کبھی یہ تعظیم کے لئے آتا ہے۔ اس سے کثرت نہیں سمجھنی چاہیئے۔ اللہ پاک واحد ہے۔ وہ جب اپنے لئے یہ لفظ اِنَّا نحن وغیرہ استعمال کرتا ہے اور یہ الفاظ قرآن میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ وہاں ان الفاظ سے عظمت ہی مراد ہوتی ہے۔ کثرت مراد نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ ایک ہے۔ کثیر نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایک سے زائد مثلاً اگر دو ہوں گے تو ان میں سے ایک کمال پر قادر ہوگا۔ یا نہیں ہوگا۔ اگر دونوں میں سے کوئی قادر نہیں ہے۔ تو دونوں اللہ بننے کے قابل نہ رہے اگر ایک قادر ہے اور دوسرا قادر نہیں ہے۔ اور جو قادر نہیں ہے۔ وہ اللہ بننے کے قابل نہیں ہے۔ اگر دونوں قادر ہیں تو ایک دوسرے

سے غنی ہوں گے. ایک کو دوسرے کی حاجت نہیں ہو گی. تو یہ بھی احتیاج ہے. کیونکہ دوسرا اس کے قبضہ میں نہیں رہا. دونوں کا ایک دوسرے کا غنی ہونا دونوں کا محتاج و ناقص ہونا ہے. کثرت کی حالت میں قادر ہونے اور قادر نہ ہونے دونوں صورتوں میں نقص اور احتیاج اور عجز لازم آیا. اور نقص احتیاج اور عجز الوہیت کے منافی ہے. یہ اچھی صاف اور واضح دلیل ہے. ایک اور طریقہ ہے. اللہ پاک نے بہت وضاحت سے قرآن میں بیان کیا ہے کہ اگر دو معبود ہوں گے تو تاثیر کرنے میں دونوں مختلف ہوں گے یا متفق ہوں گے. اگر دونوں مختلف ہیں یعنی ایک جسم میں حرکت پیدا کرنا چاہتا ہے اور دوسرا سکون پیدا کرنا چاہتا ہے. اگر دونوں کی مراد کا واقع پر اثر مرتب ہو گیا تو حرکت و سکون ایک ساتھ جمع ہو جائیں گے. جو محال ہے. اگر ایک کی مراد ہو گئی دوسرے کی مراد واقع نہیں ہوئی تو جس کی مراد کے مطابق فعل نہیں ہوا. وہ عاجز ہو گیا. اور نقص عجز الوہیت کے منافی ہے. اگر دونوں متفق ہیں اور دونوں ایک ہی تاثیر مرتب کرنی چاہتے ہیں. تو وہ دونوں تاثیر کرنے میں مستقل ہیں اور جو چیز بنانی چاہتے ہیں. وہ ایک مستقل تاثیر پر مرتب ہوتی ہے. یعنی ایک مخلوق پیدا ہوتی ہے. وہ ایک مستقل تاثیر کی محتاج ہے. مستقل تاثیر اس کے تحقق کے لئے کافی ہے. جب ایک شے مستقل تاثیر سے متحقق ہو چکی تو وہ دوسری مستقل تاثیر سے مستغنی ہو گئی. بے نیاز ہو گئی. اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہی. مثلاً جلانے کے لیے جلانے والا آگ ہونا چاہئے اور

جب ایک ہلانے والے سے جسم ہل گیا تو دوسرے ہلانے والے کی ضرورت نہیں ہے. اس کی احتیاج نہ رہی تو مخلوق اس خالق سے مستغنی ہو گئی. تو جس خالق سے مخلوق مستغنی ہو وہ اللہ بننے کے قابل نہیں رہا. تاثیر مرتب کرنے اور نہ کرنے دونوں صورتوں میں اللہ بننے کے قابل نہ رہا. وہ نہ متفق ہونے کی صورت میں تاثیر کر سکتے ہیں اور نہ مختلف ہونے کی صورت میں تاثیر کر سکتے ہیں. لہذا کثرت محال ہے.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے. لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا. پ سورۃ الانبیاء آیۃ ۲۲
اگر اللہ کے سوا اور اللہ ہوں گے تو یہ زمین و آسمان نظم سے خارج ہو جائے گا. نظام عالم ختم ہو جائے گا اور نظم باقی نہیں رہے گا. نظم کے باقی ہونے کی صورت یہ ہے کہ اگر دو خالق ہوں گے. تو ایک غیر مستقل اور بے کار ہو جائے گا. اور جب ایک غیر مستقل ہو گیا تو دوسرا بھی غیر مستقل ہو سکتا ہے. دونوں خالق نہ رہے. تو پھر مخلوق کہاں رہے گی. اور اگر اختلاف ہوا تو بھی نظام درہم برہم ہو جائے گا. لہذا تعدد خالق ناممکن ہے. خالق واحد ہی ہو گا. یہ بالکل یقینی دلیل ہے. جو اللہ پاک نے بیان کی ہے. متکلمین نے کسی غلط فہمی کی بنا پر اس کو ظنی بنا دیا ہے یہ بالکل یقینی دلیل ہے. ہزاروں دلیلیں ہیں. اس کی واحدنیت پر ہر ہر ذرہ دلیل ہے. اب غور کریں میں کہتا ہوں خالق واحد ہونا واحد ہونے کے خلاف ہے اس وحدت میں کثرت ہے. کیونکہ یہاں ہر شے واحد ہے. جو چیز ہو گی واحد ہو گی. یعنی اس شے کا ہونا اور واحد

ہونا ایک ہی چیز ہے۔ اس میں خدا کے واحد ہونے کی خصوصیت کیا ہوئی
دلائل جتنے ہیں وہ سب اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ ایک ہے
مثلاً ایک انگلی۔ اب خدا بھی ایک۔ انگلی بھی ایک۔ تو ایک ہونے میں انگلی
خدا کی شریک ہوگئی۔ تو واحد کہہ کر بھی شرک کا شرک لازم رہا۔ کیونکہ ہر شے
واحد ہے۔ اس لئے ایک ہونے میں ہر شے خدا کی شریک ہوگئی ہیں تو
غور کیا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ ہر شے واحد ہے تو پھر خدا کے لئے واحد ہونے
کی کیا خصوصیت ہے۔ خاتم النبیین بھی ایک ہیں کتنی ایک۔ تم بھی ایک ہو
شے ایک ہے پھر خدا ایک ہے کے کیا معنی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا
ہے جو ناقابل تقسیم ہے۔ اور یہاں جو ایک ہے۔ وہ قابل تقسیم ہے۔ تو میں
کہوں گا کہ یہاں بھی ایسی چیزیں ہیں۔ جو ناقابل تقسیم ہیں۔ مثلاً انسان کی
روح ہے۔ یہ ناقابل تقسیم ہیں۔ اگر کمال کو کہا جائے کہ وہ یکتا ہے۔
جیسے وہ یکتائے روزگار ہے۔ وہ فلاں فن میں یا علم میں یکتا ہے۔ تو ایسے
یکتا بھی بہت ہیں اس دنیا میں۔ بادشاہ ہے وہ بادشاہت میں یکتا ہے
باقی سب رعیت ہیں۔ وزیر اعظم ایک ہے وزارت عظمیٰ میں اس کا کوئی
شریک نہیں ہے اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر واحد ہونے کے کیا
معنی۔ غور کریں آپ جب وحدت کا تصور کریں کہ وہ وجود کے ساتھ ساتھ
ہوگی۔ الگ نہیں ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ پہلے شے موجود ہو پھر وحدت
لاحق ہو۔ تمام متکلمین اور فلاسفہ نے وحدت کو لاحق قرار دیا ہے۔ یہ پوری قوم
سے لغزش ہوئی ہے اس کو عارضی شے سمجھتے ہیں جیسے مینار کو بلندی

لاحق ہے۔ دراصل بلندی کوئی شئے نہیں ہے۔ اونچا نیچا متحقق ہے۔ اونچے اور نیچے کو دیکھ کر عقل اونچائی اور گہرائی کا اعتبار کرتی ہے۔ فی نفسہ اونچائی اور گہرائی کوئی شئے نہیں ہے۔ اسی طرح واحد شے سے عقل وحدانیت کو اعتبار کرتی ہے۔

فی نفسہ وحدانیت کوئی شئے نہیں ہے۔ لیکن یہ غلط ہے بلکہ وحدت ایک حقیقی شئے ہے اور اس کائنات میں وحدت کہیں نہیں ہے۔ اللہ کے واحد ہونے کے یہ معنی ہیں کہ صرف اللہ ہی واحد ہے۔ اور کائنات بکی ہر شئے کو اللہ کا نام لے کر مجازاً پکارا گیا ہے کیونکہ بغیر واحد کے شئے متحقق ہی نہیں ہو سکتی۔ کثرت کیا ہے؟ وحدتوں کے مجموعے کا نام کثرت ہے۔ اور مجموعیت کوئی شئے نہیں ہے۔ تو جبتک وہ وحدت حقیقی کے نام سے پکارا نہیں جائے گا۔ وہ متحقق نہیں ہو سکتا خالق و مخلوق میں جو ربط ہے۔ وہ اسم الٰہی ہے۔ اور وہ اسم واحد ہے وحدت حقیقی صرف ذات الٰہی ہے۔ وہاں ایک کا لفظ نہیں بولا جائے گا۔ وہ ایک جو یہاں بولا جا رہا ہے۔ یہ صرف سمجھانے کے لئے بولا جاتا ہے حقیقت میں وہ تصور میں نہیں آ سکتی۔ وحدت کیونکہ وہ متحقق ہے۔ اور جو متحقق ہوتی ہے۔ وہ خیال میں نہیں آ سکتی۔ اس کی شکل و صورت یا عنوان ہی آئیگا اور وہ عنوان ہی اس کا اسم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ۔ واحد اسم خدا ہے اور یہ سب اشیاء اس کے نام سے پکاری جا رہی ہیں۔ اگر اس کا نام نہ لیا جائے تو یہ مسمیٰ متحقق نہیں ہوں گی۔ تو کائنات میں کوئی شئے واحد نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب کثرتیں ہیں۔ اور

کثرت بغیر واحد کے متحقق نہیں ہو سکتی۔ تو یہ تمام کثرتیں وحدت پر دلالت کر رہی ہیں۔ کیونکہ وحدت کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ وحدت ہی خدا ہے۔ واحد صرف اللہ ہے۔ اور لا واحد لا کثیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی اللہ واحد ہے اور واحد کثیر نہیں ہے۔ تو اللہ کثیر نہیں ہے۔ علماء خالق اور قادر سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ خالق واحد ہونا چاہئے نہیں بلکہ واحد سے استدلال کرنا چاہئے کہ اللہ واحد ہے۔ اور واحد کثیر نہیں ہے۔ تو اللہ کثیر نہیں ہے۔ ختم۔

تین وحدتیں لیں اور ایک زوایہ بنائیں۔ نوے درجے کا تو ایک نقطہ جو مبدء ہوگا ایک وحدت اوپر ہوگی۔ اور دوسری وحدت کے ساتھ مل کر ایک خط بن جائیگا اور اس کے ساتھ ایک اور وحدت ملائیں گے۔ تو دوسرا خط بن جائے گا۔ اس طرح تین وحدتوں میں ایک مشترک ہوگی۔ جو دوسرے دو نقطوں وحدتوں سے مل کر دو خط بنائے گی۔ اب جو اس کو مثلث بنائیں گے اور اس پر وتر ڈالیں گے تو وہ نہ تین ہوگا نہ دو ہوگا۔ کیونکہ اگر وتر تین ہوگا تو مثلث میں دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے۔ اگر دو ہوگا تو تینوں خط برابر ہو جائیں گے۔ اور تینوں زاویے برابر ہو جائیں گے۔ اور کوئی زاویہ بھی قائمہ نہ رہا۔ حالانکہ فرض کیا تھا کہ ایک زاویہ قائمہ ہے۔ اور دو زاویے حادہ ہیں۔ لہٰذا وہ تیسرا ضلع ۳ اور ۲ کے درمیان ہوگا۔ اور تین اور دو کے درمیان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دو ٹوٹ گیا اور کٹ گیا۔ اور واحد نہ رہا۔ لہٰذا کائنات میں کہیں بھی وحدت نہیں ہے۔ اب رہا نقطہ کہ حکماء نے اس کو واحد کہا ہے کہ اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے تو یہ بھی غلط ہے۔ وہ نقطہ دراصل خط کی طرف ہے۔ جہاں وہ خط ختم ہوتا ہے

وہ خط کا ننھا سا جز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اگر جز ہوگا۔ تو باقی خط سے متصل ہوگا۔ اگر یہ ننھا سا جز ہوگا۔ تو اس کے ایک طرف بقیہ خط ہوگا۔ اور دوسری طرف اس کی خط سے باہر ہے۔ تو یہ ناقابل تقسیم دو طرفہ چیز واحد نہ رہی تقسیم ہوگئی۔ وہ حقیقت میں طرف ہے خط کی وہ اس کا جز نہیں ہے جو واحد قرار دیا جائے۔ اور اس کا جو محل ہے۔ وہ جز لایتجزا قرار دیا جائے۔ اب رہی روح وہ مادی شئے نہیں ہے۔ وہ نہایت لطیف قسم کا جسم ہے۔ جیسے فلک کا جسم۔ اس میں طول و عمق موجود ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہے وہ اس کی روح کی صورت ہے۔

اللہ ہی واحد ہے۔ مخلوقیت اور وحدت دونوں متضاد ہیں۔ دونوں میں تناقض ہے۔ جتنی اشیاء ہیں ان میں کثرت موجود ہے۔ اور واحد صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ جب آپ کسی شئے کی طرف اشارہ کریں کہ یہ ایک ہے تو وہاں تین چیزیں متحقق ہوں گی۔ ایک تو وہ شئے۔ اور دوسری ایک اور تیسرا وہ علاقہ جو ایک اور اس شئے میں ہے۔ جس کی بناء پر اس کو ایک کہا جا رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ حقیقی وحدت نہیں ہے۔ میری انگلی ایک ہے اور قلم ایک ہے۔ جب دونوں چیزیں ایک ہیں۔ تو جو انگلی ہے۔ وہی قلم ہے۔ تو قلم انگلی ہو گیا۔ اور انگلی قلم ہو گئی۔ حالانکہ نہ انگلی قلم ہے۔ نہ قلم انگلی ہے۔ اس سے پتہ یہ چلا کہ ایک کوئی شئے نہیں ہے مگر اس کے بغیر چارہ نہیں تو اس کا نام نامی اسم گرامی 'واحد' لے کر اس کو پکارا جا رہا ہے۔ ورنہ اس کائنات میں ایک کا وجود ہی نہیں ہے۔ تو بسم اللہ کا یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کلام کا آغاز اللہ کے نام سے

ہے۔ بلکہ کائنات کا آغاز اللہ کے نام سے ہے اور وہ نام کیا ہے ؟ واحد ہے۔ اور بغیر اس نام کے یعنی واحد کے آغاز نہیں ہو سکتا۔ جو موجود ہوگا۔ ایک کے بغیر نہیں ہو سکتا تو اس کا اسم لے کر اس کائنات کی ابتدار کی گئی ہے۔ اللہ واحد ہے۔ تو یہاں اِنّا جمع کے لئے نہیں بلکہ اکرام اور عظمت۔ ادب اور تعظیم کے لئے آیا ہے (اِنَّا اَنزَلْنٰہُ فِی لَیْلَۃِ الْقَدْرِ) ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔

ضمیر کا حکم یہ ہے کہ اس کا ذکر لفظاً یا معناً حکماً اوپر ہو۔ ضمیر غائب کی شان یہ ہے کہ مثلاً معناً (اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی) ۔ رپ۔ سورۃ آیت عدل کرو کہ تقوی سے قریب کرنے والا ہے۔ اس میں فعل جس کی طرف اشارہ ہے۔ نہیں ہے۔ مگر امر کے صیغے میں معناً عدل موجود ہے۔ حکماً کی مثال قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ واقعہ یہ ہے بات یہ ہے۔ شان یہ ہے۔ حال یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ آگے جو حال ہے وہ مقدم ہے اور اس کی طرف یہ ضمیر پھیر رہی ہے۔ یہاں تینوں چیزیں مذکور نہیں ہیں۔ نہ لفظاً نہ معناً نہ حکماً ذکر ہے۔ تو اب کیا ہے کہ قرآن کی شان اور عظمت اتنی عام ہے کہ دلوں کے اندر رچا ہوا ہے۔ اس لئے اس کا نام لینے کی حکماً معناً لفظاً ضرورت نہیں رہی۔ سب کو معلوم ہے کہ قرآن ہے۔ اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں رہی۔ مثلاً كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ جب گلے میں جان آ جائے۔ کہیں جان یا موت کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ موت کا واقعہ ہے۔ یہاں اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیلۃ القدر یعنی رات قدر یعنی اندازہ کرنا۔ ایک شئے کو دوسرے شئے کے ساتھ ایسا مطابق کرنا کہ نہ زیادہ ہو نہ کم ہو۔ قدر کے معنی عزت اور شرافت کے بھی ہیں۔ اس کی بڑی عزت

ہے۔ شرافت ہے۔ آبرو ہے۔ اور قدر کے معنی تنگی کے بھی ہیں۔ (وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ) جب بندہ کو آزماتا ہے تو اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔ (فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ) کہتا ہے میرے رب نے مجھے رسوا کر دیا۔ میری روزی کم کر دی۔ (فجر-۱۶) اس رات بھی تمام نظام عالم کے احکامات نافذ ہوتے ہیں۔ مقدر ہوتے ہیں۔ لیلۃ القدر کے یہ معنی ہیں۔ یا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رات کو تمام کائنات کا ایک سال کے لئے تمام علماء کا خیال یہ ہے کہ جتنے معاملات ہیں وہ ازل میں مقدر ہو چکے ہیں۔ اس رات کو کیا ہوتے ہیں؟ وہ سب پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ اس رات ان کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر چیز ازل میں مقدر ہو چکی ہے۔ اور اللہ کے علم میں ہے۔ اور اس رات کو وہ لوح محفوظ پر لکھی جاتی ہے۔ اور مدبران امر پر ظاہر کی جاتی ہے مگر یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ پہلی مخلوق جس کو پیدا کیا وہ قلم ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ) پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا۔ پھر کہا لکھ (فَقَالَ اُكْتُبْ) قلم نے کہا کیا لکھوں (مَا اَكْتُبُ) (ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۰۰) قَالَ لِلْقَلَمِ اُكْتُبْ قَالَ مَا اُكْتُبُ قَالَ كُلَّ شَيْءٍ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۰۰) جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے لکھ دے۔ تو یہ کہنا کہ لوح محفوظ میں اس رات کو اندراج کیا جاتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ ملائکہ برابر لوح کو دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ ان کا لوح محفوظ سے جاہل رہنا بھی عقل میں نہیں آتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس رات میں کاموں کو مقدر کیا جاتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ جدید تقدیر ہوئی گویا خدا کو اس سے پہلے علم نہ ہوا۔ اسی پر دوسرا جوابی اعتراض یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر خدا کے علم میں تھا۔ اب جو مقدر ہو گیا تو گویا وہ علم ختم ہو گیا۔ تھا کا علم ہے یا ہو چکا ہے سے بدل گیا۔ لہذا

علم مقدم ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسی رات کو وہ مقدر کرتا ہے۔ اور یہ مقدر کرنا اس وقت ہے جس کا نام ازل ہے۔ مقدر کرنا ازل ہے۔ اور مقدر ہونا حدوث ہے۔ خدا پر زمانہ نہیں گزرتا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ ازل سے ابد تک ایک آن میں محیط ہے۔ مثال واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔ اس میں حقائق ہیں۔ اتحاد و اشتراک ہوتا ہے۔ اور مثل میں عوارض میں اتحاد و اشتراک ہوتا ہے اللہ کے لئے مثال نہیں ہوتی۔ مثل ہوتی ہے (فلا تضربوا للہ الامثال) اللہ کے لئے مثالیں مت گھڑو۔ پ۱۴۔ س النحل۔ آیت ۷۴)

جس طرح مرکز بیک آن پورے دائرے کو ایک ہی رخ سے دیکھ رہا ہے ہر جز کے مقابلے میں ایک ہی جہت سے دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ اگر دو ہوں گی تو وہ نقطہ نہیں رہیگا۔ اسی طرح پورا محیط عالم اللہ تبارک و تعالیٰ کے بیک آن سامنے ہے۔ (شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن) ہم نے رمضان کے مہینے میں قرآن نازل کیا۔ (بقرہ۔ ۱۸۵) اور یہاں کہا کہ لیلۃ القدر میں اتارا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان شریف کی رات ہے۔ کونسی ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ یہ پہلی شب ہے۔ مگر اکثریت کا خیال ہے کہ یہ اخیر عشرے کی طاق راتوں میں ہے۔ اور زیادہ رجحان ستائیسویں شب کیطرف ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ اس سورۃ میں لفظ لیلۃ القدر تین جگہ آیا ہے اور اس لفظ میں نو حرف ہیں۔ (ل ی ل ۃ ا ل ق د ر) تو تاریخ شب ۹ × ۳ یعنی ۲۷ ہے۔ ایک بزرگ نے یہ کہا ہے کہ لفظ ھی اس سورۃ کا ستائیسواں کلمہ ہے اس لئے ستائیسویں شب ہے۔

قرآن کریم تئیس ۲۳ سال میں تھوڑا تھوڑا اترتا رہا۔ اور یہاں یہ کہا کہ لیلۃ القدر میں اتارا۔ تو اس کے کیا معنی ہیں؟ امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ لیلۃ القدر میں نازل کرنا شروع کیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس رات کو پورا قرآن پہلے آسمان پر نازل کیا۔ پھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے حضور سرور کائناتؐ پر ۲۳ سال میں نازل کیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس شب کی فضیلت و احترام میں یہ سورہ نازل کی۔ یہ سب نقلی باتیں ہیں۔ اس میں عقلی بات نہیں ہے اس لئے میں دخل نہیں دیتا۔

وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ؕ آپ کو کیا معلوم کہ یہ رات کیسی ہے۔ یعنی آپ کو معلوم نہیں ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ عبادت کی افضلیت کا اظہار ہے۔ ایک یہ کہ عابد کی افضلیت کا اظہار ہے یا دونوں کی افضلیت کا اظہار ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ خود اس رات کی فضیلت کا اظہار ہے کیونکہ اگلی ایک آیت بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ جس طرح جمعہ کے دن کو فضیلت دے دی۔ خود دن یا رات میں فضیلت کی قابلیت نہیں ہے کیونکہ یہ سب حرکت کی مقدار اور اندازہ ہے۔ زمانہ جو ہے تیز سے تیز حرکت کا نام زمانہ ہے۔ یہ حرکت دن اور رات کی ہے۔ تو فلک الافلاک کی یہ حرکت شئے واحد ہے۔ اس لئے سب دن ہوں یا رات اُسی حرکت کے اندازہ ہیں ان اندازوں کے نام رکھ لئے۔ ورنہ کوئی فرق ان میں نہیں ہے۔ یہ اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے فضیلت عطا کر دے۔ یہ خوبی کسبی نہیں ہے۔ وہبی ہے۔ جیسے کعبہ کے پتھر کو دوسرے پتھروں سے فضیلت دے دی۔ کوٹھی

اور مسجدیں ایک ہی مادہ سے بنی ہیں مگر ایک مادہ کو دوسرے مادہ پر فضیلت دے دی۔

خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ۔ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

شانِ نزول۔ حضورؐ نے سنا کہ ایک شخص رات میں عبادت، دن میں جہاد ایک ہزار ماہ تک کرتا رہا۔ حضور کا خیال ہوا کہ میری امت تو اتنی عبادت نہیں کر سکے گی۔ اللہ پاک نے اپنے نبی کے لئے رحمت فرمایا کہ ایک رات ہزار ماہ کی عبادت کے برابر ہے۔ یہ سورہ نازل ہوئی۔

دنیاوی سعادتیں ایک ہزار ماہ کی۔ سے دینی سعادت ایک رات کی بہتر ہے۔ لیکن یہ رات پوشیدہ ہے تاکہ بندہ رمضان شریف کی ہر رات کو زندہ کرے اور ہر رات کی فضیلت ہو۔ جس طرح موت کی ساعت کو پوشیدہ کر دیا۔ کہ ہر وقت موت کا خیال رہے اور ہر وقت ڈرتا رہے صلوٰۃ وسطیٰ کو نمازوں میں پوشیدہ کر دیا تاکہ ہر نماز کی فضیلت ہو۔ دلی کو لوگوں میں پوشیدہ کر دیا تاکہ ہر ایک کا احترام ہو۔ مغفرت کو توبہ میں پوشیدہ کر دیا تاکہ ہر وقت ہر بات میں توبہ کرتا رہے۔ اور قبولیت کو دعاؤں میں پوشیدہ کر دیا تاکہ کثرت سے دعا کرتا رہے اور خدا سے لولگائے رہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ۔

تنزل دراصل تتنزل ہے۔ باب تفاعل میں ایک ت کم کر دی جاتی ہے من سبب کا ہے۔ روح اور فرشتے اس رات کو خدا سے اجازت لے کر نازل ہوتے ہیں۔ ہر ایک کام کے لئے کوئی کسی کام سے، کوئی کسی کام سے۔

پہلے سے ان کو اجازت نہیں ہوتی، عابدوں سے ملنے کا ان کو شوق ہوتا ہے اس شوق کو پورا کرنے کیلئے یہ سب اس رات کو زمین پر آتے ہیں۔ روح کے متعلق یہ ہے کہ روح سے مراد انسان کی روح ہے۔ بعض نے کہا قرآن ہے۔ بعض نے کہا خدا کی رحمت ہے بعض نے کہا کہ خالص مخلوق ہے جو نہ انسان ہے نہ فرشتہ وہ اس رات کو نازل ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ملائکہ کی خاص جماعت ہے جو صرف اس رات کو آتی ہے۔ ملائکہ بھی اس جماعت کو صرف اسی رات کو دیکھتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ اتنا بڑا فرشتہ ہے کہ پوری کائنات کو ایک لقمہ میں نگل سکتا ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت جبریل بھی تشریف لاتے ہیں اور عابدین سے ملاقات کرتے ہیں اور جس سے مصافحہ کرتے ہیں اسوقت اس پر گریہ، لرزہ اور خشیت طاری ہوجاتی ہے۔ سلام سب پڑھتے ہیں مصافحہ کیوقت یہ خاص حالت طاری ہوتی ہے۔

سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ یہ رات سلام ہی سلام ہے۔ یعنی کثرت سے سلام پڑھا جاتا ہے۔ یا یہ کہ اور راتوں میں ہلاکت اور سلامتی دونوں ہیں۔ اور اس رات میں صرف سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اور یہ حالت صبح کے طلوع ہونے تک رہتی ہے۔ اس لئے دن خارج ہوگیا۔ بعض لوگوں نے دن کو بھی شامل کیا ہے۔ ایک معنی تنگی کے رہ گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کثرت سے فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ زمین تنگ ہوجاتی ہے اور یہ حالت صبح تک رہتی ہے۔

بشارت: حضور نے فرمایا کہ جو اس سورہ کو پڑھے گا اس کو لیلۃ القدر کی عبادت کا ثواب ملے گا۔ یہ انتہائی شفقت ہے کہ اُمت میں ہر ایک اتنی محنت شاقہ نہیں کرسکتا تھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ
مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَۃُ ○ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتْلُوْا
صُحُفًا مُّطَھَّرَۃً ○ لا فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ○ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنَۃُ ○ وَمَآ
اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ○ لا حُنَفَآءَ
وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ ○
اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ
فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط اُولٰٓئِکَ ھُمْ شَرُّ
الْبَرِیَّۃِ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لا
اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ○ جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ
فِیْھَآ اَبَدًا ط رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط ذٰلِکَ لِمَنْ
خَشِیَ رَبَّہٗ ○ ع

لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ ...... الخ

کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں وہ جدا نہیں ہوئے۔ مُنْفَکِّیْنَ کے معنی جدا۔ انفکاک۔ جیسے ہڈی پر گوشت چمٹا ہوا ہوتا ہے۔ گوشت کو ہڈی سے علیحدہ کرنے کا نام انفکاک یا فک ہے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس بیّنہ آئی۔ ایسی حجت جس سے حق اور باطل الگ ہو جائیں۔ حق و باطل میں جو حجت یا دلیل تمیز کر دے اور اس کو بیّنہ کہتے ہیں۔ قرآن شریف میں جو لفظ بَیِّن اور بیّنہ آیا ہے تو بیّنات اس دلیل کو کہتے ہیں جو حق کو باطل سے فوراً ممیّز کر دے اور وہ بیّنہ کیا چیز ہے۔ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰہِ یتلو صحفا مطھرۃ فیھا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ یہ رسول اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے۔ رسولؐ کی ذات حجت قاہرہ اور حجت باہرہ ہے۔ جب اس کے ایک ایک جز پر نظر ڈالیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ برحق اور سچ ہے۔ اسؐ کے اٹھنے پر بیٹھنے پر۔ چلنے پر ہر حالت میں۔ جب آپؐ چلتے تھے تو دائیں بائیں نہیں دیکھتے تھے۔ سامنے نظر رکھتے تھے۔ کھانے کے متعلق نبی کریمؐ کا مسلسل تین دن کبھی پیٹ نہیں بھرا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک دن میں بھوکا رہوں اور ایک دن پیٹ بھروں۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں پیش کر سکتے۔ سارے عالم کا اس پر اتفاق ہے کہ چالیس برس تک جھوٹ نہیں بولا: ابوبکرؓ۔ اور ابوجہل اس پر دونوں متفق ہیں۔ نبوت میں تو اختلاف ہے۔ مگر جھوٹ نہ

بولنے میں دونوں متفق ہیں کہ چالیس سال تک آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور دوسرے آپؐ کے اخلاق کے بارے میں سارا قرآن بھرا ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی ذات کس درجہ روشن تھی۔ جس طرح باپ اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیتا ہے۔ اسی طرح آپؐ کو دیکھتے کے ہی لوگ پہچان لیتے تھے کہ آپؐ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ اور یہ لوگ جو کہہ دیتے ہیں کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ میں تمہاری طرح انسان ہوں اور اس سے غلط نتیجے نکالتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مثل بشر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو مشترک اجزا ہیں۔ ان میں مماثلت ہے۔ فرق جو ہے وہ وحی کا ہے۔ وحی ایسی چیز تو نہیں ہے کہ اس کو فرق کرکے الگ ڈال دیا جائے بلکہ بشریت کے ساتھ وحی مل کر کیا چیز بن گئی پھر اس قسم کا لفظ بولنا جائز نہیں ہے۔ اس کو غور سے سمجھیں کہ انسان کل چیزوں میں حیوان کے ساتھ مشترک ہے۔ وہ بھی کھاتا ہے۔ آپ بھی کھاتے ہیں۔ وہ پیتا ہے آپ بھی پیتے ہیں۔ وہ بچے دیتا ہے۔ آپ بھی بچے دیتے ہیں۔ مکان اس کا بھی ہے آپ کا بھی ہے۔ اچھا برا الگ چیز ہے۔ وہ بھی آپ کے تخیل میں اچھائی برائی ہے۔ مذاق کے حساب سے اچھائی برائی ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں قورمہ بہت بڑا اچھا چیز ہے مگر یورپ کے لوگوں کو کھلائیں تو ان کے آنسو نکل آئیں اور وہ کبھی پسند نہ کریں۔ اسی طرح ہمارے لئے گودا اور جانوروں کے لئے چھلکا اچھا ہے۔ ان کا مذاق ہی اس قسم کا بنایا ہے۔ دونوں برابر ہیں۔ جانور اور انسان میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ تو اب آپ کسی بھلے آدمی سے یہ کہہ دیں کہ تو کتے جیسا ہے۔ جانور جیسا ہے۔ یہ بات کہنی صحیح ہوگی۔ یا غلط ہوگی۔ یہ بات

نہیں کہنی چاہیے۔ رہا خدا کے متعلق کہ خدا نے کہا کہ تم ایسا کہدو کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف - ۱۱۰) تو خدا کو حق ہے جو چاہے سو کہدے۔ خدا نے یہ بھی کہدیا کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰى۔ تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا۔ مگر مسلمان اگر یہ کہدے کہ محمد عَبَسَ وَ تَوَلّٰى۔ محمد نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، تو کہتے ہی کافر ہو جائیگا یا کسی ... ت سے دیکھے گھور کر تو کافر ہو جائے گا۔ تو یہ آداب ہیں۔ خدا کو خوب معلوم تھا کہ عیسیٰ علیہ السّلام نے جھوٹ نہیں بولا۔ اور تثلیث کی تبلیغ نہیں کی۔ خدا کو کیا ہم کو معلوم ہے کہ انھوں نے تثلیث کی تبلیغ نہیں کی، مگر اس نے پوچھ لیا کہ کیا تو نے کہا تھا کہ مجھکو اور میری ماں کو معبود کہنا ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو خدا کو حق ہے جو چاہے کہے جو چاہے پوچھے۔ (المائدہ - ۱۱۶) ہم کو کہنے کا اس وقت حق ہے جب خدا اور رسولؐ یہ کہدے کہ اس طرح کہو۔ خدا نے ہم سے یہ کہا کہ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (الحجرات - ۲) اور یہ تم سے نہیں ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ سے کہا کہ تمھارے عمل تباہ ہو جائیں گے اور کسی کی تو گنتی ہی نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی عظمت کیا ہے۔ تو خدا جو چاہے کہدے نبی کو مگر ہر شخص نہیں کہہ سکتا جب تک خدا اجازت نہ دے اور خدا کی اجازت بھی نبی کے واسطے سے ہوگی نبی بتائے گا کہ ایسا کہو ایسا نہ کہو۔ يَتْلُوْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یہ بینہ سے بدل ہے۔ رسول یعنی حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ یہاں تک کہ ان کے پاس رسول آجائے اور وہ رسول من اللہ کہا کرتے تھے۔ يَتْلُوْا

صُحُفًا مُّطَهَّرَةً پڑھتے تھے صحیفے۔ صحف جمع صحیفہ کی ہے۔ صحیفے کہتے ہیں کاغذوں
کو جن کاغذوں میں مضمون لکھا جائے۔ وہ صحیفے کیسے تھے۔ پاک تھے۔ پاک
یعنی باطل کا اس میں نام نہ تھا۔ باطل اور جھوٹ کی گندگی سے وہ پاک تھے۔ ان
صحیفوں میں کیا تھا۔ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ ان میں کتاب تھی۔ کتاب معنی حکم۔ کتب
کے معنی احکام۔ قیمۃ بمعنی مستقیمہ۔ سیدھے۔ اس میں سیدھے سیدھے احکام
لکھے ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ
الْبَيِّنَةُ۔ اور حق سے اہل حق جدا نہیں ہوئے مگر بینات کے آنے کے بعد۔ ایک
مفسر ہیں واقدی رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ
مشکل یہ آیت ہے۔ اس کی تفسیر بہت مشکل ہے مگر وجہ اشکال کی نہیں بیان کی کہ اس
میں دقت کیا ہے۔ امام رازی نے اس کو نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے لکھا ہے کہ میری
سمجھ میں اس میں دقت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ نہیں تھے کفار خواہ
وہ اہل کتاب ہوں۔ یہاں مِن تبعیضیت کا نہیں ہے۔ اہل کتاب میں سے
نہیں بلکہ نہیں تھے کفار۔ اور وہ کفار کون ہیں۔ بیان کا ہے ترجیم کا ہے مِن۔
وہ وہ تھے جو جدا نہیں تھے۔ تو یہاں ذکر نہیں ہے کہ کس چیز سے جدا نہیں تھے۔
مُنفَكِّينَ وہ جدا نہیں ہوئے۔ کس چیز سے جدا نہیں ہوئے۔ تو اس کا متعلق
انہوں نے نکالا عَنْ كُفْرِهِمْ وہ اپنے کفر سے جدا نہیں ہوئے۔ یعنی کفر ہی پر
رہے۔ اہل کتاب اور مشرکین کفر ہی پر رہے۔ اس سے جُدا نہیں ہوئے۔ یہ انہوں
نے اس کا متعلق

جب تک ان کے پاس رسول یا بلّنیہ آگیا حتّیٰ کے معنی یہانتک کہ ۔ یہانتک کے معنی یہ ہیں۔ کہ غایت وہاں منتہی ہو جائے۔ انتہائے غایت کے لئے آتا ہے حتّیٰ، تو ان کے جدا ہونے کی جو غایت تھی وہ بیّنہ کا آنا تھا۔ اور رسول کا آنا تھا۔ یعنی رسول کے آنے تک جدا نہ ہونے کی غایت تھی اس کے معنی یہ ہوئے کہ رسول آیا تو وہ جدا ہو گئے۔ یعنی کفر سے جدا نہ ہوئے، کبتک جبتک رسول نہ آیا رسول آگیا تو وہ اس سے جدا ہو گئے۔ اب آگے جو دوسری آیت ہے۔ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْ هُمُ الْبَيِّنَةُ نہیں جدا ہوئے وہ مگر کتاب بینہ آجانے کے بعد۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ رسول کے آنے کے بعد حق سے جدا ہوئے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ کے معنی ہوئے نہیں جدا ہوئے اہل کتاب۔ کا ہے سے۔ عَنِ الْحَقِّ۔ عَنِ الْإِيمَانِ۔ حق سے اور ایمان سے جدا نہیں ہوئے مگر بعد آنے رسول کے۔ یعنی رسول کے آنے کے بعد بے رخی اور نا حقی بڑھی اور جدا نہ ہوئے۔ دوسری آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ رسول کے آنے کے بعد زیادہ کفر ہوا۔ اور پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول کے آنے کے بعد کفر ختم ہو گیا یہ ہے اشکال اور دقت کہ ایک آیت دوسری آیت کی ضد ہے۔ تو زمخشری نے اس کا جواب دیا اور امام رازی اس پر متفق ہو گئے اور دوسرے علما بھی۔ انھوں نے جواب دیا کہ پہلی آیت حکایت ہے۔ اہل کتاب یہ کہا کرتے تھے کہ ہم اس وقت تک اپنے دین سے جدا نہ ہوں گے۔ جب تک نبی جس کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہ نہ آجائے۔ اور ان کا دین جو ہے کفر ہے۔ اور یہی بات مشرک بھی کہتے تھے۔ یہ حکایت ان کی اللہ نے

نقل کی ہے۔ یہ واقعہ نہیں ہے۔ اور دوسری جو آیت ہے وہ واقعہ کے مطابق
ہے۔ کہ جب نبی آگیا تو پھر وہ پھر گئے اور ایمان نہیں لائے اور تفرقہ بڑھ گیا۔ امام
رازی نے فرمایا کہ یہ سب سے بہتر جواب ہے اور یہ زمخشری نے دیا ہے
مگر یہ بات تو ہے کہ یہ آیت کے معنی تو ٹھیک ہو گئے مگر یہ صحیح تو جب تک کہ جب یہ
واقعہ ہو۔ واقعہ یہ نہیں ہے۔ کیونکہ اہل کتاب یہودی اور نصرانی اپنے اپنے
مذہب پر تھے اور وہ کافر نہ تھے بلکہ توریت و انجیل پر اگر وہ صحیح عمل کر رہے
تھے تو وہ مومن تھے۔ یہ میں کہتا ہوں کہ نبی کے آنے سے پہلے کچھ لوگ ایسے تھے
جو غیر محرف انجیل اور توریت پر عمل کر رہے تھے تو ان کے ایمان اور عمل میں
کیا شک ہے۔ اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ دوسری آیت میں صرف اہل کتاب
نے کفر میں زیادتی اور شدت اختیار کی۔ حالانکہ اس میں مشرک بھی تھے۔
مشرکوں نے ان سے بھی زیادہ کیا۔ زیادہ سختی تو مشرکین ہی نے کی ہے۔ تو
یہ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وجہ سمجھ میں نہ آنے کی میں نے بیان کر دی
اور بعض مفسرین معتزلہ نے یہ کہا ہے کہ حتیٰ کے معنی قران کے ہیں اگر چہ
کہ کافر ہوں یا مشرک ہوں جب نبی آگیا تب بھی جدا نہیں ہوئے۔ امام
فخرالدین نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ حتیٰ کے معنی اگر چہ کہیں نہیں ہیں لغت
عرب میں یہ تو ان کا اعتراض ہے اور ہمارا اعتراض یہ ہے کہ آگے اہل
کتاب ہی کا ذکر ہے۔ مشرک اس میں شامل نہیں ہے۔ وہ نفع نہیں دیتا کچھ
بھی۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ نبوت سے پہلے یہ مشرکین اور اہل کتاب نبی کی
تعریفیں کیا کرتے تھے اور جب نبوت آگئی تو ان کی برائی کرنے لگے اور کفر کرنے لگے

نو اس میں یہ خرابی ہے کہ نبی کا آنا اہل کتاب کو تو معلوم تھا مگر مشرکین کو تو اس کا پتہ بھی نہیں تھا۔ کہ کوئی نبی آنے والا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ایک آدھ اور مفسرین نے بھی کوئی بات کہی ہے اگر یاد آگئی تو وہ بھی بتا دوں گا۔ صحیح بات جو میرے خیال میں آئی وہ یہ ہے۔

اہل کتاب اور مشرک جس حالت میں تھے ایمان کی حالت ہو یا کفر کی۔ حالت ہو وہ اپنی حالت سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ کب تک جدا نہیں ہوئے۔ جبتک ان کے پاس رسول آگیا۔ یہ جو حَتّٰی ہے یہ ذرا مشکل ہے۔ اور یہ بات بغیر سوچے میرے دل میں آئی ہے۔ یہاں تک رسول آگیا۔ تو یہ حَتّٰی جو تم انتہائے غایت کے لئے کہہ رہے ہو واقعہ کے مطابق ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ حَتّٰی واقعہ کے مطابق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ عمل کے لئے بھی ہو اگر کوئی ٹائم مقرر کر دیا جائے۔ عصر کی نماز کا وقت ۵ سے ۱/۲ ۶ بجے تک ہے۔ اور پھر غروب کا وقت شروع ہو جاتا ہے تو غایت عصر کی تو ۱/۲ ۶ تک ہی ہے یہ واقعہ کے مطابق تو ہے۔ لیکن عمل کے لئے ضروری نہیں ہے۔ کہ عمل واقعہ کے مطابق ہو بس یہی ایک نئی بات ہے۔ یعنی فلاں شخص سوتا رہا۔ یہانتک کہ سورج نکل آیا۔ سونے کے وقت کی غایت تو رات کا ختم ہو جانا تھا اور دن کا نکلنا سونے کے وقت میں شامل نہیں تھا۔ تو یہ واقعہ کے مطابق ہے۔ مگر عمل کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ دن نکلنے کے بعد بھی سوتا رہا۔ غایت کی انتہا کے لئے حَتّٰی بے شک ہے لیکن یہ واقعہ میں ہے۔ عمل کے لئے نہیں ہے عمل اس کے خلاف بھی ہو رہا ہے۔ تو عمل اس کے خلاف ہو سکتا ہے اور

اور ہوتا ہے۔ تو اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اپنی حالت پر رہے یہانتک
کہ نبی آگیا۔ پھر بھی انھوں نے اپنی حالت نہیں بدلی۔ برابر کفر و شرک پر اڑے
رہے اور نبی کا آنا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہوا۔ نبی کا آنا اس لئے تھا کہ وہ
حالت میں تبدیلی کر دے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی حالت پر اڑے رہے اور
جمے رہے۔ نبی کا آنا ان کے لئے نفع بخش نہیں ہوا بلکہ نبی کے آنے کے بعد ان
کی حالت اور خراب ہو گئی۔ اب بات بالکل ٹھیک ہو گئی اور اہل کتاب کا خاص
طور پر ذکر یوں کیا دوسری آیت میں۔ کہ خیر مشرکوں کو تو کچھ پتہ نہیں تھا مگر ان کو
کیا ہو گیا۔ ان کو تو اطلاع تھی اور ان کی کتاب میں ذکر تھا کہ نبی آنے والا ہے۔
اس لئے ان علماء کا خاص طور پر ذکر کیا۔ کم سے کم ان کو تو ایمان لانا تھا۔ ان کو
تو اپنی حالت کا بدلنا تھا۔ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ۔ اور نبی
کے آنے کے بعد تو ان کی حالت بدلنا تھی۔ کیونکہ نبی نے کوئی ایسی بات تو
نہیں کہی جو نادرستی کی ہو۔ وَمَا أُمِرُوا۔ نہیں حکم دیئے گئے وہ لِ۔ یا اِنَّ۔
اللہ کی عبادت کے ساتھ یعنی ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت
نہ کریں اور یہ بات نادرستی کی نہ تھی۔ ان کو مان لینا تھا اہل کتاب کو اس لئے
شامل کیا کہ ان کو بتایا کہ عبادت کس طرح کریں۔ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ۔ خالص
دین کے لئے۔ یعنی خالص نیت ایک ہی داعی کی ہو۔ آدمی جو فعل کرتا ہے اعضاء
سے کرتا ہے۔ اعضا حرکت کرتے ہیں۔ جب قدرت ان کو ڈھکیلتی ہے۔ قدرت
کو ارادہ ڈھکیلتا ہے۔ ارادہ جب ڈھکیلتا ہے جب اس کے کرنے کا حسن

انسان کے خیال میں ہو۔ حسن یعنی خوبی دل میں ہوتی ہے۔ تو عبادت نہ اس لئے کرو نہ اُس لئے کرو بلکہ خالص خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کرو۔ یکطرفہ ہو۔ ایک داعیہ ہو۔ یہ معنی اخلاص کے ہیں۔ نہ جنّت حاصل کرنے کے لئے ہو۔ نہ دوزخ سے بچنے کے لئے بلکہ رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ اسی کا نام اخلاص ہے۔ اس کو خالص نیت کہتے ہیں۔ اور حال تمہارا یہ ہو کہ تم حنیف ہو۔ حنیف کہتے ہیں۔ جو باطل سے بھاگ کر حق کی طرف آئے۔ یعنی یہ اعلان کرے کہ ہم باطل سے بیزار ہیں اور حق کی طرف ہیں۔ یہ شرط ہے اس ہیں۔ اللہ سے محبت ہو اور غیر اللہ سے بیزاری ہو۔ تولیٰ اور تبریٰ دونوں ساتھ ہو۔

تم یہ اعلان کرنا ہوگا کہ شرک کرنے والوں سے میں بیزار ہوں۔ یہ بتایا رسولؐ نے کہ اس طرح عبادت کرو۔

خالص نیت مقید ہے۔ خالص نیت کو نیت لازم ہے۔ تو امر ہوا خلوص نیت کا یعنی جس شئے کا امر ہوا ہے۔ اس کی شرط ہوئی نا اخلاص اور اخلاص معنی خالص نیت جس شئے کے ساتھ امر ہوگا۔ اس شئے کے ساتھ نیت ہونی چاہیئے۔ ہر مامور نیکی جس کے ساتھ امر ہوا اس کے ساتھ نیت بھی ہونی چاہیئے۔ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو وضو کرو۔ دھونے کا حکم ہوا۔ تو وضو میں بھی نیت ہونی چاہیئے ورنہ وضو نہیں ہوگا یہ امام شافعیؒ کا عقیدہ ہے اور جتنے شافعی ائمہ ہیں سب یہ دلیل بیان کرتے: خالص نیت کو نیت لازم ہے یہ ایک فلسفی اصول ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اسلئے کہ مقید کو مطلق لازم ہے۔ یہ تمام فلسفے کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ جہاں مقید صادق ہوگا۔ وہاں مطلق بھی صادق ہوگا۔ یعنی جہاں گرم پانی ہوگا وہاں پانی ہوگا۔

سورہ۔ لَمْ یَکُنُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا

بے شک جو لوگ کافر ہوئے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں
سب جہنم میں ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ یہ بدترین خلائق ہیں۔ آگے خبریں محذوف
ہیں۔ مجوس ہوں۔ دہریہ ہوں سب یہ دو فرقے نمایاں تھے۔ اس لئے ان کا ذکر کر دیا
ورنہ ان دو کے علاوہ بھی جتنے فرقے کفار کے ہیں۔ سب ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں ہیں گے
اور ان کی حسرت یہ بیان کی کہ تمام کائنات سے بدتر ہیں۔ بَرِیَّہ باری سے مشتق ہے۔
باری خالق کو کہتے ہیں۔ بریہ مخلوق کو کہتے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے
اور انہوں نے نیک کام کئے۔ یہ بہترین مخلوقات ہیں۔ تمام مخلوق سے یہ بہتر ہیں
کون جو ایمان لائے مومن۔ اور نیک کام کئے عامل۔ جن کا عمل صالح ہے۔ مومن
باعمل بہترین مخلوقات ہے۔ اور ان کی جزا اور ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس
ہے عِنْدَ رَبِّھِمْ کی قیدیوں لگا لی کہ جیسے کسی کو کسی کا لینا ہوتا ہے۔ اور وہ تقاضا
کرتا ہے۔ تو دیندار آجکل کرتا ہے تو وہ کسی صاحب حیثیت بڑے سیٹھ کی
طرف دیکھتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ میں ذمہ دار ہوں تو لیندار مطمئن ہو جاتا ہے
کہ آگئے۔ تو جتنا اہم آدمی ہوتا ہے۔ اس کا خالی زبان ہلا دینا کافی ہوتا ہے تو عند ربہم
کی قید سے یہ فائدہ ہے۔ کہ اگر کہیں اور رکھا ہوتا تو ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس
لئے وہ رب کے پاس ہے۔ اور ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور وہ اجر

کیا چیز ہے۔ جنّٰت عَدْنٍ۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں۔ عدن کے معنی ہمیشہ رہنے والے۔ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ چونکہ خدا کی رحمت وسیع ہے۔ اس لئے رحمت و وسعت کا اظہار اللہ نے ابد سے کر دیا۔ ورنہ وہاں سزا بھی ابدی ہے۔ وہاں ابد کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ ابد کا لفظ یہاں استعمال کیا۔ تاکہ اس کی رحمت کی وسعت کا خیال کریں اس سے فائدہ اٹھائیں اور شوق پیدا ہو۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ ان کے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہ رضا الٰہی کن لوگوں کے لئے ہے۔ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

یہاں مشکل اور باریک باتیں ہیں غور کریں۔ اس کا تعلق مفسرین کی تفسیر سے نہیں ہے۔

کافر ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ہمیشہ کے معنی جو کبھی منقطع نہ ہو۔ کافر ہمیشہ ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے اور یہی صحیح ہے۔ دوسری۔ تیسری صدی میں۔ بعض بد عقیدوں نے یہ عقیدہ ایجاد کر دیا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے بلکہ یہ سزا پا کر جہنم اور جہنمی سب مٹ جائیں گے۔ صرف ایک ہی گروہ رہ جائے گا۔ بعض بد عقیدوں نے یہ کہا کہ نہیں۔ یہ آگے چل کر بالکل شل ہو جائیں گے۔ ان پر زمانہ نہیں گذرے گا۔ جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت میں ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ کوئی استمرار نہیں ہو گا۔ اس زمانے کے لوگوں کو یہ بات پسند آ گئی اور انہوں نے کہہ دیا کہ یہ شفاخانہ ہے اور علاج کے بعد واپس آ جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

آج کل سے مراد ۵۰ برس پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں

شبلی اور ان کے شاگرد ندوی وغیرہ۔ مگر صحیح یہی ہے کہ وہ ابدی ہے ورنہ خوف ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ دیر میں سہی لیکن نکل ضرور آئیں گے۔ بچ جائیں گے۔ اس طرح اگر جنت کا خاتمہ ہو تو شوق جاتا رہے گا۔ نہیں بلکہ ایک گروہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اور ایک گروہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ پہلی بات یہ فرمائی کہ کافر ہمیشہ جہنم میں ہے۔ کافر جہنمی ہے۔ صاحبُ النّار ہے۔ کافر آگ کا صاحب ہے۔ یہ تو نصی طور پر ہوا۔ اب عقلی طور پر اس کو سمجھیں کہ کافر کو کیوں جہنم ملے گی۔ اور کیوں صاحب النار ہے۔ یہ میں کہتا ہوں۔ یہاں دو خطاب ہیں۔ ایک تو تکوینی ہوتا ہے۔ جو لفظ کن سے ہوتا ہے۔ جیسے کہا ہو، اور وہ فوراً ہو گئی۔ خطاب تکوینی میں ضروری نہیں ہے۔ کہ مخاطب موجود ہو۔ قدیم فلاسفہ کو یہی شبہ گذرا کہ مخاطب موجود ہے۔ یا معدوم ہے۔ اگر موجود ہو تو خطاب کی ضرورت نہیں اور معدوم ہے تو معدوم کی طرف خطاب جائز نہیں حکمار اسلام کو یہی شبہ ہوا ہے اور بعینہٖ یہی شبہ تمام دہریوں، فلسفیوں کو قدیم یہودیوں کو ہوا۔ خدا نے عالم کو پیدا کیا۔ ایجاد کیا تو کس وقت پیدا کیا۔ عالم موجود تھا اس وقت کیا یا عالم معدوم تھا اس وقت کیا اگر موجود ہونے کے وقت ایجاد کیا تو اس ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تحصیل حاصل ہے۔ اگر معدوم ہونے کے وقت ایجاد کیا تو عدم کے وقت وجود لازم ہوا اور یہ اجتماع النقیضین ہے۔ یہ محال ہے۔ لہٰذا دونوں صورتیں محال ہوئیں لہٰذا کوئی ایجاد نہ ہوئی اور کائنات کا خالق کوئی نہیں ہے۔ یہ تقریر دہریوں کی ہے۔ جواب دونوں کا ایک ہی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایجاد وجود سے مقدم نہیں ہے۔ بلکہ وجود اسی ایجاد

کا نتیجہ ہے۔ ایجاد اور وجود دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک ہی وقت میں ہیں ان میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ مثلاً ہاتھ کا ہلنا۔ کتاب کے ہلنے میں موثر ہے۔ جو ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہلانا مقدم ضرور ہے مگر ہاتھ کا ہلانا اور کتاب کا ہلنا دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے۔ اگر ہلنے کا زمانہ ہلانے کے زمانے سے پہلے ہوتا تب تحصیل حاصل لازم آتی ہے۔ اسی طرح ایجاد اور وجود کا زمانہ ایک ہے۔ اس میں تحصیل حاصل نہیں ہے۔ حاصل کی تحصیل جب لازم آئے گی۔ جب وجود ایجاد سے مقدم ہو۔ ہر جگہ یہی تقریر ہو گی کہ ہم کہتے ہیں کہ ہل رہا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہل رہا ہے۔ کیونکہ ہلنے کے وقت ہلایا تو تحصیل حاصل ہوئی اور نہ ہلنے کے وقت ہلایا تو ہلنا اور نہ ہلنا ایک وقت میں ہو گئے اور یہ محال ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں شے ہل بھی رہی ہو اور نہیں بھی ہل رہی ہو لہذا دونوں باتیں غلط ہو گئیں۔ لہٰذا یہ ہلتا ہوا نہ ہلتا ہوا ہے۔ آدھی کائنات کا جو شبہ ہے اس کا یہی فارمولا ہے۔ فلسفی جو دعویٰ ثابت کرتا ہے۔ اس میں سے آدھے دعوے اس فارمولے سے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا جواب وہی ہے۔ جو اوپر بتلایا کہ وجود اسی ایجاد کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح یہی جواب وجود کا ہے۔ کہ ایجاد و وجود میں تقدیم و تاخیر نہیں ہے۔ بلکہ وجود اسی ایجاد کا نتیجہ ہے یعنی جس وقت کُن ہے اسی وقت یکون ہے۔ دونوں ساتھ ہیں۔ پہلے ہو گا تو تحصیل حاصل ہو گی بعد میں ہو گا تو اجتماع النقیضین لازم آئیگی۔ دونوں عین ایک ہی وقت میں ہیں۔ ایک خطاب کن سے ہوتا ہے یہ خطاب تکوینی ہے اور ایک خطاب تکلیفی ہوتا ہے۔ وہاں وہ کہتا ہے،

"افعل و لا تفعل" یہ کر اور یہ نہ کر۔ "ہو" - یہ خطاب تکوینی ہے۔ اور جھوٹ
نہ بول۔ سچ بول۔ یہ کر یہ نہ کر۔ یہ خطاب تکلیفی ہے۔ جس وقت خطاب
تکوینی ہوتا ہے۔۔ وہ کہتا ہے "ہو" وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ نہ ہونے کے
بعد ہونا اسی کو حدوث کہتے ہیں۔ وہ حدوث آن اول میں ہو جاتا ہے۔ اب
پہلی آن میں وہ ہوگئی۔ پہلی آن کے بعد دوسری اس کے بعد کل آن میں موجود کا
ہونا۔ یہ بقا کہلاتی ہے۔ اب یہاں کائنات دو قسم ہے۔ ایک قسم وہ جن
کے ساتھ صرف خطاب تکوینی ہی متعلق ہے۔ یعنی مکلف بہ تکوین ہے یعنی درخت
ہونے کی تکلیف دی جا رہی ہے۔ اور ایک مخلوق ایسی ہے جس کے ہونے
کے بعد یہ تکلیف دی جا رہی ہے کہ یہ کر اور یہ نہ کر۔ جو کائنات تکوینی ہے اس
کی بقا بھی تکوینی ہے۔ پہلی آن میں کہا "ہو" سورج ہوگیا اور اور دوسری آن
میں کہا دنیا کو روشن کر۔ روشنی دے رہا ہے۔ اپنے اختیار سے نہیں دے
رہا ہے۔ وہ بھی کن سے ہی ہوئی ہے۔ لہٰذا بقا میں بھی وہ کن کا ہی محتاج
ہے۔ انسان کو چھوڑ کر کل کائنات بقا میں بھی کن کی محتاج ہے۔ یہ انسان ہی ہے
جو حدوث میں مخاطب بہ خطاب تکوینی تھا۔ اور بقا میں مخاطب بخطاب تکلیفی
ہے۔ کل کائنات سے کہا پہلی آن میں "ہو" وہ ہوگئی۔ پوچھا اب کیا کروں
کہا۔ جو کچھ تجھے کرنا ہے وہ بھی میں ہی کرتا ہوں۔ جب انسان سے کہا "ہو" وہ
ہوگیا۔ اس نے کہا اب کیا کروں۔ کہا جو کچھ کرتا ہے۔ دوسری آن میں کر
اور اس طریقے سے اپنے اختیار سے کر۔ تو انسان بقا میں تکوین کا محتاج
نہیں

خدا نے جن کاموں کیلئے چیزوں کو پیدا کیا۔ اس کام کو خود ان میں پیدا کر دیا اور انسان کو جس کام کے لئے پیدا کیا۔ اس کام کو ان میں خود پیدا نہیں کیا بلکہ ان کو اختیار دیا کہ اپنے اختیار سے وہاں تک پہنچ۔ اور خود اس کام کو پیدا کر۔ اب یہاں دو چیز ہو گئیں۔ حدوث یا وجود اور بقا۔ اب اس کو سمجھنے کے بعد اصول یہ بنا کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور کہا کہ یہ کر۔ جس نے وہ کر لیا۔ اس نے وجود کے ساتھ بقا کو قائم کر لیا۔ اسی کو ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں۔ اور کافر نے وہ نہ کیا تو اس نے پوری کی پوری بقا کو وجود سے کاٹ ڈالا یعنی آن ثانی کو آن اول سے کاٹ ڈالا تو وہ بقا کی میزان تک پہنچے گی کیسے۔ وہ تو کٹ گیا نا ــــ اور کاٹنے کے جتنے اسباب ہیں سب ناقص اور نامکمل ہیں۔ سوائے آگ کے۔ کاٹ کے آپ قیمہ کر دیں۔ تب بھی اجزا جدا جدا نہ ہونگے۔ آگ ایسی چیز ہے کہ انفصال کرنے میں سب سے اہم سبب ہے۔ تو جب وہ کٹ گیا۔ تو وہ ان اسباب میں رہا۔ جو جدائی کے ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم آگ ہے۔ تو یہی معنی ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ آگ میں رہنے کے۔ اب یہ کہ وہ ہمیشہ کیوں رہیگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اس نے درحقیقت کاٹا ہے۔ چھیلا نہیں ہے۔ اگر انگلی چھل جائے یا کسی قسم کا زخم ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے اور بعض دواؤں سے نشان بھی جاتا رہتا ہے۔ لیکن اگر انگلی کٹ جائے تو کبھی نہیں نکلے گی۔ تو اسی طرح چونکہ اسے کاٹ دیا تو وہ کبھی نہیں بھرنے کا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ اسی انفصال میں رہے گا۔ یہ ہمیشگی جہنم کی دلیل ہے جو بیان کی اور فاسق نے چھیل دیا ہے تو وہ مرہم پٹی کے بعد اصلی حالت پر آجائے گا۔ اُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ

یہ بدترین خلائق ہیں۔ یہاں تین قسم کی مخلوق ہوئی۔ ایک تکوینی کہ وہ جس کام کے لیئے پیدا ہوئیں ان کا مقصد انسان میں صرف ہونے کا وہ پورا ہو گیا۔ ایک وہ تکلیفی مخلوق کہ وہ جس کام کے لیئے پیدا کی گئی تھی وہ اپنے اختیار سے اس نے پورا کر دیا۔ یعنی مومن۔ تیسری وہ مخلوق تکلیفی جس نے وہ کام نہیں کیا۔ جس کے لیئے وہ پیدا ہوئی۔ یعنی کافر۔ تو پوری مخلوق نے اپنا کام کر لیا۔ صرف کافر ہی وہ مخلوق ہے جو اپنے مراد کو نہ پہنچ سکی۔ اسلئے یہ بدترین جملہ خلائق ہیں۔ اسی لیئے کافر کہے گا۔ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا۔ اے کاش میں مٹی ہوتا۔ کیونکہ مٹی نے بھی اپنے وجود کا مقصد پورا کر دیا اور یہ مٹی سے بھی بدتر ہو گیا۔ جیسے قورمے کی دیگ ہے۔ اگر اس میں چوہا گر جائے تو پوری کی پوری دیگ ضائع کر دی جائے گی۔ اور بچے ہوئے نمک کی پڑیا بھی سنبھال کر رکھ دی جائے گی جو قیمت میں دیگ سے بہت چھوٹی اور کمتر ہے۔ مگر چوہا گرنے سے وہ دیگ کوڑی کام کی نہ رہی اس کی اتنی قیمت بھی نہیں جتنی تولہ بھر نمک کی۔ اسی طرح انسان اشرف المخلوقات تھا۔ مگر کفر اور وجود کے مقصد کو پورا نہ کرنے کے باعث کوڑی کام نہ رہا۔ اس کو ضائع کرنے کے سوائے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

اُولٰٓئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ۔

اور یہ خیر البریہ ہیں۔ بہترین مخلوق ہیں۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ مومن ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور یہ آیت دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ امام ابن حزم اور امام رازی اور بڑے بڑے جلیل القدر علماء نے اس دلیل پر عمل

کیا ہے کہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ میں ملائکہ شامل ہیں۔ اور یہ دونوں ملکر کافر سے بہتر ہو گئے۔ اگر صرف انسان خیر البریہ ہوتا تو یہ ملائکہ سے افضل ہو جاتا۔ اور ایمان لانے والے اور نیک کام کرنے والے صرف انسان ہی نہیں ہیں۔ بلکہ ملائکہ بھی ہیں۔ اور اس جماعت نے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا تو یہ دلیل ان کی ٹوٹ گئی۔ میں کہتا ہوں کہ غلط ہے بالکل۔ اس لئے کہ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ یہ امر تکلیفی ہے۔ ملائکہ میں امر تکلیفی نہیں ہے۔ ان کا ایمان اور عمل صالح تکوینی ہے۔ اختیاری نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اختیاری ہوتا تو کچھ جماعت اس کے خلاف کرتی۔ تاکہ اختیار کا وہ مظہر ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سب میں ایک ہی شان ہے۔ یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ۔ دن رات بے تکان خدا کی تسبیح کرتے ہیں (انبیاء-۲۰) لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ، اس کے سامنے دم نہیں مارتے۔ (انبیاء-۲۷)

دوسری دلیل یہ ہے کہ :۔

خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ ان کی جزا جنت عدن ہیں۔ یہ مومن کی جزا ہے۔ ملائکہ کی جزا نہیں ہے۔ وہ تو ان کا مسکن ہے۔ وہ ان کا دار العمل ہے عمل کے وقت وہ جہاں رہتے تھے جزا کے بعد بھی وہ وہیں رہیں گے۔ تو وہ ان کی جزا نہیں ہے۔ وہ ان کا مسکن ہے۔ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کی جزا ہے یعنی مومن کی جزا ہے۔ فرشتے اس میں شامل نہیں ہیں۔ فرشتوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ نہ شادی کر سکتے ہیں۔ نہ کھا پی سکتے ہیں۔ صرف مومن یہ کر سکتا ہے یہ اسی کی جزا ہے۔ فرشتوں کی نہیں۔ ہاں اگر فرشتے عمل کے وقت کہیں

اور رہتے اور جزا کے بعد وہ وہاں رہتے تو البتہ وہ شامل ہوتے۔ ہاں جن کو ان کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ اس آیت میں شامل ہیں۔ یہ دلیل میں نے بیان کی ہے۔ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں بیان کی۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے کیونکہ ان کا وجود بقا کے ساتھ متصل ہو گیا۔ جدا نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ کسی شئے کو حاصل کرنے کے لئے اس شئے کی معرفت علم اور شعور چاہئے۔ جب وہ جان لے گا کہ بقا کیا ہے۔ جب وہ اپنے نفس کو پہچان لے گا۔ (یہ سورج ہے یہ ضیاء ہے۔ ضیاء اس سے چھٹی ہوئی ہے) تو جب اس کو پتہ چل جائے گا۔ کہ حقیقی بقا یہ ہے تو فوراً وہ بقا کو حاصل کرے گا۔ اور اس کو پکڑ لے گا۔ اور جب اس کو پکڑ لے گا۔ تو پھر وہ اس سے جدا نہیں ہونے کا۔ اب جو یہ جدا ہو رہی ہے وہ اس لئے جدا ہو رہی ہے کہ وہ اس کو جانتا نہیں ہے اگر جان لے تو اس کو پکڑ نہ لے۔ تو جب ایمان اور عمل صالح ہو گا تو وہ اس کو پہچان لے گا۔ اور اس کو پکڑ لے گا۔ اور اس کا عکس یہاں ہو گا۔ تو جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اپنی بقا کو پہچان لیا اور جب وہ اس کو جان لے گا۔ اس کو پکڑ لے گا اور وہ اس سے جدا نہیں ہونے کی۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جس نے اپنے رب کو پہچان لیا وہ اپنے رب سے ڈرا۔ نفس کے پہچاننے کو خدا کا پہچاننا لازم ہے

اس کی دلیل یہ ہے اور یہ ضابطہ ہے کہ جو بات سچی ہو گی۔ تو اس بات

کے دوسرے جز کی نفی کو اگر پہلا جز بنائیں اور پہلی بات کی نفی کو دوسرا جز بنائیں تو جو بات بنے گی وہ بھی سچی ہوگی۔ مثلاً دودھ سفید ہے۔ یہ ایک سچی بات ہے۔ اب یہ بات کہ جو سفید نہیں ہے وہ دودھ نہیں ہے۔ یہ بھی سچی ہوگی۔ اس منطق کا نام عکس نقیض ہے۔ (لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ) (حشر-۱۹) مت ہو جاؤ ان لوگوں میں سے جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ خود اپنے نفسوں کو بھول گئے۔ تو اللہ کے بھولنے کی سزا کیا ہوئی۔ نفس کا بھولنا۔ تو نفس کی معرفت کیا ہوگی۔ رب کی معرفت (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا) (فاطر-۲۸) اللہ سے اس کے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں یعنی جس کو اللہ کی معرفت ہے وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا اور جس نے اپنے رب کو پہچانا وہ اپنے رب سے ڈرا اور جو اپنے رب سے ڈرا اس سے اس کا رب راضی ہو گیا۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے:۔
(رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ) یعنی یہ رضائے الٰہی ان لوگوں کے نصیب میں ہے۔ جو اللہ سے ڈرتے ہیں، جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس سے اس کا رب راضی ہو گیا۔ رضائے الٰہی کیا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (توبہ-۷۲) رضوانٌ میں تنوین تحقیر کی ہے۔ (رِضْوَانٌ قَلِيْلٌ حَقِيْرٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ) اللہ کا ذرا سا خوش ہو جانا تمام چیزوں سے بہتر ہے اور بہت بڑا ہے۔ یہی فضل عظیم ہے۔ یہ بات ایک حسّی مثال سے سمجھ لیں۔ آپ اپنی ایک بات

کسی طالب علم کو سمجھائیں اور وہ سمجھ جائے۔ اور اس سے اس کو جو خوشی ہوگی اس خوشی کو دیکھکر آپ کو خوشی ہوگی۔ پھر اگر ان کے استادوں کو سمجھائیں اور وہ سمجھ جائیں اور زیادہ خوشی ہوگی۔ پھر اگر ان کے بڑے استادوں پرنسپلوں اور ہیڈ ماسٹروں کو سمجھائیں۔ اور وہ سمجھ جائیں اور خوش ہوں۔ اور زیادہ خوشی ہوگی۔ اسی طرح جوں جوں سمجھنے والوں کا اور خوش ہونے والوں کا مرتبہ بڑھتا جائے گا۔ آپ کی خوشی بھی بڑھتی جائیگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جو سب سے بڑا ہے اس کے خوش ہونے سے جو خوشی ہوگی۔ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

بشارت:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ سورہ پڑھے گا اللہ اس کو "خیر البریۃ" میں شامل کرلے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۙ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۙ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۙ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۚ

لم یکن کی آخری آیتوں سے اس کا تعلق ہے کہ وہ دن جزا کا کب ہوگا جس دن زمین بڑے زور سے کپکپائے گی۔ زلزل اور زلزال دونوں مصدر ہیں معنی بہت تیز حرکت۔ زلزالہا مفعول مطلق ہے یہ یا تو تشبیہ کے لئے آتا ہے یا تاکید کے لئے آتا ہے۔ ثقل کے معنی متاع بیت۔ مردے اہم یا بھاری چیز۔ اثقالت مراد وہ اشیا جو اس کے اندر ہیں۔ یا سونا چاندی وغیرہ مراد ہیں۔ یا دفن کئے ہوئے مردے مراد ہیں۔ یا دلوں [illegible] میں جو جس کے دل میں بات ہوگی وہ بیان کردے گی۔ یا جو اعمال [illegible] ہیں وہ [illegible] دے گی۔ وقال الانسان مالھا۔ انسان کہے گا کہ [illegible] ہے تعجب کریگا۔ سوال نہیں ہے تحقیق بیان کرنا اسی دن زمین اپنی [illegible] کردیگی ہر شخص سے جو جو اس نے کیا ہے بیان کریگی۔ کس طرح بیان کریگی [illegible]

بان ربک اوحی لہا۔ بان کا ب سببیہ ہے اس وجہ سے بیان کریگی کہ اس [illegible] رب نے [illegible] کو وحی کیا ہے۔ یا تو زمین مثل جانور [illegible] ہو [illegible] اور جس طرح جانور بولتا ہے۔ اس طرح یہ بولے گی۔ یا اس میں [illegible] آواز آئے گی یا زمین کی ایسی حالت ہوگی جس سے یہ سمجھا جائے کہ یہ بیان کرتی ہے۔ جیسے مکان کہ وہ ظاہر بتارہا ہے کہ میں رہنے کے لئے ہوں۔ یہ [illegible] سے نہیں بلکہ زبان حال سے کہہ رہا ہے۔ ایسی ہی زمین کی حالت ہوگی [illegible]

يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا۔ اشطاط جمع شطیط کی معنی ٹکڑیاں۔ متفرق۔ ورود معنی آنا۔ صدور معنی آکر واپس جانا۔

وہ لوگ متفرق ٹکڑیوں میں واپس ہوں گے صدور، ورود کی ضد ہے۔ آنے کے بعد لوٹنے کو صدور کہتے ہیں۔ لِيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ۔ وہ اس لئے لوٹیں گے تاکہ وہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں۔ نامۂ اعمال دیئے جائیں گے۔ ان کو پڑھیں گے۔ یا اس کا بدلہ عذاب، جنت، دوزخ کو دیکھیں گے۔ عذاب و ثواب ان کو پہنچیں گے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ جس نے ذرہ برابر نیک عمل کیا ہوگا۔ وہ اس کو دیکھ لے گا۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ جس نے ذرہ برابر بد عمل کیا ہوگا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

وحی کے معنی خطاب الٰہی۔ انسان کو جو وحی ہوگی وہ نبوت ہے۔ غیر انسان کو جو وحی ہوگی اس کے معنی اشارہ کے ہیں۔ اور غیر انبیاء کی وحی انبیاء کے واسطے سے ہے۔ جیسے حواریوں کو وحی ہوئی۔ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ (مائدہ ۱۱۱) جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی۔ یہ وحی عیسیٰ علیہ السّلام کے واسطے سے ہوئی۔

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا۔ (بقرہ۔ ۱۳۶)

ہم ایمان لائے جو ہم پر اترا۔ تو ہم پر براہ راست نازل نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن بذریعہ نبی ہم کو ملا ہے۔ ہمارے نبی پر اترا اور ہماری طرف منسوب ہوا۔ اسی طرح حواریوں کی طرف منسوب ہوا۔ اور جانوروں کو جو وحی ہوتی ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ۔ (نحل۔ ۶۸) تیرے رب نے شہد کی مکھی کو

طرف وحی کی تو یہ فعل طبعی ہے۔ یہ وحی ایسی نہیں ہے جیسی انسان پر ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی جبلّت میں داخل کردی۔ تاکہ وہ ایسا کرے اور اس کے خلاف نہ کرے۔ وہ اس پر مجبور ہے۔ وہ ہندسی شکلیں ایسی بناتی ہے۔ کہ بڑے بڑے حکیم حیران ہیں۔ زمین کو جو وحی ہوئی ہے وہ اسی قسم کی ہے جیسی شہد کی مکھی کو کی۔ غیر انسان کو جو وحی ہوتی ہے اگر وہ ذی شعور ہے۔ تو اشارہ کے معنی میں ہوتی ہے۔ اور غیر ذی شعور ہو تو وہ فطری قویٰ کے معنی میں ہوتی ہے۔ اب یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ زمین کس طرح بول سکتی ہے۔ تو یہاں دیکھئے زمین جمادات میں تبدیل ہوئی پھر نباتات میں پھر حیوانات میں پھر انسان بنی چار بار اس میں انقلاب ہوا۔ اور یہ بولنے لگے۔ اس وقت چار بار انقلاب نہیں ہوگا۔ پہلی ہی بار بولنے لگے گی۔ یہ جو انسان بول رہا ہے۔ مٹی ہی تو ہے۔ تو مٹی کا بولنا محال اور ناممکن نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اللہ قادر ہے۔ اس نے خلاف عادت پیدا کر دیا۔ تو خلاف عادت قوت گویائی بھی دے دیگا۔ یہاں عادت پیدائش یہ ہے کہ ماں باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہاں بغیر ماں باپ کے پیدا ہوں گے۔ جب ابتدا خلاف عادت ہوئی تو بعد کی چیزیں بھی خلاف عادت ہوسکتی ہیں۔ اس میں کوئی دقّت نہیں ہے

حالانکہ صاف حکم یہ ہے کہ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ
جنہوں نے کفر کیا ان کے اعمال سراب جیسے ہیں۔

دوسری دِقّت یہ ہے کہ جو ذرّہ برابر بھلائی کرے گا اس کی جزا پائے گا۔ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ کافر کو نیک عمل کی جزا نہیں

ملے گی۔ اس کے اعمال مثل سراب کے ہیں۔

سُراب:۔ سمندر کے قریب ریگستان میں ایک دھوکا ہوتا ہے۔ پانی کا کہ قریب جا کر دیکھو تو سوائے ریت کے کچھ نہیں ہوتا۔ تو کافر کے نیک اعمال کو سراب سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ان اعمال کی جزا اس کو نہیں ملے گی۔ اگر کوئی اس کا بدلہ ہے تو اسی عالم میں ہے۔ اُس عالم میں اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس پر سب مسلمان متفق ہیں۔ گو مومن کے بارہ میں اختلاف ہے۔ کہ اس کے گناہوں کا بدلہ اس کو ملے گا یا نہیں۔ ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ جس طرح کافر کے نیک اعمال اسکو فائدہ نہیں دیتے۔ اسی طرح مومن کے گناہ اس کو نقصان نہیں دیتے۔ اور کافر کی نیک اعمالیاں اس کے کفر کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہیں۔ مومن کی بداعمالیاں اس کے ایمان کی وجہ سے ختم ہوجاتی ہیں۔ یہ عقیدہ مرجیعہ کا ہے۔ کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آیا وہ چاہے جتنے گناہ صغیرہ و کبیرہ کرے اور بغیر توبہ کے مرجائے۔ تو اس کو سزا نہیں ملے گی۔ ان کے دلائل قرآنی آیات ہیں۔ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ۔ دوڑو اللہ کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف جس کا عرض زمین آسمان جتنا ہے (حدید-۲۱)۔ طول کا اندازہ نہیں۔ اور تشبیہ ناقص ہے کامل کو ناقص سے تشبیہ دی ہے کیونکہ انسان کے خیال میں اس فاصلہ سے بڑا اور کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ ورنہ حقیقت میں آسمان و زمین اس کے ایک کونے میں آجائیں گے۔ شیر ہے اس کو بلی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جب کامل

کے مقابلے میں کوئی اکمل چیز موجود نہ ہو تو ناقص سے تشبیہ دے دی جاتی ہے
دراصل جنت بہت بڑی جگہ ہے۔ وقت کو بھی تشبیہ دی ہے۔ مَادَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جب تک زمین و آسمان رہیں گے۔ جنت میں رہیں گے حالانکہ
یہ واقعہ نہیں ہے۔ زمین و آسمان تو منقطع ہو جائیں گے۔ مگر عذاب و ثواب
منقطع نہیں ہوگا۔ شبلی نے یہ لکھدیا کہ یہ ختم ہو جائیں گی۔ بعض نے کہا دونوں
ختم ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا نہیں جنت باقی رہے گی۔ دوزخ ختم ہو جائیگی
اور بعض متقدمین نے کہا نہیں یہ جام ہو کر رہ جائیں گے۔ حرکت کی صلاحیت
نہیں رہے گی۔ یہ روایات پرانے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ اور آج کل کے
لوگوں نے اس کو اپنا لیا ہے۔ سب امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ
جنت اور دوزخ میں رہیں گے۔ ابن حزم ۵ویں صدی کا اسپین کا عالم ہے
امام غزالی اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اجتہاد کے پورے آلات اور سامان
اس کے پاس ہیں۔ اتنا بڑا عالم ہے۔ فلسفے میں ارسطو اور افلاطون کے درجے
کا یا ان سے بھی فائق اور بلند۔ حدیث میں ائمہ ستہ حدیث۔ فقہ میں ائمہ اربعہ کی
کی سی حیثیت ہے۔ چاروں اماموں کے رد میں ایک ایک کتاب لکھی اور ایک
چاروں اماموں کے رد میں لکھی اور ایک خاص کمال ان میں یہ ہے کہ کوئی عالم
ایسا نہیں گذرا کہ جو اطلاعات ان کے بارے میں ملی ہے کہ عالم باعمل اتنے زبردست
ہیں کہ ایک حدیث ان کو پہنچی اس کے مطابق عمل کیا۔ ایک گھنٹہ بعد اس کے
خلاف حدیث پہنچی تو اس پر عمل کرتے تھے۔ اتنے بڑے عالم باعمل تھے۔
مثلاً تحیۃ المسجد ۲ رکعت کی انہیں اطلاع ملی۔ فوراً پڑھیں گے۔ اور ذرا

دیر بعد اس کے متعلق کوئی دوسری خبر ملی اس پر فوراً عمل کریں گے یعنی عمل علم کے مطابق رہا ہے۔ اور انھوں نے ۔۔۔۴۸ صفحات اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ ۲۷ سال کی عمر میں وزارت عظمیٰ ترک کر کے علم کی طرف متوجہ ہوئے اور ۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ تو ان سے ایک ملحد نے سوال کیا کہ تم یہ کہتے ہو کہ جنت اور دوزخ دونوں میں دوام ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ(۱) نا لموفو ھم نصیبھم غیر منقوص۔ ہم ان کا نصیب اور ان کا اجر و ثواب پورا پورا دیں گے اس میں سے کچھ نہیں گھٹائیں گے غیر منقوص(۱۰۹) ہوگا۔ اللہ کا کلام سچا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ ثواب پورا ہو گیا تو منقطع ہو گیا اور لامحدود نہیں رہا۔ اور تم دائمی کہتے ہو۔ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو یہ اللہ کا قول جھوٹا ہو جاتا ہے۔ تو انھوں نے اس کا معمولی سا جواب دیا جو مناسب نہیں ہے۔ مسئلہ حل نہیں ہوا۔ تو میں نے جب مجھے معلوم ہوا تو غور کیا کہ اس میں خرابی کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس میں مغالطہ ہے۔ لموفوھم کے معنی ہیں ہم ان کو پورا پورا دیں گے۔ جیسے کسی کو ۱۰۰ روپیہ دینے ہیں وہ پورے دیدیئے تو لامحدود نہ رہا منقطع ہو گیا۔ مغالطہ پورا کرنے کے معنوں میں دھوکا لگا ہے جسم اور مقداریات میں پورا ہونے کے معنی منقطع ہونے کے ہیں۔ مثلاً ۳ ، ۳ فٹ ایک خاص لمبائی پر جاکر منقطع ہو جائینگے مگر وعدہ پورا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو وعدہ کیا ہے اس کے مطابق ہو۔ لامحدود کا وعدہ کیا ہے۔ تو لامحدود اجر ہوگا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق ہوگا اور وعدہ کیا ہے۔ کہ ہم برابر دیتے رہیں گے کسی جگہ نہیں ٹھہریں گے تو اس کے مطابق ہوگا۔ اور یہی نہیں بلکہ بڑھاتے بھی رہیں گے۔ اور بہتر سے بہتر ہوتا

رہے گا اور انسان اس کو محسوس کرے گا۔ یہاں کم کرتا ہے وہاں زیادہ کرے گا۔ وہاں شعور بہت تیز ہو جائے گا۔ کیونکہ جو یہاں موانع ہیں۔ وہاں نہیں ہوں گے۔ نعمت اور مدت کے دونوں کے لحاظ سے بڑھتا چلا جائیگا فبصرک الیوم حدید آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔ (ق-۲۲) یہاں وہ جنت کو دوزخ کو پل صراط کو نہیں دیکھ سکتا۔ وہاں دیکھے گا۔ پل صراط پر سے گذرنا عقل کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ باریک سے باریک شئے تلوار کی دھار ہے۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ چوڑان خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو ہے۔ مگر ہوا میں تو بالکل امتداد نہیں ہے۔ لیکن پرندے برابر اڑ رہے ہیں یا نہیں۔ تو جب بغیر امتداد اڑان موجود ہے۔ تو پل صراط کا کچھ نہ کچھ تو امتداد ہے۔ اس پر سے بھی گذر جائیں گے۔ بے مسافت کی شئے جب مشاہدہ میں موجود ہو۔ تو جہاں کچھ نہ کچھ مسافت ہو گی۔ اس کے عقل میں آنے میں کیا مشکل ہے۔ اگر غور کریں گے۔ تو اسی طرح تمام چیزیں عقل میں آتی چلی جائیں گی۔ صحیح تخیل کی ضرورت ہے۔ اب ایک اور دقت ہے۔ وہ بیان کرتا ہوں۔ اگر اللہ کی توفیق ہو لی تو میرا سرمایہ علم آپ کو معلوم ہے۔ ترتیب دماغ میں ہو لی چاہئے رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ (آل عمران-۱۹۲) اے رب ہمارے تو نے جس کو جہنم میں ڈال دیا اس کو تو نے رسوا کر دیا یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ (تحریم-۸) وہ دن ایسا ہوگا کہ اللہ نبی اور مومن کو رسوا نہیں کریگا۔ ایک آیت سے معلوم ہوا کہ داخل نار رسوا ہے۔ دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ مومن رسوا نہیں ہے نتیجہ نکلا کہ مومن داخل نار نہیں ہے۔ ایک شئے ایک شئے کے لئے ثابت ہو۔ اور وہی شئے دوسری شئے

سے منفی ہو تو وہ دونوں چیزیں آپس میں ایک دوسرے سے منفی ہو جائیں گی۔ چنانچہ یہاں رسوا داخل نار کے ساتھ ثابت ہے۔

اور مومن کے ساتھ منفی ہے۔ لہذا مومن اور داخل نار آپس میں منفی ہو گئے۔ یعنی مومن مرتکب گناہ کبیرہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ یہ استدلال ہے۔ اور اس میں لغزش ہوئی ہے یہ منطق ہے۔ ہمارا اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر مومن توبہ کئے بغیر مر جائے گا۔ تو کئی درجے ہیں۔ پہلے تو یہ ہے کہ وزن اعمال ہوگا۔ اور اگر ذرہ برابر بھی نیکی زیادہ ہوگی تو پلڑا فوراً جھک جائے گا۔ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اعراف ۸) کیونکہ آٹے کی ذرا سی چٹکی میں ترازو کا پلڑا ایک دم جھک جاتا ہے۔ تو ذرہ برابر نیکی سے بھی پلڑا جھک سکتا ہے مثلاً سو میں اکیاون نیکیاں ہوئیں یا پچاس پچاس برابر ہو کر ایک کا بہت ننھا سا حصہ ہزارواں یا لاکھواں حصہ بھی بڑھ گیا تو پلڑا فوراً جھک جائے گا تو اللہ کی رحمت یہ ہے۔ وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اگر پلڑا نہیں جھکا تو پھر شفاعتیں ہوں گی۔ پہلے نبی کی شفاعت کبرا ہوگی۔ پھر اور انبیاء علیہ کی پھر بزرگوں کی شفاعت ہوگی۔ جب یہ سب ہونے کے بعد بھی رہ جائیں تو اللہ پاک کی رحمت سے نکلیں گے۔ پھر بھی جو بچ جائیں گے۔ تو وہ جہنم میں جائیں گے۔ یہ ہے ہمارا عقیدہ کہ جو مومن توبہ کئے بغیر مر جائے گا تو اس کے جہنم میں جانے کا امکان ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور مرجیہ کے نزدیک وہ سیدھا جنت میں جائے گا اور جب ان کے سامنے وہ آیات

پڑھی جاتی ہیں۔ جن سے جہنم میں جانا ظاہر ہوتا ہے: وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا۔ تو وہ کہتے ہیں کہ دھمکی وعید کی آیات ہیں اور اللہ بڑا کریم اور جواد ہے۔ (نساء ۹۳) اگر وہ وعید دے کر معاف کر دے تو یہ اس کا جود ہے۔ اس کی شان کے مطابق ہے۔ خلاف شان نہیں ہے مثلاً کوئی کسی سے کہے کہ میں تیرے پچاس کوڑے ماروں گا اور پھر وہ معاف کر دے اور نہ مارے تو اس سے اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ظاہر میں تو بڑی اچھی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کہ سب کو اگر معاف کر دے اور جنت میں ڈال دے اور اس کے لئے یہ کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے اس کی ذرا سی رحمت سب کی بخشش کے لئے کافی ہے۔ اور اس کی رحمت اتنی بڑی ہے کہ اگر اس کی رحمت کی ہوا چل گئی تو پھر شیطان بھی کہیگا کہ میں بھی حقدار ہوں گا۔ اور وہ یہ نہیں کہے گا کہ نکل جا تو حقدار نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی رحمت اتنی وسیع ہے كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ (اسراء ۲۰) یہ ہوں یا وہ ہوں۔ نیک و بد کی قید نہیں ہے۔ وہ بھی بخشا جا سکتا ہے۔ اس کی رحمت بہت بڑی ہے۔ وہ نیکوں کی بھی مدد کرتا ہے اور بدوں کی بھی مدد کرتا ہے: وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ تیرے رب کی مہربانی محدود نہیں ہے اس کے سب ہی حقدار ہیں۔ اس کی ننھی سی رحمت اتنی بڑی ہو گی کہ سب کو بخشدے۔ مگر چونکہ یہ بات قانون میں نہیں آتی اس لئے ہم ایسی بات نہیں کہتے۔ ایک مفسر معاذ ابن سلیمان ان کے ساتھ ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ مومن رسوا نہیں ہو گا۔ اس لئے جہنم میں نہ

جائے گا۔ اب اس میں غلطی یہ ہوئی ہے کہ آیت میں معہ کے لفظ کو چھوڑ دیا ہے۔ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ یعنی جو لوگ نبی کے ساتھ ہیں۔ یہ معیت مکانی نہیں ہے۔ بلکہ عملی ہے۔ (تحریم۔۸) جو نبی کے پیچھے عملاً چلا جا رہا ہے۔ وہ وہیں پہنچے گا۔ جہاں نبی پہنچے گا۔ یہاں بھی آپ دیکھ لیں کہ کیا ہوتا ہے آپ کسی کے پیچھے ہو جائیں وہ جہاں جائے گا آپ بھی وہیں پہنچیں گے۔ تو مومن تو اسی لائن پر جاتا ہے۔ اور فاسق لائن سے باہر اِدھر اُدھر نکل جاتا ہے تو اس کا امکان ہے کہ وہ وہاں نہ پہنچے۔ رہا قیاس وہ مع الفارق ہے اس کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ ایسی چیز پر قیاس ہوتا ہے۔ جو مشترک ہو۔ اور یہ غیر مشترک ہے۔ اس کے متعلق میں نے ابھی ایک تحقیق کر لی ہے۔ یہ جو کفر و ایمان کی تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کفر نیکیوں کو حبط کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایمان بدیوں کو حبط کر دیتا ہے۔ ایمان اور کفر ایک دوسرے کی نقیض اور ضد ہیں۔ اور ان دونوں کی تشبیہ حیات اور موت ہے اور قرآن نے بھی حیات و موت سے تشبیہ دی ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا۔ یہ مردے ہیں۔ (انعام۔۱۲۲) شرع کی اصطلاح میں بھی مومن حی ہے۔ اور کافر مردہ ہے۔ تو کفر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو موت کو حیات سے ہے۔ جو حیات ہے اگر اس کو دکھ دینے والی چیزیں ملیں تو ضرور دکھ پائے گا۔ کانٹا لگے گا تو دکھ ہو گا ہاتھ جلے گا تو دکھ ہو گا۔ تو مومن اگر برے کام کرے گا تو ضرور دکھ پائے گا۔ کہ وہ بمنزلہ حی کے ہے۔ اور کافر بمنزلہ میت کے ہے تو اگر میت کو شربت کا گلاس۔ میوہ جات وغیرہ

پیش کئے جائیں تو ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ کافر کو اگر میوہ جات غذائیں یعنی ثواب وجزا اگر دی جائے تو وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ تو اس کی نیکیوں سے اس کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر مومن چونکہ بمنزلہ حی کے ہے۔ اس لئے اگر وہ گناہ کرے گا۔ تو اس کو دکھ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے مومن گنہگار کو سزا ہو سکتی ہے۔ اور کافر نیکوکار کو جزا نہیں مل سکتی۔ تو مرجیعہ کا عقیدہ غلط ہے۔ سنت جماعت کا صحیح ہے۔ اور معتزلہ کا بھی عقیدہ غلط ہے کہ گنہگار ہمیشہ دوزخ میں رہے گا بلکہ وہ سزا پا کر نکل آئیگا مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ یہاں ذرہ سے مراد ہر ہر ذرہ نہیں ہے بہر عمل نہیں ہے۔ بلکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کاربن لگا کر لکھیں تو بظاہر آپ اوپر لکھ رہے ہیں۔ مگر دیکھئے خود بخود لکھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن نظر نہیں آتا۔ جو اعمال آپ کر رہے ہیں ان سب کا مبدا ارادہ ہے پہلے حسن کا تصور ہوتا ہے وہ ارادہ کو حرکت دیتا ہے۔ اور ارادہ حرکت دیتا ہے۔ قدرت کو قدرت حرکت دیتی ہے۔ عضلات کو اور آلات کو اور عضلات سے حرکت صادر ہوتی ہے۔ جو ہوئی ہوتی ہے تو جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس سب کا مبدا حسن کا تصور ہے۔ جو پہلے سے دل کے اندر موجود ہے۔ تو ادھر ارادہ نے حرکت دی ادھر کام آگے کو بڑھا یا اور پیچھے ایک نقطہ لگ جاتا ہے۔ تو جتنے اعمال یہاں ہو رہے ہیں۔ دل پر لکھے جا رہے ہیں۔ اور نقش ہو رہے ہیں۔ اور جیسے کاربن کا پی نظر نہیں آتی۔ اسی طرح یہ نقش نظر نہیں آتے۔ اب دیکھئے کی تحریر تب ہی نظر آئے گی۔ جب اوپر کا

کاغذ پھاڑ دیا جائے۔ اسی طرح جسم مانند اوپر کے کاغذ کے ہے۔ جب یہ الگ ہو جائے اور روح باہر نکل آئے گی۔ تو اعمال کو اپنے میں منقش پائے گی۔ اب یہاں کیا صورت ہوتی ہے کہ لکھا گیا۔ ۵ من ۴ سیر اس نے کہا نہیں صاحب ۴ من ۵ سیر ہے۔ تو اب اس نے اس کو کاٹ کر ۴ من ۵ سیر کر دیا۔ یا دونوں طرف کی رقمیں جمع خرچ ہوئیں اور ایک دوسرے سے منہا ہوئی، اب جو باقی نکلا۔ اگر وہ ذرہ برابر بھی ہے تو بدلہ ضرور ملے گا۔ نیکی ہوگی۔ تو بدلہ اچھا ملے گا۔ اور بدی ہوگی تو برا بدلہ ملیگا۔ اب اس بات کو عقلی طریقہ پر سمجھیں کہ کافر کو نیکی کا بدلہ کیوں نہیں ملے گا۔ ذرات کو آپ سمجھ گئے کہ الگ الگ نہیں ہوں گے۔ بلکہ باقی نکلی ہوئی ہوگی۔ اگر کاٹ چھانس ہوگی تو کاٹ چھانس ہوئی ہوئی ہوگی۔ مثلاً ایک گناہ کیا۔ اس پر ۵۰۰ جرمانہ ہوا۔ اور نماز پڑھی اس پر ۱۰۰۰ انعام ملا تو ہزار میں سے ۵۰۰ کاٹ کر ۵۰۰ نیکی لکھی ملیں گی۔ ہزار اور ۵۰۰ کا ذکر نہیں ہوگا۔ اب ایک ادق بات ہے اس کو بھی سمجھ لیں کہ یہ نیکی چیز کیا ہے۔

کافر جو نیکی کرتا ہے۔ یہ وہ نیکی ہے۔ جس کا نظام عالم میں دخل ہے۔ سچ بولا۔ مزدوری زیادہ دی۔ اس سے نظام عالم باقی رہتا ہے جس نیکی کا دخل نظام عالم سے ہے۔ اس کا بدل نظام عالم کی درستی اس کو مل گئی، مومن ہو یا کافر ہو جو سچ بولے گا۔ اس کی ساکھ ہوگی۔ مسلمان اگر کم تولتا ہے۔ تو اس سے سودا نہیں لے گا۔ اگر ہندو پورا تولتا ہے تو مسلمان بھی سودا اسی سے لے گا۔ جن نیکیوں کا تعلق نظام عالم کی درستی سے ہے۔

تو نظام عالم کا برقرار رہنا ہی اس کی جزا ہے۔ وہ اسی عالم میں حاصل ہوگئی
ایک شے کی ایسی ہے۔ جس پر نظام عقبیٰ موقوف ہے۔ اس سے وہ بے خبر
ہے۔ اس کو وہ لینا ہی نہیں چاہتا تو اس کو وہ پائے گا بھی نہیں۔ یہ جاننا
کہ نظام عقبیٰ میں بھی اس کا بدلہ ہے یہی چیز ایمان ہے۔ تو وہ نیک
اعمال کی جزا مرنے کے بعد ملے گی۔ وہ فرع ہے۔ ایمان کی۔ ایمان
وہ لایا نہیں تو اس کو نہیں ملے گی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ الْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ۙ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۙ فَالْمُغِیْرٰتِ
صُبْحًا ۙ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ
لَشَهِیْدٌ ۚ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ؕ اَفَلَا یَعْلَمُ
اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ۙ وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ
اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِیْرٌ ۠ (والعٰدیٰت)
(سورہ ۱۰۵)

وَالْعَادِیَاتِ ضَبْحًا۔ قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو دوڑتے ہیں۔ اور دوڑنے میں اُن کی آواز نکلتی ہے۔ حضرت ابن عباس سے گھوڑے مروی ہیں اور حضرت علی نے فرمایا کہ یہ گھوڑے نہیں اُونٹ ہیں۔ مگر تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ گھوڑے ہیں اور اگلی آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں گھوڑے ہی مُراد ہیں۔ والموریات قدحًا۔ موریات ایرٌ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں آگ نکالنا۔ قدح کے معنی زور سے مارنا گھوڑا جب بھاگتا ہے اور زور سے پیر مارتا ہے تو آگ نکلتی ہے۔ اونٹ کے پیر سے آگ نہیں نکلتی تو اللہ تعالیٰ قسم کھاتا ہے۔ اُن گھوڑوں کی جو اپنی ٹاپ سے آگ نکالتے ہیں۔ وَالْمُغِیرَاتِ صبحًا قسم ہے اُن گھوڑوں کی جو غارت گری کرتے ہیں۔ صبح کے وقت یعنی دھاوا بولتے ہیں۔ رات کو اندھیرے کی وجہ سے اور دن کو چونکہ دشمن مطلع ہوتا ہے دھاوا نہیں بولتے۔ صبح کے وقت دھاوا بولتے ہیں۔ فاثرن بہ نقعًا نقع معنی غبار۔ غبار اُڑاتے ہیں۔ غبار کی وجہ سے اندھیرا سا ہو جاتا ہے۔ تو دشمن کو نظر نہیں آتا اور حملہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ فوسطن بہ جمعًا۔ جمع معنی اجتماع بھیڑ لشکر۔ لشکر کے بیچوں بیچ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ان کی بہادری ہے، تو ان کی بہادری اور دوڑ دھوپ کی قسم کھائی۔ قسم کس موقع پر کھائی جاتی ہے۔ اسے آپ سمجھ لیں۔ قسم کے معنی اور اس کا موقع سمجھ لیں۔ اللہ پاک نے تین طریقے بتائے ہیں۔ فرمایا اُدْعُ الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو بلا" بالحکمۃ حکمت
(نحل-۱۲۵)

سے۔ حکمت کہتے ہیں ایسے دلائل کو جن سے یقین ہو جائے۔ یقینی دلائل وہ کہلاتے ہیں، جن کا تصوّر کرتے ہی مدلول کا تصوّر ہو جائے، جیسے دھوپ سورج کے وجود پر دلیل ہے۔ دھوپ کو دیکھتے ہی سورج کا تصور ہو جاتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ غیر یقینی دلائل وہ ہوتے ہیں جن میں دلیل اور مدلول میں فاصلہ ہو۔ اور جب تک یہ فاصلہ نہ مٹے یقین نہیں ہوتا۔ یہ شبہ کہلاتا ہے۔ شک کہلاتا ہے۔ قرآن میں جو علوم ہیں، وہ بیشتر اول قسم کے ہیں، یقینی دلائل ہیں اس میں عقل کو زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اول ہی دہلہ میں سمجھ میں آجاتے ہیں۔ یہ حکمت ہے تو علماء و عقلاء کو بتایا کہ دلیل کے ذریعہ سمجھاؤ۔ اس سے نیچے درجہ کے لوگوں کو موعظۃ حسنہ۔ وعظ حسن۔ اچھے وعظ کے ذریعہ اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ یہ موعظۃ حسنہ کیا چیز ہے۔ یہ مسلمات عامہ ہیں۔ مسلمات عامّہ ان مقدمات اور ان باتوں کو کہتے ہیں جن کو تمام انسانوں نے مل کر نوع انسان نے نظام عالم میں مفید سمجھ کر ان کو تسلیم کر لیا ہے۔ بغیر دلیل کے۔ باپ کو ستانا بُرا ہے۔ یہ بات دہریہ یا کسی مذہب کا آدمی بھی نہیں کہے گا کہ اچھی بات ہے۔ اس کو سب ہی بُرا کہیں گے۔ یہ مسلمات کہلاتے ہیں۔ دلیل سے تسلیم کئے جائیں گے، تو وہ علوم یقینیہ، یا حکمت کہلائیں گے اور جو بغیر دلیل کے تمام انسانوں نے مل کر تسلیم کر لیا ہے: وہ وعظمت حسنہ کہلائیں گے اور ان کو مسلمات عامہ کہتے ہیں، یا مشہورات عامّہ مثلاً صدق ہے۔ سب لوگوں نے مل کر اس کو تسلیم کر لیا ہے کہ ان کی

خلقت، معاشرت، اور زندگی صدق کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اگر صدق کا رواج جاتا رہے تو نظام عالم میں خلل پڑ جائے گا اور کذب ہی کذب رہ جائے تو انسان کی زندگی دشوار ہوجائے گی۔ یہ سمجھ کر سب لوگوں نے اس کو تسلیم کرلیا ہے کہ یہ اچھی چیز ہے۔ اس کی اچھائی بدیہی اور ظاہر نہیں ہے۔ یعنی ظاہر اور بدیہی اس کو کہتے ہیں جس کو دیکھتے ہی یقین کامل ہوجائے۔ جیسے آگ کو دیکھتے ہی فوراً یقین ہوجاتا ہے کہ یہ جلائے گی اور نہ یہ نظری شئے ہے کہ غور اور دلیل سے ثابت ہوجائے۔ اگر یہ بدیہی ہوتی تو ہرگز کوئی جھوٹ نہ بولتا۔ جس طرح آگ سے بچتا ہے جھوٹ سے بھی احتراز کرتا۔ کیونکہ جھوٹ آگ سے بھی زیادہ بُرا ہے اور نظری دلیل یوں نہیں ہے کہ صدق و کذب قول کی صفت ہے اور قول فرع ہے قائل کی۔ قائل پہلے ہوا قول سے اور قائل یعنی انسان کے لئے ابتدا ہے۔ کیونکہ یہ سورج سے پیچھے ہے۔ چنانچہ قول کے لئے بھی اوّل ہوا۔ صدق قول کی صفت ہے۔ اور قول کا نتیجہ قول کے بعد ہے۔ تو پہلا قول صدق جو بولا گیا، اس کا نتیجہ اس کے بعد ہوا۔ تو پہلا صدق بغیر نتیجہ معلوم ہوئے بولا گیا، کسی تجربہ کی بنیاد پر نہیں بولا گیا۔ یعنی صدق کو بغیر دلیل اختیار کیا گیا۔ خوشخبریاں تو انسان سننے کو تیار ہے۔ مگر بدخبریاں سننے کو تیار نہیں، خواہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہوں۔ یعنی کسی عزیز کے مرنے کی خبر اگر ملے تو طبیعت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خدا کرے یہ خبر جھوٹی ہو۔ [illegible]

یہ پتہ چلا کہ طبیعت سچ کی متقاضی نہیں ہے۔ اگر سچ کی اچھائی بدیہی ہوتی، تو طبیعت اس کی متقاضی ہوتی۔ اوّل دہلہ میں فائدہ منصور ہو، خواہ انجام کچھ ہو۔ ایسی شئے کی طبیعت متقاضی ہوتی ہے صدق میں یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف اگر سچی بدخبری اس کو دی جاتی ہے تو سُننا پسند نہیں کرتی۔ ایسی صورت میں دلائل لانے پڑتے ہیں کہ تو اس فعل کو کر اس فعل کو نہ کر۔

وجادلھم بالتی ھی احسن (نحل-۱۲۵)۔ بہترین طریقے سے ان سے مجادلہ کر۔ مجادلہ کیا ہے۔ ان کے مشہورات خاصہ سے ان کی بات کا رد کرنا۔ مشہورات خاصہ وہ طریقے ہیں جو ایک خاص گروہ میں رائج ہوں، مثلاً یہودیوں میں تورات، عیسائیوں میں انجیل۔ عیسائیوں نے جب ہٹ دھرمی کی تو حضورؐ نے فرمایا، اگر تم سچے ہو تو لاؤ تورات اور اس کو پڑھو۔ قل فاتوا بالتورٰۃ فاتلوھا ان کنتم صدقین (عمران-۹۳)۔ یہ لوگ جو وعظ کہتے ہیں۔ لیکچر دیتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں۔ مسائل کی کتابیں لکھ دیتے ہیں، لوگ ان کو عالم سمجھتے ہیں۔ ان کا تعلق علم سے بالکل نہیں ہوتا۔ یہ خطابت کہلاتی ہے۔ اس کا تعلق دلیل سے نہیں ہوتا۔ یہ تین طریقے تعلیم کے بتائے۔ بعض ایسے کیڈ اور جاہل ہوتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو ان سے قسم کا طریقہ برتا جائے گا۔ پیار اور محبت اور شفقت کے طریقہ سے ان کو سمجھایا جاتا ہے۔ تم یہ جانتے ہو کہ میں تمہارا بڑا خیر خواہ ہوں۔ میں تمہاری

بھلائی چاہتا ہوں، تم مجھ پر اعتبار کرو اور جو میں کہتا ہوں اس کو مان لو۔ یہ طریقہ قسم کا کہلاتا ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے بنایا جو کچھ نہیں سمجھتے۔ متاثر اس سے درمیانی اور عقلاء بھی ہوتے ہیں۔ مگر کم فہموں کے لئے ہی یہ طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً عورت کسی دلیل سے نہیں مانتی تو اگر آپ قسم کھا کر کہہ دیں تو مان جاتی ہے۔ یہ چار طریقے قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ قسم کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہارے خیال میں یہ بات یقینی ہے اسی طرح جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ بھی حق ہے۔ اس لئے اللہ پاک نے موٹی موٹی چیزوں کی جگہ جگہ قسم کھائی ہے۔ قسم اس بات پر کھائی ہے کہ ان الانسان لربہ لکنود ۔ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ کنود کے معنی کفور۔ ناشکرا۔ ناسپاس۔ ناشکرگذار۔ آپ کسی کے ساتھ بھلائی کریں اور وہ آپ کی بات نہ مانیں تو آپ کو اس پر غصہ آئے گا۔ جلن ہوگی اب جو لاانتہا بھلائیاں کرے اور پھر اس کا کہنا نہ مانیں تو کتنا ناراض ہو۔ لمقت اللہ اکبر من مقتکم انفسکم ۔ آج جو تم جل رہے ہو، تمہیں (مومن۔۱۰) معلوم نہیں کہ یہ جلن کچھ بھی نہیں ہے۔ جب تم نافرمانی کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو کتنی جان اور ناگواری ہوتی تھی اذ تدعون الی الایمان فتکفرون ۔ جب تم کو ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم نافرمانی کرتے (مومن۔۱۰) تھے۔ اس وقت اس سے بہت زیادہ اللہ پاک کو ناگواری ہوتی تھی۔ جتنی ناگواری اس وقت تم کو ہو رہی تھی۔ اب اس پر غور کریں کہ انسان اپنے رب کا ناشکرا کیوں ہے۔ پہلے شکر کے معنی سمجھیں۔ ناشکری اسکی

ضد ہے۔ کنود شکور کی ضد ہے۔ شکر کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شخص پر احسان کرے اور وہ شخص احسان کرنے والے کی تعریف کرے تو یہ تعریف شکر کہلائے گی۔ مگر یہ غلط ہے۔ یہ جزوی چیز ہے۔ شکر کے صحیح معنی یہ ہیں، جو نعمت جس کام کے لئے دی گئی ہے وہ نعمت اس کام میں صرف کی جائے۔ آنکھ دیکھنے کے لئے دی گئی ہے کیا دیکھے۔ کس طرح دیکھے، کس وقت دیکھے، کس جگہ دیکھے۔ یہ طریقہ بتایا تو اس طریقے سے دیکھنا بس یہی شکر ہے۔ اور وہ تعریف کرنا بجائے خود ایک نعمت ہے۔ پھر اس کے لئے شکر لازم آئے گا تو یہ تسلسل قائم ہو جائے گا۔ اس دقت سے بچنے کے لئے صحیح معنی سمجھنے چاہئیں تو دیکھنے کے لئے دو چیزیں بتائیں۔ ایک وہ چیز دیکھو جو اس جسم میں فائدہ دے۔ اور ایک چیز وہ دیکھو جو اس روح میں نفع دے۔ تیسری چیز نہیں دیکھ سکتے۔ روح کے فوائد دیکھنا یہ عقبیٰ یا دین ہے۔ اور جسم کے فوائد دیکھنا یہ دنیا ہے۔ شاید کہ تم فکر کرو دنیا کے معاملات میں اور عقبیٰ کے معاملات میں۔ پہلے دنیا کے معاملات دیکھو پھر دین کے معاملات کو دیکھو۔ دنیا مقدم ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دین مقدم ہے۔

اور فعل کے اعتبار سے دنیا مقدم ہے۔ کان سننے کے لئے بنایا ہے تو وہ چیز سنو جو اس جسم میں نافع ہے۔ جو نافع نہ ہو اس جسم میں وہ نہ سنو۔ یہ جامع بات ہے۔ جتنے اقوال ہیں بزرگان دین کے اور صوفیائے کرام کے، وہ سب اس کے اندر ہیں۔ اس کے [illegible]

جائے گی۔ اس کے درجے ہیں۔ وہ مقامات کہلاتے ہیں۔ وہ لا انتہا ہیں۔
وہ کسی جگہ نہیں ٹھہرتے۔ ان کی کوئی حد نہیں ہے۔ اولیاء اللہ کا حال
اس کے مطابق ہوتا ہے۔ نہ قول نہ عمل۔ اور جو علماء ظاہریں ان کا یہ
قول ہوتا ہے۔ اور جو متوسط درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کا عموماً عمل
ہوتا ہے۔ علماء بیان کرتے ہیں، سامعین سُن کر عمل کرتے ہیں اور اہلِ دل
کا یہ حال ہوتا ہے۔ زبان چکھنے کے لئے بنائی ہے۔ اب اس سے کوئی
اور فعل کیا جائے گا تو یہ غلط ہوگا۔ وہ چاہے مضرت اس کی دنیا میں ہو
یا دین میں۔ اگر دنیا میں مضرت ہے تو ناجائز اور عقبیٰ میں اس کی مضرت
ہو تو بدرجہ اولیٰ ناجائز۔ اب دیکھئے اعضاء کی قسمیں ہیں۔ بعض اعضاء
دو دو ہیں۔ بعض اعضا اس قسم کے ہیں کہ وہ ایک ہیں۔ ہاتھ۔ پاؤں۔
آنکھ۔ کان۔ دو دو ہیں۔ منہ زبان۔ سر گردن یہ ایک ایک ہیں۔ پھر
بعض عضو ایسے ہیں کہ ہیں دو اور کام ان کا ایک۔ بعض ایسے ہیں کہ
ہیں ایک اور کام ان کے دو ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ایک ہیں اور کام
بھی ان کا ایک ہے۔ جیسے دل اور دماغ دونوں کا ایک ایک کام ہے
کان آنکھ دو دو ہیں کام ایک ہے۔ کام زیادہ تھا۔ دو دو کلرک لگا دئے
کام کی کمی بیشی سے اعضاء رکھے ہیں۔ کام زیادہ ہے۔ دو رکھے۔ کام کم
ایک رکھا۔ بعض عضو ایسا ہے کہ عضو ایک اور کام دو جیسے زبان۔ دو
محکموں کا ایک وزیر مقرر کیا۔ ایک کام اس کا کلام کرنا ہے اور ایک کام
چکھنا ہے۔ جن کو دو کام دیئے ان کی بہت احتیاط کی اور کمرے دیئے۔

زبان کے لئے ۳۲ برچھے نیزے والے کھڑے کر دیئے کہ وہ احتیاط رکھیں۔ اور پھر دو پھاٹک لگا دیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے بہت کم کام لینا ہے، لیکن بہت اہم کام لینا ہے۔ جتنے اہم آدمی ہوتے ہیں کام کم کرتے ہیں۔ تنخواہ زیادہ پاتے ہیں۔ گھٹیا آدمی انعام کم پاتے ہیں محنت زیادہ کرتے ہیں۔ اس لئے زبان کو اندر رکھا کہ باہر نہ نکلنے پائے غلط کام نہ کرنے پائے۔ اب آپ غور کریں کہ جتنے اعضاء سر سے لے کر پاؤں تک ہیں۔ سب کے اندر جبر ہے۔ آنکھ کے سامنے جو شئے آئے گی اس کے دیکھنے پر مجبور ہے۔ کان میں جو آواز آئیگی اسے سننے پر مجبور ہے۔ یعنی مجرد ارادے سے آنکھ یا کان دیکھنے یا سننے سے باز نہیں رہ سکتے۔ جب تک کوئی شئے درمیان حائل نہ کر دی جائے۔ مگر زبان مجرد ارادہ سے کلام سے باز رہ سکتی ہے۔ چاہے بولے چاہے نہ بولے اور اصل اختیار انسان ہے۔ اور اختیار کا صحیح ظہور زبان سے ہی ہوگا اسی لئے اس پر پابندی لگائی ہے کہ صادق القول ہونا چاہیئے۔ یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ روح انسان ہے یہ غلط ہے۔ عقل انسان ہے یہ بھی غلط ہے۔ اصل انسان اختیار ہے۔ میں نے خوب تحقیق کر لی ہے کہ صحیح مظہر انسانیت کا زبان ہے۔ جس زبان سے قول جھوٹا نکلا وہ انسان نہیں جانور ہے۔ بلکہ جانور سے بھی بدتر کیونکہ جانور بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ بہت اہم چیز ہے زبان۔ اکثریت مدار دین دنیا کا اس زبان پر ہے۔ زبان صرف سچ بولنے کے لئے دی گئی ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی

علیہ وسلم نے مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ
جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت پر اس کو چاہیئے کہ وہ حق بات کہے یا
خاموش رہے۔ اس کے لئے مواقع ہیں۔ جس جگہ صحیح بات بولنی چاہیئے
وہاں بولے، مطلق صحیح بات نہ بولے۔ یہ بات کہ اگر ایک مثلث کے دو
ضلع اور درمیانی زاویہ دوسرے مثلث کے دو ضلع اور درمیانی
زاویوں کے برابر ہوں تو قاعدہ قاعدے کے برابر ہوگا اور باقی زاوے
باقی زاویوں کے برابر ہوں گے۔ یہ بات قطعی حق ہے اور سچی ہے۔ مگر اس جگہ اگر
کہی جائے تو غیر مناسب ہے۔ نہیں کہنی چاہیئے۔ ناجائز ہے۔ یا شادی
کی مجلس میں کہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن یا موت کے گھر پر جا کر کہے
اَلْحَمْدُ لِلّٰہ دونوں خدا کے کلام ہیں۔ (بقرہ-۱۵۶) حق ہیں۔ لیکن ان موقعوں پر اجازت
نہیں ہے کہ یہ کلمات کہے جائیں۔ یہ تو خیر قرآنی آیات اور ادب کی
باتیں ہیں۔ لیکن اس قسم کی باتوں سے فسق و کفر کی حد تک پہنچ جاتا
ہے۔ مثلاً اگر کوئی لڑکا اپنے باپ سے یہ کہدے کہ تو نے میری ماں کے
ساتھ یہ فعل کیا یا میں تیرے اس عضو سے پیدا ہوں تو فوراً عاق ہو گیا۔
فاسق ہو گیا۔ یہ کہدے کہ محمدؐ بڑے اچھے آدمی تھے۔ فوراً کافر ہو گیا۔
تو صحیح بات کو غلط محل پر استعمال کا نتیجہ ہوا کہ فاسق و کافر ہو گیا۔
اسی لئے فرمایا وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا۔ تم ٹھیک بات کہو۔ سچی بات ٹھیک
نہیں ہے۔ بلکہ حق بات کے ساتھ کچھ قیود لگے ہیں کہ حق بات کو فلاں (احزاب-۷۰)
فلاں موقع پر جس طرح میں نے بتایا ہے استعمال کرو۔ دو اور تین پانچ

ہوتے ہیں۔ تسبیح لے کر رات دن پڑھتے رہو۔ نہ یہاں کچھ ملے گا نہ وہاں حالانکہ بات قطعی حق ہے۔ اب اس کو حسی مثال سے سمجھ لیں کہ مالک کے حلق میں نوالہ پھنس گیا اب نوکر ایک گھونٹ پانی اس کو پیش کرے تو یہ اس کے لئے مایۂ حیات ہے۔ اب اگر نوکر یہ سمجھے کہ یہ تو مایۂ حیات ہے اور دسترخوان پر گلاس پر گلاس چلتا چلا جائے تو اس کو انعام نہیں ملے گا۔ بلکہ اس حماقت پر اس کو ملازمت سے برخواست کر دیا جائے گا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تیری جان نکل رہی تھی۔ اس پانی سے تیری جان بچی ہیں تو تجھے ایسی عمدہ اور حیات بخش چیز دے رہا ہوں اور تو مجھے معزول کر رہا ہے۔ نہیں وہاں استعمال صحیح نہیں ہے۔ اسکے اشارہ اور حکم سے پانی دیا۔ وہ ٹھیک تھا۔ اور بغیر اس کے حکم کے وہی حسن فعل قبیح ہوگیا۔ تو معلوم ہوا کہ جو شئے جس کام کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس کو اسی کام میں بتائے ہوئے طریقہ پر استعمال کرنا۔ یہ شکر ہے۔ اگر اس کے خلاف کیا تو وہ ناشکری ہوگی۔ ظلم ہوگا۔ کفر ہوگا۔ اب بات غور طلب ہے کہ انسان ناسپاس کیوں ہے اور وجہ کی دلیل کیا ہے۔ ذرا غور کریں کہ کبھی کوئی آپ کو تفریحاً اچھی ہوٹل میں چائے پلا دے تو آپ ہمیشہ اس سے جب ملیں گے، مسکرا کر ملیں گے۔ اگر وہ کہیں ساتھ لے جانے کو کہے گا تو اس کے پاس خاطر سے اس کے ساتھ چلے جائیں گے۔ غرض یہ کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں، اور کہنا مانتے ہیں۔ مگر اس کے خلاف ہر شخص کا مشاہدہ ہے

ماں انتہائی محبت سے بے پناہ احسانات کرتی ہے اور ہر وقت ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ مگر لڑکا ہو یا لڑکی ماں سے اینٹھ کر بات کرتا ہے۔ اور ماں کسی بات کے لئے اصرار کرتی ہے تو جھڑک دیتا ہے کہ جی تم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہر وقت جان پر سوار رہتی ہو۔ نہیں میں یہ کام نہیں کروں گا۔ تو تھوڑی اور چھوٹی چھوٹی باتوں سے اتنا متاثر ہوتا ہے۔ اور اس سے زیادہ زیادہ بڑی بات پر جہاں اس کو زیادہ متاثر ہونا چاہیئے۔ بجائے متاثر ہونے کے خلاف کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ شدتِ انعامات باعث کفر ہے۔ ماں باپ اتنے شفیق نہیں ہیں جتنا خدا شفیق ہے۔ اس کی نافرمانی ماں باپ سے زیادہ کرتا ہے۔ کئی سال سے یہ مسئلہ پیش ہے کہ جب خدا ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے تو جلائے گا کیوں دوزخ میں کیوں ڈالے گا۔ ماں باپ تو اپنے بچوں کو کبھی نہیں جلاتے۔ وہ اپنے بندوں کو کیسے جلا دیتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ماں باپ بھی جب بچہ مر جاتا ہے جلا دیتے ہیں۔ اس کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ اس پر ان کو کچھ رحم نہیں آتا بلکہ اس میں بے حد جلدی کرتے ہیں۔ اس طرح کافر چونکہ اس میں ایمان نکل گیا وہ بمنزلہ مردہ کے ہو گیا۔ اب سوائے جلانے کے چارہ نہیں۔ جس طرح ماں باپ جلا دیتے ہیں وہ بھی جلا دیتا ہے۔ جس طرح جب تک ذرہ برابر روح رہتی ہے۔ جب تک بچے کو نہیں جلاتا۔ اسی طرح مثقال ذرۃ خیر یرہ۔ ذرہ برابر بھی ایمان رہتا ہے۔ وہ

بھی نہیں جلاتا۔ تو کافر تو مانند مُردہ کے ہے۔ اور فاسق مانند زخمی کے ہے۔ جس طرح یہاں ماں باپ اسپتال لے جاکر بچّے کے ہاتھ پیر کٹوا کر لے آتے ہیں۔ اسی طرح وہاں بھی دوزخ میں چند دن رکھ کر اپنے بندہ کو واپس لے آتا ہے۔ خدا ماں باپ سے بہت زیادہ شفیق اور بڑا مہربان ہے۔ ماں سے کہو کہ رات بھر حفاظت کرتی رہنا۔ گھنٹے دو گھنٹے جاگے گی پھر نیند آئے گی پڑ کر سو جائے گی۔ اور وہ ہر لمحہ ساری عمر حفاظت کرتا رہتا ہے۔ کوئی کیڑہ نہ کاٹ لے کوئی اور نقصان نہ پہنچ جائے۔ ۲۴ گھنٹے حفاظت کرتا ہے۔ وہ بہت رحیم ہے۔ ماں باپ کی کوئی حقیقت نہیں قُلْ مَنْ یَکْلَؤُکُمْ کون تمہاری حفاظت کر رہا ہے۔ (انبیاء-۴۲) سب سے زیادہ رحیم۔ سب سے زیادہ شفیق، سب سے زیادہ محسن۔ یہ شدّت احسانات ہی کفران کا موجب ہے۔ ان الانسان لِربّہ لکنود۔ انسان اپنے رب کا ناشکر گذار ہے اس کی وجہ شدّتِ احسان ہے اور انہ علیٰ ذٰلِکَ لَشَہید۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ ناشکرا ہے اور اس کے جاننے کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت بھی درد یا تکلیف اس کو ہوتی ہے وہ اپنے رب ہی کو پکارتا ہے۔ دَعَانا لِجَنْبِہٖ اوقاعدًا اوقائمًا۔ (یونس-۱۲) کھڑے اور بیٹھے ہر طرح اس کو پکارتا ہے۔ دفع مضرت سے طلب منفعت مقدم ہے۔ دُکھ سے بچنا اگر مقصود ہوتا تو عالم کو پیدا نہ کرتا کہ یہ عدم میں حاصل تھا۔ تو معلوم ہوا کہ سکھ کا حاصل کرنا مقصود ہے۔

مقصد تخلیق سکھ پہنچانا ہے۔ دکھ سے بچانا نہیں۔ کیونکہ وہ تو پیدا ہونے سے پہلے بھی حاصل تھا۔ تخلیق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تو اب دکھ پہونچ رہا ہے۔ تو پکار رہا ہے۔ جب سکھ حاصل تھا، اس وقت کبھی نہ پکارا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے انعامات کی پوری شہادت موجود ہے۔ بعض مفسرین اس طرف بھی گئے ہیں کہ ہ کی ضمیر انسان کی طرف نہیں بلکہ خدا کی طرف پھر رہی ہے کہ اللہ شاہد ہے اس بات پر بندہ ناشکرا ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہی ہے کہ ضمیر بندہ کی طرف پھر رہی ہے اور اس کو خود دیتہ ہے بل الانسان علیٰ نفسہٖ بصیرۃ۔ انسان خود اپنے دل میں ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ اور محسوس کر رہا ہے (قیٰمہ-۱۴) اور یہ آپ سب محسوس کرتے ہیں کہ جب بھی غلطی ہو گی فوراً ہی دل دھڑکے گا اور گناہ کرتے کرتے جب زنگ چڑھ گیا تو محسوس نہیں کرتا آواز برابر آرہی ہے بچانے کی مگر زنگ کی وجہ سے احساس ختم ہو جاتا ہے وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (یونس-۲۵) ۔ وہ سلامتی کی برابر دعوت دے رہا ہے۔ کفران کی علت کیا ہے۔ جتنی دنیا میں خرابیاں ہیں، ان کی دو علتیں ہوتی ہیں۔ ایک کا نام شہوت ہے ایک کا نام شبہہ ہے۔ اشتباہ کی وجہ سے عقائد خراب ہوتے ہیں اور شہوت کی وجہ سے اعمال خراب ہوتے ہیں۔ ان دو بناؤں پر یہ سب غلطیاں ہوا کرتی ہیں۔ کفران کا سبب یہ ہے کہ شہوت عقل پر غالب آگئی ہے۔ انسان کو پیاس لگتی ہے اور اس کے لئے وہ پانی چاہتا

ہے۔ ٹھنڈا ہو یا گرم اس کی خواہش ہوتی ہے کہ فوراً پیے۔ یہ شہوت کا تقاضہ ہے۔ اب پانی موجود ہے۔ مگر ناپاک ہے یا زہر بلا ہے ایسی حالت میں پیاسا رہنا اس پانی پینے کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ یعنی اگر دو تکلیفوں کا مقابلہ ہو، ایک کم ایک زیادہ تو کم تکلیف کو اختیار کرنا راحت اور زیادہ تکلیف کو اختیار کرنا بُرا ہے تو یہ شہوت غالب آگئی ہے۔ اس لئے بداعمالیاں ہو رہی ہیں اور شبہ غالب آگیا اس سے بداعتقادیاں پیدا ہو رہی ہیں اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ اور بیشک وہ مال کی محبت میں (خیر معنی مال) وہ بخیل ہو گیا۔ (شدید۔ بخیل) شدید کے معنی قوی بھی ہیں۔ مال سے اس کو محبت ہے اور اس کی بنا پر وہ قوت محسوس کرتا ہے۔ سب بُرائیوں کی بنیاد حب مال پر ہے حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (بیہقی مرسل) مال کی محبت ہی بڑا عیب ہے۔ یہ ہر گناہ کی جڑ ہے۔ دنیا کی جتنی چیزیں ہیں دو قسم سے ہیں۔ مبادی اور مقاصد۔ تو مقاصد تو ہیں کھانا، پینا۔ کپڑا، مکان اور مبادی یعنی ذریعہ ہے۔ روپیہ یعنی مال ان مقاصد کے مقابلے میں مال یعنی ذریعہ سے محبت کیوں ہے۔ غور کریں۔ اصل چیز کھانا۔ پینا، کپڑا، مکان ہے۔ مگر اس کی طرف توجہ کم ہے۔ اور روپیہ کے پیچھے آدمی بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ یہ کیوں ہے۔ مثلاً دوکاندار دوپہر کو کھانے کے لئے بیٹھا کہ گاہک آگیا۔ اکثر دیکھیں گے کہ کھانا چھوڑ کر گاہک سے بات کرنے لگتے ہیں حالانکہ اس سب کا مقصود

کھانا ہی ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ روپیہ
جملہ مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اس کا مالک ہونا کل چیزوں
کا مالک ہونا ہے کہ کائنات کی ہر شئے کا تبادلہ اس سے ہو سکتا ہے۔
اور وہ اس کی ملکیت ہو سکتی ہے اور اگر کسی ایک شئے کا مالک ہوگا تو
اس شئے سے تمام دوسری چیزوں کا تبادلہ نہیں۔

تو مقصود بالذات حقیقی کو چھوڑ دیا۔ مقصود بالذات ارذی کو
چھوڑ دیا اور روپیہ جو اس کا ذریعہ تھا، اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔
اسی کا نام بخل ہے۔ روپیہ بقا اور قیام نظام عالم کے لئے تھا۔ تقسیم
کرنے اور پھیلانے کے لئے تھا۔ مگر اس نے الٹا کیا کہ اس کو گھر میں
بند کر کے رکھ لیا۔ اس لئے بخل کی مذمّت کی گئی ہے۔ یا محبت مال
میں بڑا سخت ہے۔ یا محبت مال کی وجہ سے بخیل ہے کہ دونوں معنی
ہیں۔ یہاں ڈانٹ ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ افلا یعلم اذا بعثر ما
فی القبور ۔ کیا نہیں جانتے کہ کل قبروں میں سے اٹھائے جائیں گے
وحصل ما فی الصدور۔
اور ظاہر ہو جائے گا۔ (تحصیل = ظاہر ہونا) جو کچھ دلوں میں ہے
دل سے مراد گوشت کا لوتھڑا نہیں ہے۔ وہ تو جانوروں اور مردوں
کے بھی ہوتا ہے، بلکہ جو اس کی سواری ہے، وہ مراد ہے۔ اور سینہ
اسلئے کہا۔ وہ اسکے رہنے کی جگہ ہے۔ اعمال کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ
اس کا ذریعہ ما فی الصدور ہی ہوتا ہے۔ جتنے اعمال ہوتے ہیں وہ دل
کے حالات کے تابع ہوا کرتے ہیں تو دل کے حالات جو مبادی ہیں۔

تمام اعمال کے وہ نمایاں شکل میں آجائیں گے۔ صحیفے کے صحیفے پھیلے ہوں گے۔ اس کا تو اسے کوئی خیال نہیں ہے اور یہاں تخیل کر رہا ہے۔ اِنَّ رَبَّهُم بِهِم يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ

بے شک ان کا رب اس دن ان کی تمام باتوں پر خبردار ہو گا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا رب تو آج بھی باخبر ہے، اس دن کیا باخبر ہو گا۔ جواب یہ ہے کہ ہمیں پتہ نہیں ہے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اس روز ہمیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے، صرف تخیل ہے۔ آپ شراب کا گلاس لے لیں یا کوئی گناہ کرنے لگیں اور معلوم ہو کہ کوئی دوست وغیرہ آرہا ہے۔ فوراً لرز جائیں گے یا ان سے بھی کوئی بڑا باپ وغیرہ آتا ہو گا تو زیادہ پریشان ہوں گے۔ اور ندامت محسوس کریں گے۔ مگر وہ سب سے بڑا آپ کو دیکھ رہا ہے اور بغیر ندامت گناہ کر رہے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں یہ پتہ نہیں ہے کہ ہمارا خدا ہم کو دیکھ رہا ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو یہ سمجھ کے پڑھو کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ خدا تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ سمجھ لے۔ اللہ آپکو شرک و کفر سے بچائے اور مجھے بھی۔ اب آپ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں۔ پھر اپنے نبی پر درود بھیجیں پھر اپنے لئے دعا کریں اور میرے لئے بھی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ
وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪

زمانہ کی قسم بیشک انسان قطعی ٹوٹے اور خسارہ اور گھاٹے میں ہے۔
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور باہم ایک دوسرے کو حق
کی وصیت اور حکم دیتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔
قسم اور حلف کے معنی کیا ہیں مثلاً تو اگر کہے کہ اللہ کی قسم زید قائم ہے۔
تو اللہ کی قسم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تیرے خیال میں اللہ حق ہے
اسی طرح یہ بات حق ہے کہ زید قائم ہے۔ یعنی قسم کے معنی حق کے ساتھ تشبیہ دینے کے
ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جس طرح زمانہ حق ہے اور زمانہ کے وجود میں کسی طرح کا شک
اور شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اس بات میں بھی شک نہیں ہے کہ انسان ٹوٹے اور
خسارہ اور گھاٹے میں ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ متکلمین نے زمانہ کے وجود کا انکار
کیا ہے پھر کیسے زمانہ امر حق اور واقعی چیز ہو سکتا ہے تاکہ انسان کے گھاٹے میں
ہونے کو اس سے تشبیہ دی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متکلمین نے زمانہ کے
اس معنی کا انکار کیا ہے جو فلاسفہ نے بیان کئے ہیں۔ یعنی فلک الافلاک کی حرکت
کی مقدار کا نام فلاسفہ نے زمانہ رکھا ہے اور اس مقدار کو فلسفی متصل غیر قار
کہتا ہے اور موجود حقیقی کہتا ہے متکلم اس کو موجود حقیقی نہیں مانتا بلکہ زمانہ کو موہوم
کہتا ہے۔ مطلقاً زمانہ کا متکلم منکر نہیں ہے اور اس کی بحث علم کلام میں جو المجلس
میں طبع ہو رہا ہے بالتفصیل آئے گی اور حق یہ ہے کہ زمانہ حق ہے خواہ اس کی ماہیت

کچھ بھی کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا۔ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ پ ۳۰ر ۳
وہ دن حق ہے۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا (پ ۳۰ ر ۲) اللہ کے دنوں کو یعنی یاد کرا۔
اور ظاہر ہے کہ زمانہ یوم ہے اور یوم حق ہے تو لابد زمانہ حق ہے لہٰذا زمانہ سے
انسان کے گھاٹے میں ہونے کو تشبیہ دی جا سکتی ہے یہ کہنا کہ متکلم انکار کرتا ہے بے معنی
ہے علم کلام میں ہم تفصیل سے بیان کریں گے اب اس بات کا بیان کہ انسان ٹوٹے میں
ہے یہ ہے کہ انسان مکلف مختار ہے۔ اور ہر مکلف مختار ٹوٹے میں ہے۔ نتیجہ صریح انسان
ٹوٹے میں ہے۔ اور یہ دونوں مقدمے ثابت ہو جائیں تو قطعی اور صریح نتیجہ یہ نکلے
گا کہ انسان ٹوٹے میں ہے۔ اب اس مقدمہ کا ثبوت کہ انسان مکلف ہے یہ ہے کہ انسان
کے مکلف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا وجود کسی دوسری شے کے لئے ہے۔ کیونکہ اگر
اس کا وجود کسی دوسری شے کے لئے نہ ہوگا تو پھر یا اس کا وجود اسی کے لئے ہوگا یا
اس کے لئے بھی نہ ہوگا تو اگر انسان کا وجود نہ کسی دوسری شے کے لئے ہو اور نہ خود
اس کے لئے ہو اور وجود کے معنی مبدء آثار کے ہیں اور لئے کے معنی ترتب اثر کے
ہیں تو انسان کے وجود کے معنی یہ ہوتے کہ انسان کے وجود پر اثر مرتب نہیں ہے
کیونکہ اگر اثر مرتب ہوگا تو وہ وجود اس اثر کے لئے ہوگا۔ اور اس وقت جبکہ اس
کا وجود کسی کے لئے بھی نہیں ہے یعنی نہ اپنے لئے نہ دوسرے کے لئے تو لابد انسان
کا وجود کالعدم ہوگا یعنی انسان کا ہونا نہ ہونا ہوگا۔ اور یہی عبث کے معنی ہیں۔
لہٰذا انسان کا وجود عبث نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی کے لئے نہ ہو اور اس کے
باوجود پر اثر مرتب نہ ہو۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا۔ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝
کیا تم اس خیال میں ہو کہ ہم نے تم کو بیکار عبث بنایا ہے۔ یعنی کسی شے

کے لئے نہیں بنایا فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ (مومنون ۱۱۶) اللہ تعالیٰ سچا بادشاہ ایسے فعل عبث سے پاک اور برتر ہے۔ لہٰذا یہ شق کہ انسان کا وجود کسی دوسری شے کے لئے نہیں ہے۔ باطل ہے اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ شے کا وجود کا کسی شے کے لئے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کے وجود پر کوئی اثر مرتب نہیں ہے۔ اور وجود وہ شے ہے کہ جس پر اثر مرتب ہو تو لابد اثر کا مرتب نہیں ہے اور وجود وہ شے ہے کہ جس پر اثر مرتب ہو تو لابد اثر کا مرتب ہونا اثر کا مرتب نہ ہونا ہے۔ اور یہ اجتماع باطل ہے۔ لہٰذا

اب اس بات کا بیان کہ وجود انسان انسان کی ذات کے لئے نہیں ہے۔ کیونکہ جو شے کسی شے کے لئے ہوتی ہے وہ جب ہی اس شے کے لئے ہوتی ہے۔ جب وہ شے اس شے میں ہو یعنی وجود انسان انسان کی ذات کے لئے جب ہی ہو سکتا ہے کہ جب وجود انسان انسان کی ذات میں ہو۔ اور وجود انسان انسان کی ذات میں جب ہوگا۔ جب وجود انسان انسان کی ذات سے ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان کا وجود لذاتہٖ ہوگا تو قطعی فی ذاتہٖ ہوگا۔ اور جب فی ذاتہٖ ہوگا۔ تو قطعی بذاتہٖ ہوگا۔ اور انسان کا وجود قطعی بذاتہٖ نہیں ہے۔ یعنی انسان کی ذات قطعی وجود کو مقتضی نہیں ہے، کیونکہ وجود میں کثرۃ ہے اور ذات میں وحدۃ ہے اور واحد یعنی ذات کثرۃ یعنی وجود کی مقتضی نہیں ہو سکتی۔ حاصل یہ ہے کہ ذات یعنی انسانیت واحد ہے اور خارج میں اس کا وجود اس کے افراد زید عمر بکر وغیرہ ہیں جو کثیر ہیں۔ تو ذات وحدہ کیونکہ کثیر کی موجب ہو سکتی ہے اور اگر ذات علت وجود ہوگی۔ تو وحدۃ الوجود لازم آئیگا یعنی خارج میں صرف ایک ہی فرد انسانیت ہوگا۔ اور ایسا ہے نہیں تو معلوم ہو گیا

کہ وجود ذات کو لازم نہیں ہے - اور ذات موجب اور علت وجود نہیں ہے - بلکہ خارج ذات سے ذات کو وجود حاصل ہوا ہے - انسان کی ذات بذاتہ موجود نہیں ہوئی ہے - اور اس کا وجود بذاتہ نہیں ہے - اور جب اس کا وجود بذاتہ نہیں ہے تو قطعی فی ذاتہ نہیں ہے اور جب فی ذاتہ نہیں ہے تو قطعی لذاتہ نہیں ہے - یعنی انسان کا وجود انسان کی ذات کے لئے اور اوپر یہ ثابت ہو چکا کہ یہ شق بھی باطل ہے کہ اس کا وجود کسی دوسری شے کے لئے نہیں ہے تو جب یہ بھی باطل ہے کہ اس کا وجود اس کے لئے ہے اور یہ بھی باطل ہے کہ اس کا وجود دوسری شے کے لئے نہیں ہے تو قطعی یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا وجود قطعی دوسری شے کے لئے ہے - اور وجود کا دوسری شے کے لئے ہونا ہی تکلیف ہے یعنی انسان دوسری شے کے لئے پیدا ہوا ہے اور انسان کا اس دوسری شے تک پہنچنا ہی اس دوسری شے کے ساتھ مکلف ہونا ہے - لہٰذا ثابت ہو گیا کہ انسان مکلف ہے یعنی اس کا وجود کسی دوسری شے کے لئے ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ دوسری شے کیا ہے - کائنات میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ انسان اس کے لئے ہوا ہو کہ ہر شے بالواسطہ یا بلا واسطہ انسان میں صرف ہو رہی ہے اور جو شے دوسری شے کے لئے ہو اور دوسری شے میں صرف ہو تو دوسری شے پہلی شے میں صرف نہیں ہو گی - اور نہ دوسری شے پہلی شے کے لئے ہو گی - یعنی مفردات مرکبات کے لئے ہیں اور مرکبات میں خرچ ہو رہے ہیں - اب اگر مرکبات مفردات میں صرف ہو جائیں گے تو نہ مرکبات باقی رہیں گے نہ مفردات اس وقت نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا -

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کئی خدا ہوں گے یعنی ایسی چیزیں ہوں گی کہ انسان ان کے لئے ہو تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا - لہٰذا انسان

سوا اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے نہیں ہے۔

میں نے اپنے لئے تجھے تیار کیا۔ اب اگر انسان جس شے کے لئے ہوا تھا اس شے کیلئے نہ ہوا تو گویا ہوتے ہوئے نہ ہوا یہی معنی ہیں اللہ تعالےٰ کے قول اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ٥ کے۔ جیسے مکان مکین کے لئے بنا تھا۔ اب کوئی اس مکان میں آباد نہ ہو تو اس کا بننا اور ہونا گویا نہ بننا اور نہ ہونا ہے۔ اور یہی مقام جہنم ہے کہ وہاں نہ موت ہے نہ حیات ہے۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ انسان مکلّف ہے یعنی انسان کا وجود کسی دوسری شے کے لئے ہے۔ تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان دوسری شے تک پہنچنے میں مختار ہے۔ یعنی انسان اپنے اختیار سے دوسری شے تک پہنچے گا کیونکہ ساری کائنات دوسری شے کے لئے لا بالاختیار اور بالایجاب اور بالاضطرار ہے۔

یعنی مخلوقی وجود بیکار نہیں ہے یعنی قطعاً دوسری شے کے لئے ہے۔ لہٰذا انسان کے علاوہ کل کائنات دوسری شے کے لئے بالاضطرار ہے۔ اور انسان دوسری شے کے لئے بالاختیار ہے۔ اگر انسان بھی دوسری شے کے لئے لا بالاختیار ہو گا تو وہ مثل کائنات ہو جائے گا۔ بلکہ ساری کائنات سے بدتر ہو جائے گا۔ کیونکہ جو اشیاء بالاضطرار دوسری اشیاء کے لئے ہیں۔ ان پر ان کے وجود کا اثر مرتب ہو چکا اور وہ حقیقۃً موجود ہو گئے اور انسان چونکہ دوسری شے میں صرف نہیں ہو رہا اس لئے انسانی وجود پر اثر مرتب نہیں ہوا۔ اس لئے انسان ہوتے ہوئے نہ ہوا اس لئے تمام کائنات اور مخلوقات سے بدتر ہو گیا۔

لہٰذا انسان لازمی طور پر اپنے اختیار سے دوسری شے کے لئے ہو گا۔ لہٰذا انسان کا مختار ہونا ضروری ہے اور انسان مکلّف بالاختیار ہے۔ اور مکلّف مختار

ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ اب اگر انسانی افعال انسان کے اختیار سے صادر ہوں گے۔ تو اجتماع النقیضین لازم آئے گا۔ اور اس شبہ کے حل کرنے سے اولین اور آخرین قاصر رہے۔ آج تک یہ شبہ حل نہیں ہو سکا۔ میں کہتا ہوں کہ اس شبہ کی مکمل تقریر اور اس کا حل سورۂ بقر کے پہلے رکوع کی تفسیر میں میں نے بیان کر دیا ہے۔ اور مختصر یہ ہے کہ عالم تکلیف اور شے ہے۔ عالم واقع اور شے ہے۔ عالم واقع ارادے کے تابع ہے عالم تکلیف امر کے تابع ہے۔ اور انسانی شعور عالم تکلیف اور عالم امر سے وابستہ ہے یعنی انسانی شعور چونکہ مخلوق ہے اس لئے خالق اور ارادۂ خالق مخلوق شعور میں نہیں آ سکتے۔ اس لئے یہ بات کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے یہ بات واقع میں حق ہے لیکن عالم تکلیف میں بندہ اپنے فعل پر قادر ہے۔ اور بندہ کو اپنے فعل پر قادر ہونے کا شعور ہے۔ یہاں تک کہ جانور کو بھی بندے کے قادر ہونے کا شعور ہے۔ اور جس شعور سے بندہ کو اپنے قادر ہونے کا شعور ہوا ہے۔ اس شعور سے اللہ تعالیٰ کے بندے کے فعل پر قادر ہونے کا شعور نہیں ہوتا۔ لہٰذا شعور مخلوق میں بندے کے فعل پر اللہ تعالیٰ کا قادر ہونا منافی نہیں ہے۔ شعور مخلوق میں بندے کے اپنے فعل پر قادر ہونے کا حاصل ہے۔ اگر اس شعور سے بندہ کی [illegible] شعور ہوتا اسی شعور سے خدا کی قدرت کا [illegible] نہیں ہے اور اگر اسی شعور سے خدا کی قدرت [illegible] ہو جاتی تو نظام تکلیف ساقط ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کا وجود [illegible] ہو جاتا انسان کو اپنا وجود شعور ہے اور [illegible] ایمان کا اختلاف اور [illegible] سب ختم ہو جاتا اور تمام انسان ایک ہی امت ہو جاتے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایسا بھی ہو جاتا لیکن اس نے مخلوق [illegible] انسان کو آزمایا کہ وہ اپنے مخلوق شعور [illegible]

ماتحت کس قدر اپنے خالق کی اطاعت کرتا ہے۔

اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک جماعت بنا دیتا ولیکن وہ تم کو مخلوقی
شعور میں آزمانا چاہتا ہے۔ سوال

اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے بندہ اپنے فعل کا خالق ہے۔ یہ دو قضیے ہیں
ہر ایک دوسرے کے خلاف ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دونوں قضیوں میں تناقض ہے۔ یا نہیں ہے۔
اگر تناقض ہے تو قطعی ہر ایک کا صدق دوسرے کے کذب کو اور ہر ایک کا کذب دوسرے
کے صدق کو مستلزم ہے یعنی اگر یہ بات حق ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے تو قطعی
یہ بات غلط اور کاذب ہے کہ بندہ اپنے فعل کا خالق ہے اور اگر یہ بات حق ہے کہ بندہ
اپنے فعل کا خالق ہے تو قطعی یہ بات غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے اور اس
وقت وہ مایوس کن حیرانی و پریشانی جو ہزارہا سال سے عقول انسانی پر طاری ہے قطعاً
باقی رہ جاتی ہے۔ اور کوئی اس سے بچنے کی تدبیر نہیں ہے۔ اور جتنی تدبیریں اس سے بچنے کی
کی گئی ہیں۔ وہ سب بے بنیاد اور لغو اور غلط ہیں۔ حیرانی اور پریشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
کے خالق ہونے کی تقدیر پر بندہ مجبور محض ہو کر مدح وذم ثواب و عتاب کا مستحق نہیں رہتا
اور اس وقت شرائع کا ابطال لازمی ہے۔ اس جماعت نے اس پریشانی سے بچنے کی تدبیر
یہ بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل سے سوال نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات قطعی حق ہے
اور اتنی روشن ہے جیسے ٹھیک دوپہر کو سورج روشن ہے لیکن جس طرح سورج کی روشنی
سے کوٹھری اور تہہ خانہ کی ظلمت اور اندھیرے کی نفی نہیں ہوتی اسی طرح اس بات
سے یعنی اللہ تعالیٰ کے فعل سے سوال نہ ہو سکنے سے شرائع کے ابطال کی نفی نہیں ہوتی اور

بندہ اپنے فعل کا مستقل خالق ہے اس میں پریشانی یہ ہے کہ غیر اللہ میں خالقیت کی صلاحیت ہے ہی نہیں ورنہ توحید باطل ہو جائے گی اور کچھ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے درمیانی رستہ اختیار کیا لیکن ان کو درمیانی رستہ نہیں ملا یعنی کسب کا لفظ اختیار کیا جس کے معنی غیر مستقل خالقیت کے ہیں یعنی مستقل خالق تو خدا ہی ہے لیکن غیر مستقل خالقیت بندہ کے لئے ثابت کی اور یہ خیال نہ کیا کہ یہ کسب یا وجود ہے یا عدم ہے یا وجود و عدم کے درمیان ہے اور یہ تینوں رستے بند ہیں کیونکہ وجود کی تقدیر پر ایک موجود کا مستقل خالق ہو گیا غیر مستقل خالقیت کہاں رہی اور عدم کی تقدیر پر مستقل رہا نہ غیر مستقل رہا اور درمیان وجود و عدم جس کا انھوں نے نام حال رکھا ہے۔ اس پر اثر مرتب ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اثر کا ترتب تو وجود ہے اور اس حال کی تقدیر پر تمام کائنات ابدی کا دارو مدار اسی کسب اور اسی حال پر

ہے تو یہ حال و کسب کیسے درمیانی چیز ہو سکتا ہے۔ الغرض انتہائی پریشانی میں۔ تمام جماعتیں مبتلا ہیں۔ اور آج تک حل تلاش نہ کر سکیں بحمداللہ میں کہتا ہوں کہ یہ قضیہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے۔ اور یہ قضیہ کہ بندہ اپنے فعل کا خالق ہے۔ ان دونوں میں تناقض ہے ہی نہیں۔ کیونکہ دو متقابلوں کا ایک محل میں ایک دن میں ایک حیثیت سے اجتماع کا نام تناقض ہے۔ اور یہاں ایک محل نہیں ہے۔ بلکہ دو محل ہیں ایک شعور مخلوقی ایک شعور حقیقی۔ شعور مخلوقی میں بندہ کا اپنے فعل کا خالق ہونا شعور حقیقی میں بندہ کے فعل کا خدا کے خالق ہونے کے منافی نہیں ہے یعنی شعور حقیقی میں بندہ کے فعل کا خالق خدا ہے۔ اور شعور مخلوقی میں بندہ کے فعل کا خالق بندہ ہے اور ان دونوں میں تناقض نہیں ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ حقیقی [illegible]

اور دوہی ایک شے بصارۃ احولۃ میں دوشئی ہیں۔ بصارہ احول میں دوحق ہیں۔
اور بصارہ حقیقی میں ایک حق ہے اور ہوسکتا ہے کہ تمام اہل بصر احول ہوجائیں
اور اس وقت یعنی عالم آخرت میں دوہی حق ہوں اور توحید باطل ہو۔
حاصل یہ ہے کہ انسان کو انانیت کا شعور مخلوقی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں
انانیت کا شعور پیدا کردیا ہے۔ نہ حقیقی انانیت ہے نہ حقیقی شعور بلکہ مخلوقی شعور ہے۔
اس مخلوقی شعور کے اعتبار سے یہ اپنے آپ کو میں کہتا ہے۔ اور جو افعال اس سے صادر
ہوتے ہیں ان کا فاعل اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ اور اسی مخلوقی شعور کے اعتبار سے یہ مکلّف
ہے اور اسی مخلوقی شعور کے اعتبار سے شرائع اور ان کی جزائیں ہیں یعنی دار عمل، اور
دار جزا اسی مخلوقی شعور سے ہیں تو بندہ اس موجود شعور کے اعتبار سے ہیں تو بندہ اس
موجود شعور کے اعتبار سے اپنے افعال پر قادر ہے۔ اور اسی اعتبار سے مکلّف ہے۔
اور مستحق مدح وذم اور ثواب عتاب ہے اور جس اعتبار سے اللہ تعالیٰ اس کے فعل کا
خالق ہے اس اعتبار سے نہ مکلّف ہے نہ اپنے افعال کا فاعل ہے۔ نہ مدح وذم ہے نہ
ثواب وعتاب ہے کیونکہ جس ظرف ومحل میں اور جس اعتبار سے خدا تعالیٰ فاعل ہے
وہ ظرف اور وہ محل اور وہ اعتبار اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے اور ارادے سے مراد
جدا ہے نہیں پھر اس مراد کے حاصل کرنے کے لئے امر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مراد
ارادۂ الٰہی سے حاصل ہو رہی ہے مزید امر کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان اپنے افعال
کے علاوہ کائنات میں جتنے افعال دیکھ رہا ہے خوب جانتا ہے کہ یہ اس کے افعال نہیں
ہیں اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں۔ اسی طرح اگر وہ اپنے افعال کو بھی خدا تعالیٰ کے افعال
جانتا تو وہ ان کو بھی خدا تعالیٰ ہی کے افعال کہتا لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ فرق کرتا ہے

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ اس شعور کے ظرف میں یہ اپنے افعال کا فاعل ہے اور اسی شعور کے اعتبار سے مکلف ہے اور اسی شعور کے اعتبار سے جزا ہے۔ اب اگر تو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے فعل کا خالق ہے۔ یہ بات عقلی دلیل اور شرعی دلیل سے ثابت ہو چکی اور بندہ کو یہ شعور ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ اس کے افعال کا خالق ہے۔ تو میں کہوں گا یہی وہ دھوکا ہے جس میں تمام عالم مبتلا ہو گیا۔ یہ شعور بندہ کا حقیقی مخلوقی شعور نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی شعور کی حکایت کا مخلوقی شعور ہے۔ اور بندہ کو اپنے فاعل ہونے کا حقیقی مخلوقی شعور ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ احول کو بالیقین یہ معلوم ہے کہ یہ شے ایک ہے۔ اس کے باوجود وہ دو ہی دیکھ رہا ہے یعنی اس بات کا شعور حکائی ہے۔ اور یہ شے

ایک ہے لیکن باوجود اس نقلی شعور حکائی کے وہ ایک شے کو دو ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ یہ شے ایک ہے لیکن وہ دو ہی دیکھے جائے گا۔ اسی طرح بندہ کو یہ یقین ہوتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے فعل کا خالق ہے وہ یہی دیکھ رہا ہے۔ اور سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے فعل کا فاعل ہوں اور میں اپنے فعل کے حسن و قبح مدح و ذم ثواب عتاب کا ذمہ دار ہوں۔ اب اگر تو یہ کہے کہ احول دو دیکھنے پر مجبور ہے اور یہاں تم بندے کو فاعل مختار کہتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح احول دو دیکھنے پر مجبور ہے اسی طرح یہ ہیں کہ جب وہ اپنے اختیار سے دیکھتا ہے تو دو ہی دیکھتا ہے۔ اور دو دیکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اسی طرح بندہ جب اپنے اختیار سے فعل کرتا ہے۔ تو اپنے آپ کو فاعل مختار پانے پر مجبور پاتا ہے۔ یعنی جس طرح وہ دو دیکھنے پر مجبور ہے۔ اسی طرح بندہ اپنے آپ کو فاعل مختار پانے پر مجبور ہے۔ اور جس طرح احول کا ایک شے کی طرف نظر ڈالنا اور دیکھنا اختیاری ہے اور اس شے کا دو دکھائی دینا مجبوری ہے۔ اسی طرح بندہ کا ایک فعل کرنا اختیاری ہے اور اس فعل کا ہونا مجبوری ہے۔ یعنی بندہ اپنے اختیار سے

سے نقل کرنے پر مجبور ہے ۔جس طرح احول اپنے اختیار سے ایک شے کو دو دیکھنے پر مجبور ہے ۔تنبیہ جو علم اور جو شعور نظر و استدلال سے حاصل ہوتا ہے اور کسب سے حاصل ہوتا ہے وہ علم و شعور اختیاری ہوتا ہے ۔اور جو علم و شعور بغیر نظر و استدلال اور بغیر کسب کے حاصل ہوتا ہے ۔ وہ جبری اور اضطراری ہوتا ہے ۔تو انسان کو اپنے مختار ہونے کا علم و شعور جبراً و اضطراراً حاصل ہوا ہے اپنے مجبور ہونے کا علم اختیار و کسب سے حاصل ہوا ہے تو گویا مجبور ہونے پر مختار ہو گیا ۔اور مختار ہونے پر مجبور ہو گیا ۔ اور اس وقت ضابطہ یہ ہے کہ ایمان جبر پر ہوگا اور عمل اختیار پر ہوگا ۔یعنی ایمان لانا پڑے گا ۔کہ اللہ میرے ہر فعل اختیاری کا خالق ہے ۔اور عمل اس بات پر ہوگا کہ میں اپنے ہر فعل اختیاری پر قادر اور مختار ہوں ۔تاکہ شرائع اور نبوۃ اور مدح و ذم اور ثواب و عتاب باقی رہے ۔اور اللہ تعالیٰ کا ہر فعل کا خالق ہونا ثابت رہے ۔ تو جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے وہ خسارے اور ٹوٹے سے بچ گئے ۔وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۵ۧ اور باہم ایک دوسرے کو حق کی وصیت اور حکم دیتے رہے اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور حکم کرتے رہے ۔

اسلام اصلاح انفرادی و اجتماعی ساتھ ساتھ چاہتا ہے ۔ایمان اور عمل صالح، صفات انفرادی لازمی کمال کے ہیں اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، صفات ملّی و اجتماعی کمالات متعدی ہیں ان کا حکم دیا ۔ساری عمر جو اللہ کی نعمت ہے تحصیلِ علم اور تکمیل میں صرف ہونی چاہیئے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (۱۰۷)

ترجمہ: تم نے دیکھا اس شخص کو جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یتیم کو بے عزتی سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس افسوس ہے ذیل ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں بھولے ہوئے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں اور معمولی برتنے کی چیزوں کو بھی (خدا کے نام پر) دینے سے روکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کیا پہچانا آپ نے اس شخص کو جو مکذب دین ہے یا دین کو جھٹلاتا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران) دین سے مراد یا تو دین اسلام ہے یا یوم حساب و کتاب جزا و سزا کے ہیں یہ دو معنی یہاں لگتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو جھٹلاتا ہے۔ یہ دراصل علامت بتلائی گئی ہے۔ سبب بتایا ہے۔ مکذب دین کی کہ یتیم کو بے عزتی سے دھکے

دے کر نکال دیتا ہے مسکین کو کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا اور معمولی معمولی چھوٹی چھوٹی روزانہ استعمال کی چیزیں بھی خدا کی راہ میں دینے سے روکتا ہے۔

اب یہ سمجھنا ہے کہ یہ تینوں باتیں دین کی تکذیب کیونکر ہیں اور دین سے ان کا کیا ربط ہے۔

یتیم اس بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ مرگیا ہو اور جانوروں میں وہ بچہ جس کی ماں مرجائے یتیم کہلاتا ہے یعنی مربی سے محروم بچے کو یتیم کہتے ہیں۔ مسکین ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کمائے اور اس کا گذارہ نہ ہو۔ اور جو کچھ نہ کما سکے وہ مسکین نہیں ہے۔ ثبوت آیت اما السفینة فکانت لمساکین سے یہ ثابت ہے کہ کشتی مسکینوں کی تھی۔ (کہف۔ ۷) بہر حال کشتی کی کچھ نہ کچھ قیمت تھی وہ سرمایہ تھا یعنی ایسا سرمایہ دار جس کا گذارہ نہ ہوسکتا ہو مسکین کہلاتا ہے اور جس کے پاس بالکل سرمایہ نہ ہو فقیر کہلاتا ہے۔ اس کو مسکین نہیں کہتے۔

دین کیا ہے: دین اور مذہب ایک ہی چیز ہے دونوں لفظ بولے جاتے ہیں۔ مذہب مشتق ہے ذہب سے جس کے معنیٰ چلنا جانا ہیں۔ تو مذہب چلنے کی جگہ ہوئی جس جگہ چلیں گے وہ ہی جگہ مذہب کہلائے گی مگر انسان چلتا ہے جانور بھی چلتے ہیں۔ ہوا پانی بھی چلتے ہیں تو چاہیئے کہ سب کے لئے مذہب ہو۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دین سے مراد یہ مذہب نہیں ہے جسمانی مسافت طے کرنا مراد نہیں ہے۔ مذہب صرف انسان کے لئے خاص ہے۔ وہ انسان اور جانور اور دیگر چیزوں میں مشترک

نہ ہوگی بلکہ ممتاز ہوگی انسان کیلئے انسان حیوان اور غیر ذی روح میں امتیاز کی
علت صرف عقل ہے تو مذہب کا مطلب ہوا عقل کے چلنے کی جگہ۔ عقل جس
جگہ چلے اس کو دین کہتے ہیں۔

حرکت یا چلنا کیا ہے: چلنا حرکت ہے۔ جسم کا ایک مکان کو چھوڑنا اور دوسرے مکان میں پہنچنا۔ اس کا نام
حرکت ہے۔ اسی کو طلب بھی کہتے ہیں۔ طلب اور حرکت انسان اور غیر
انسان میں یکساں پائی جاتی ہے سب برابر حرکت کررہے ہیں۔ سب کا مقصد
ایک ہی ہے۔ مقصد سے یہ مطلب نہیں ہے کہ مقصود بالذات ایک ہے مقصود
بالذات ایک نہیں ہے۔ نفس حرکت متقضی ہے اس امر کی کہ ایک جگہ کو
چھوڑے اور دوسرے تک پہنچے۔ انسان انسانی حیثیت سے حرکت کررہا ہے۔
جانور حیوانی حیثیت سے۔ مگر حرکت بالذات مقصود نہیں ہے۔ یہ مادی حرکت
مذہب نہیں ہے بلکہ مذہب سے مراد روحانی حرکت یا طلب ہے یہ انسان
کے ساتھ خاص ہے۔ یہی عقل کے چلنے کی جگہ ہے اسی کو مذہب یا دین کہتے
ہیں۔ طلب بھی یہی ہے کہ ایک جگہ سے بھاگتا ہے دوسری جگہ پہونچتا ہے
قبح کو چھوڑتا ہے۔ حسن تک آتا ہے۔ حرکت کا نقطہ اوّل یعنی مبدا قبح ہے
اور نقطہ ثانی یعنی وصل حسن ہے قبح کو چھوڑتا ہے حسن تک آتا ہے۔ درمیانی
مسافت حرکت کہلاتی ہے۔ حسن و قبح دائمی ہو یا عارضی اس جہاں میں ہو یا
اس جہاں میں کہیں بھی ہو حرکت کی علت قبح کو چھوڑنا اور حسن تک پہنچنا ہے
مطلق حسن و قبح علت حرکت ہے۔ آپ دیکھیں ہر جگہ یہی ہو رہا ہے

تجارت میں، عبادت میں. کاروبار میں، دین کے ہوں یا دنیا کے ہر جگہ قبح سے حسن تک پہنچ رہا ہے، مثلاً خریدار دوکاندار سے قیمت دریافت کرتا ہے۔ اور کمی بیشی کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ جب تک گاہک کو اپنے پیسے کا حسن اور دوکاندار کو اپنے مال کا حسن نظر آتا ہے، معاملہ طے نہیں ہوتا مگر جوں ہی دوکاندار کو اپنے مال کا قبح پیسے کے مقابلے میں اور خریدار کو اپنی رقم کا قبح شے کے مقابلے میں نظر آتا ہے، فوراً معاملہ طے ہو جاتا ہے، وہ جیب سے رقم نکال کر دوکاندار کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے اور دوکاندار مال لپیٹ کر خریدار کے حوالے کر دیتا ہے۔

یہ حسن و قبح کیا شے ہے: ایک تو حسن و قبح وہ ہے جو شبہ اور شہوت کے تابع ہے۔[1] جسمانی مطلوب چیز اور حس کی طرف لے جانے والی شے شہوت کے تابع ہوتی ہے اور اسی سے تمام معاصی گناہ اور فسق و فجور پیدا ہوتے ہیں۔ اور روحانی مطلوب چیز کی طرف عقل کو لے جانے والی شے شبہ کے تابع ہوتی ہے یہی بنیاد ہے تمام بدعقیدگی اور باطل مذاہب کی۔ یعنی جو حرکت شہوت اور شبہ کے تحت ہوگی۔

---

[1]: جو شے روحانی مطلوب شے یعنی حس کو عقل کی طرف لے جا رہی ہے وہ شبہ ہے اور جو شے جسمانی مطلوب شے یعنی حس کی طرف عقل کو لے جا رہی ہے وہی شہوت ہے اور

اس کے راستے میں جو رکاوٹ آتی ہے اس کی مدافعت جو شے کر رہی ہے اس کو غضب کہتے ہیں۔

اصل دین یا مذہب نہیں ہے۔

شبہ کے کیا معنی ہیں: ایک شے کا دوسری شے کے ساتھ اس طرح مشتبہ ہونا کہ دوسری شے کو پہلی شے سمجھ لے۔ تاآنکہ اگر اچھی معلوم ہو تو اس کو اختیار کر لے اور بری معلوم ہو تو اس کو ترک کر دے۔ خواہ واقع میں اس کے خلاف ہی ہو۔ جیسے کہ آم کے رس کو بعض نفیس طبع حضرات اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ اس کی شکل بچہ کی نجاست سے مشابہ ہوتی ہے اور ان کو کراہت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ نفیس شے ہے۔ اسی طرح عقائد حقہ ہیں کہ بعض بنیادوں پر ایسی چیزوں کے ساتھ مشتبہ ہو گئے ہیں کہ ان میں کراہت پیدا ہو گئی ہے یہ یاد رکھئے کہ یہ کراہت ہمیشہ پہلے سے متصور ہوتی ہے گندے خیالات پہلے سے دماغ میں موجود ہوتے ہیں اور حق خیال جب ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ ان گندے خیالات سے مشتبہ ہو کر بدعقیدگی پیدا کرتے ہیں۔ یہی علت ہے غلط مذاہب کی۔ جتنے کفر کے مذہب ہیں۔ سب اسی شبہ کی بنیاد پر ہیں۔ مثلاً خدا کے متعلق یہ خیال کیا کہ وہ بڑی عظیم الشان ہستی ہے بڑی قدرت کاملہ ہے اور دیکھا اور غور کیا کہ وہ ہر ہر شے پر قادر ہے کوئی شے اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے تو قدرت کی تعمیم دماغ میں جم گئی اور حکما اور فلسفی میں خواہ مسلم ہوں (مثلاً علماء اعتزال) یا غیر مسلم۔ یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا اور دھوکا لگ گیا کہ خدا اپنی مثال پر بھی قادر ہے۔ حالانکہ یہ بھی قادر ہے اس سے نقصان پیدا ہونے لگا۔ کیونکہ قدرت کاملہ تو

صرف ممکن ہیں تھا۔ جہاں ممکنات ہیں وہاں قدرت کارفرما ہے۔ ممتنع واجب اور محال پہ قدرت لاگو ہی نہیں ہے۔ کثرت خیالات کی بنار پر یہ مشتبہ ہو گیا۔ اسی طرح روپے کی محبت ہے۔ یہ دیکھتے دیکھتے کہ ہر شے روپے سے حاصل ہوتی ہے لوگوں کو یہ شبہ دل میں بیٹھ گیا کہ اصل مقصود روپیہ ہے حالانکہ یہ صرف مقصود کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر مقصود سے ہٹ کر ذریعہ یعنی روپیہ سے محبت ہو گئی۔ سکہ کو انسانی زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ مقصود آسائش اور کھانے پینے کی اشیار کی فراہمی ہے اور روپیہ ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے مگر آسائش کھانا پینا سب سے محبت ہٹ گئی اور روپیہ سے محبت ہو گئی۔ یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان روپیہ کے حصول کے لیے کھانا پینا اور اپنی تمام آسائشیں ترک کر دیتا ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ روٹی اور دونی دونوں فقیر کو پیش کیجیے کہ ایک چیز لے لو۔ وہ روٹی ہرگز نہیں لے گا فوراً دونی اٹھالے گا۔ کیونکہ وہ دل سے سمجھتا ہے کہ روٹی کا مالک ہونا صرف روٹی کا مالک ہونا ہے اور دونی کا مالک ہونا روٹی اور غیر روٹی کا مالک ہونا ہے۔ مقصود چیزوں کا مالک ہونا ہے۔ اور کل کائنات کا مالک ہونا افضل ہے۔ ایک کائنات کے مالک ہونے سے۔ اس طرح پیسے سے محبت ہو گئی۔ یہ ہے دل کی حالت، بار بار متقرالولت اور مشق سے ایک ایسا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی نہیں مٹتا۔ آپ نے مسجدوں میں دیکھا ہو گا کہ بارش کے بعد سائبان سے بوندیں ٹپک ٹپک کر پتھر کے فرش پر گھاؤ اور گڑھے

پڑ جاتے ہیں۔ مگر بڑے بڑے طوفانوں کے گذر جانے کے بعد اس کے اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ کثرت اعمال ایک راسخ ملکہ کا موجب ہوتی ہے اور ایک منضبوط کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ افضل عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے تو اوپر کے بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بات حق ہے۔ دو رکعت نماز جس پر مداومت کی جائے زیادہ مؤثر اور افضل ہے اور قلب میں زیادہ روشنی پیدا کرتی ہے بہ نسبت کبھی کبھی کی پانچ سو اور ہزار رکعت سے۔ تو یہ شبہ ایسی بری چیز ہے کہ اس شبہ کی بنا پر تمام کائنات انسانی تباہ ہو گئی صرف قلیل جماعت رہ گئی۔

ان شبہات کے کھولنے کا کیا طریقہ ہے:

یہ طریقہ قرآن میں ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (۳۳-۲۵)

وہ کوئی ایسا شبہ یا اعتراض بیان نہیں کر سکتے جس کا صحیح جواب ہم بہترین پیرائے میں بیان نہ کر دیں۔ جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ صحیح جواب احسن تفسیر بہترین پیرایہ۔ یہاں یہ بات اور سمجھ لیں کہ انسانیت اور عقل ایک چیز ہے۔ انسانیت اور عقلِ انسانی تمام انسانوں میں مشترک ہے اور ایک ہے۔ ایک شے کا مقصد بھی ایک ہی ہے۔ صرف حاصل کرنے کے ذرائع یعنی مذاہب الگ الگ ہیں۔ دین اور مذہب اور مقصود بالذات الگ الگ شے ہوئیں مقصود بالذات ایک ہے اور اس کے حصول کے ذرائع خواہ شبہی ہوں یا

حقیقی، ان میں اختلاف ہے ہر شخص اپنے مذہب کو نجات کا ذریعہ تصور کرتا
ہے اور اس کو سچا جانتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنے مذہب کو جھوٹا
جانتا ہو اور سچا کہتا ہو، سب یہی سمجھتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ اس بحث سے
یہ ثابت ہوا کہ مقصود بالذات کے حاصل کرنے کے صحیح ذریعہ کو دین یا مذہب
کہتے ہیں اور غلط ذریعہ کو دینِ مفید کہتے ہیں۔ مثلاً دینِ یہود، دینِ نصاریٰ۔

مقصود بالذات کیا شے ہے: جس کے لیے انسان پیدا ہوا ہے (مطلق مقصود بالذات وہ
شے ہے جس میں حسن ہو سکون ہو۔ حسن طبیعت کی مناسبت کا نام ہے
بناؤ میں سکون ہے۔ حرکت میں، عمل میں شور شغف ہے۔ حرکت کا
مقصد حسن ہے تو مقصود بالذات حرکت نہیں حسن ہے۔

اب حسن کیا شے ہے: قوت دراکہ کے اتصال اور حس سے جو حسن مدرک ہو رہا ہے، اصل میں وہ
مقصود بالذات نہیں ہے۔ حسن میں کتنی ہی قوت ہو۔ وہ مقصود بالذات
نہیں ہے کہ اپنا بچہ ہی حسین معلوم ہوتا ہے خواہ کتنا ہی بدصورت ہو
اور دوسرے کا بچہ کسی قدر حسین ہو مقابلے میں اچھا نہیں معلوم
ہوتا۔ کیونکہ حس سے جو حسن مدرک ہو رہا ہے۔ وہ اگر مقصود انسانی
ہوتا تو انسان کے لئے خاص ہوتا۔ انسان اور غیر انسان میں مشترک
نہ ہوتا اور یہ حسن انسان اور غیر انسان میں مشترک ہے۔ مثلاً کان سے
خوش آئند، آواز، ناک سے خوشبو، زبان سے لذت وغیرہ یہ حسی حسن تقاضائے

انسانی نہیں بلکہ اس حیوان کا تقاضا ہے جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ ادراک میں تو حسن ضرور ہے مگر واقع میں نہیں معلوم حسن ہے یا نہیں۔ مثلاً کھانے پینے کی نفیس چیزیں ذائقہ میں تو حسن رکھتی ہیں مگر جزو بدن بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ قلیل حصہ جزو بدن بنتا ہے۔ زیادہ بول و براز کی شکل میں خارج ہو جاتا ہے۔ اور اس کا خارج ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ خارج نہ ہو تو ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ حس یہ تو بتاتی ہے کہ اس کا شروع اچھا ہے لیکن عاقبت کا کچھ پتہ نہیں دیتی۔ یہ کام عقل کا ہے عقل یہ بتاتی ہے کہ جس شے کا اول و آخر اچھا ہو وہ حسن ہے اور وہی مطلوب ہے۔ مقصود انسانی وہ سکھ اور وہ راحت ہے جس میں ذرہ برابر دکھ اور تکلیف نہ ہو۔ یعنی جس شے میں حسن ہی حسن ہو حسن سے زائد کوئی شے نہ ہو۔ حسن ہو حسین نہ ہو۔ حسین وہ شے ہے جس کو حسن عارض ہوا۔ جہاں عارضہ ہٹا اور قبیح ہی قبیح رہ جاتا ہے۔ مثلاً کھانا کا انجام نہایت بدبودار گندی شے۔ دیوار پر پلاسٹر لگایا حسین ہوگئی۔ پلاسٹر ہٹتے ہی اس کا عیب ہی عیب ظاہر ہوگا۔ اصل میں کسی خاص مقصد کے حصول کے لئے چیزیں آراستہ کردی گئی ہیں تھوڑی سی لذت کی آمیزش سے حسن کا ملمع کر دیا گیا۔

آیت: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ (عمران ۱۴)

ہم نے عورتوں، مال، جاہ، مویشی، ان کو مزین کر دیا ہے۔ تھوڑی سی لذت یا حسن سے۔ تاکہ انسان اس کو استعمال کر سکے ورنہ اس عالم میں کوئی

شے ایسی نہیں ہے - جو حسن ہی حسن ہو- یہاں کی اشیار صرف ملمع کی ہوئی اور
مزّین کی ہوئی ہیں - اور عقل نے یہ بتایا کہ مقصود بالذات وہ حسن ہے جس میں
قبح نہ ہو، حسن ہی حسن ہو- ایسی راحت جس میں دکھ کا ذرہ برابر شائبہ نہ ہو
جس کا اوّل بھی اچھا ہو اور آخر بھی- انجام یا عاقبت بھی اچھی ہو- اور ایسی
شے اس کائنات میں نہیں ہے- کھانے پینے کی اشیار کو آپ نے دیکھا کہ نہایت
لذیذ خوش نما اور خوشبو والی ہوتی ہیں- لیکن ان کا انجام نہایت گندہ بدبودار
ہوتا ہے - یہ وہی چیزیں ہیں جو نہایت رغبت سے کھائی گئی تھیں - ان
کا جزو قلیل تو غذا اور جزو بدن بن سکا- باقی کا خارج کرنا ضروری ہوا
اس عالم میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے کل اجزار حسن ہوں- اگر کل اجزا
حسن ہوتے تو بول و براز کی شکل میں خارج نہ ہوتے- یہ لذت جس سے یہ
اشیار مزین کی گئی ہیں وہ کھانے پینے کا ذریعہ بنی ہے - جب یہ اشیار خود
حسن نہیں ہیں تو ذریعے بدرجہ اولیٰ غیر حسن ہیں - اس جہان میں کہیں خالص
لذت نہیں ملے گی - نہ وہ مل سکتی ہے- کیونکہ ایسی راحت جس میں دکھ کا
شائبہ نہیں، ایسی لذت جس میں کمی نہ آسکے - ایسا حسن جس کا اوّل و آخر
دونوں حسن ہوں وہ لا محدود ہیں اور یہ عالم محدود ہے- غیر محدود شے
محدود شے میں کیونکر آسکتی ہے - اس عالم میں وہ ممکن نہیں ہے اور
اس کا ہونا ضروری ہے ورنہ انسانیت کا فائدہ کیا ہوا - ورنہ انسان اور
حیوان برابر ہو جائیں گے، نتیجہ یہی نکلا کہ وہ کسی دوسرے عالم میں ہے اس
مکان میں نہیں ہے - دوسرے مکان میں ہے - اور اس مکان میں پہنچنے

کا جو راستہ ہے۔ وہی دین ہے۔ وہی مذہب ہے۔ اسی کو بتلانے کے لئے تمام انبیا تشریف لائے اور انھوں نے بتایا کہ یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک دُکھ دوسرا سُکھ اور تم جس کو سُکھ سمجھ رہے ہو وہ دراصل سُکھ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں دُکھ موجود ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے مادہ اور مدت کی ضرورت ہے جب تک وہ نہ ہوں سُکھ حاصل نہیں ہو سکتا تو سکھ حاصل کرنے کے لئے مادہ سامان اور مدت کے حصول تک انتظار کرنا ہوگا اور انتظار کا دور خود تکلیف اور اذیت ہے۔ اصل مقصود ایسا سکھ ہے جس میں انتظار نہ ہو۔ مادہ اور مدت کی ضرورت نہ ہو۔ ایسا سکھ جس میں ذرہ برابر دکھ کا شائبہ نہ ہو۔ اس جہاں میں کہیں نہیں ہے۔ وہ کسی دوسرے جہاں میں ہے اسی لئے فرمایا۔ آیت: لَهُمْ مَا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (ق۔ ۳۵)

جو جی چاہے وہ فوراً ملے گی بغیر مادہ اور مدت کے تمھاری خواہشات کے مطابق تمھاری آسائشوں کو کر دیا ہے اور جو ہمارے پاس ہے وہ علیحدہ دیں گے۔ اس کا تم کو شعور بھی نہیں ہے جو چاہو گے فوراً ہوگا اور ہمارے پاس بہت ہے۔ اس میں سے بھی ہم تم کو دیں گے۔

یہ دنیا صرف دارالعمل ہے۔ دارالجزا نہیں ہے۔ اگر دارالجزا ہوتا تو چوبیس گھنٹہ لذت میں مبتلا رہتا۔ ایک منٹ بھی لذت اس سے الگ نہ ہوتی۔ مگر یہاں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کاروبار میں دل لگتا ہے اور کھانے پینے میں جو جزا ہے اس میں دل کم لگتا ہے

اس جہان میں آخر تک عمل کرنا چاہیئے۔ مرتے دم تک دارالعمل ہے۔ دارالجزا نہیں ہے۔ عمر کا جو حصہ باقی ہے وہ زیادہ قیمتی ہے کہ جس جس قدر مقدار میں

کم ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ جو وقت گزر گیا وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مستقبل غیر یقینی ہے۔ صرف وہ آن جو موجود ہے کار آمد ہے اور جس آن میں انسان یہ سمجھ گیا کہ خالق ارض و سماوات نے اسے کیوں پیدا کیا ہے۔ سعادت نصیب ہو گئی یہ معلوم کر لینا ہی ابدی سعادت کے لئے کافی ہے۔

اس عالم میں جتنے غلط مذاہب اور بدعقیدے پیدا ہوئے ہیں سب شبہہ کی بنیاد پر ہوئے ہیں اور جتنے معاصی، گناہ، فسق و فجور ہیں۔ سب شہوت کی بنیاد پر پیدا ہوئے ہیں۔ اصل دین وہی ہے جو نبیؐ کی تلقین اور حسی مشاہدہ سے ہوا ہے۔ قرآن کی تعلیم اور دلائل سب حسی ہیں۔ کیونکہ نبیؐ اور کم سے کم عقل کا آدمی دونوں قرآن پر عمل کرنے کے مکلف ہیں اور نبی اور کم سے کم عقل کے آدمی میں جو قوت مشترک ہے وہ صرف قوت مشاہدہ اور حسیہ ہے۔ اگر یہ علم عقلی ہوتا تو دوسرے عقلی علوم کے سمجھنے میں جو دشواریاں پیدا ہوتیں وہی الجھنیں اس میں بھی پیدا ہوتیں اور یہ اس کا بڑا افضل ہے۔ ورنہ صرف ارباب عقل ہی سمجھتے۔ اس لئے مشترکہ قوت حسیہ کی بنیاد پر تمام دلائل ہیں تاکہ کسی کے لئے حجت باقی نہ رہے۔ اس میں دقیق باتیں نہیں ہیں۔ موٹی موٹی باتیں ہیں۔ ہر جگہ فرمایا۔ اَ لَمْ یَرَوْا۔ کیا تم نہیں دیکھتے (یٰس۔ ۳۱)۔ قل انظروا۔ پھر کر دیکھو (یونس۔ ۱۰۱)۔ کیا تم غور نہیں کرتے۔ اس قسم سے خطاب ہے۔

اسے سمجھ لیجئے کہ یہاں تین باتیں ہیں۔ حاجت، ضرورت اور راحت حاجت کا مطلب یہ ہے کہ جس شے کی حاجت ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو اس شے کے نہ ہونے سے دکھ ہو۔ ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ جس شے کی ضرورت ہو۔ اگر وہ نہ ہو تو ہلاک ہو جائے۔ مثلاً کھانا پینا وغیرہ تو ضرورت کی اشیاء ہر مستحق کو پہنچتی

ہیں۔ مثلاً روزی۔ گھروں میں دیکھا ہوگا کہ عورتیں شوہر، لڑکا وغیرہ جو وقت پر موجود نہیں ہے۔ دیر سے آئے گا۔ اس کا کھانا چھینکے پر لٹکا دیتی ہیں تاکہ بلّی، کتّا، چوہا اس تک نہ پہنچ سکے اور خراب نہ کر دے۔ اسی طرح خداوند عالم فرماتا ہے کہ تمھاری روزی تو میں نے آسمانوں پر لٹکا رکھی ہے تاکہ کسی غیر مستحق کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکے۔ تم گھبراتے کیوں ہو، تمھاری روزی تم کو مل کر رہے گی۔ اب اگر تم یہ کہو کہ جب ہماری روزی ہم کو پہنچ کر رہے گی تو پھر ہم جد وجہد کیوں کریں۔ ہمیں چھینکے سے اتارنے کے لئے جتنی مشقت کرنا پڑتی ہے وہ تو کرنا پڑے گی۔ جو قانون اتارنے کا بتایا ہے اس پر عمل کرنا ہوگا۔ ماں نے یہ بتایا کہ چھینکے سے پتھر مار کر مت گرانا بلکہ سیڑھی پر چڑھ کر یا ہاتھ اونچا کر کے اُتارنا۔ تو اتنی مشقت ضرور کرنا ہوگی اور اگر کلی طور پر اس پر بھروسہ کر لیا جائے تو جس طرح ماں بچے کے لئے خود اٹھتی اور چھینکے سے اتار کر کھانا پہنچاتی ہے وہ شفیق ماں باپ سے زیادہ ہے۔ وہ خود پہنچائے گا۔ دلیل اس بات کی یہ ہے کہ نوزائیدہ بچے جن کا کلی بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ ان کے لئے بہترین غذا دودھ ہے جو جامع ہے۔ کھانے اور پینے کی یہ نعمت عظمیٰ ہے ساری عمر اس پر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ ان ارباب توکل کے لئے مہیا کی۔ اس طور پر کہ جب ضرورت ہوتی ہے اس سوت کو بھرا پاتے ہیں۔ ادھر منہ کیا تو دودھ موجود ادھر منہ کیا تو دودھ کیوں میں بھرا موجود ہے۔ بڑے بڑے اندارے کنویں خالی ہو جاتے ہیں مگر یہ سوتیں ہمیشہ بھری پاتے ہیں — فرمایا کہ ہر ایک کی روزی میں نے اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اور میں یونہی پہنچاتا رہتا۔ مگر تم نے خدا کر کے بادے لے لی، تم نے اپنے قوت اختیاری کو دخل دیا اور اپنے ہاتھ میں کیوں لے لی۔ خیر اب

لی ہے تو لیتے رہو۔ اگر اب بھی میرے رائے کے مطابق تقسیم کرو گے تو تم کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اسی کا نام خلافت اور نبوت ہے دنیا میں جو بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اس کی رائے کے مطابق تقسیم نہیں ہو رہی ہے۔ یہ جو دھڑکا لگ گیا ہے کہ مردم شماری بڑھنے سے غذا میں کمی آجائے گی بے بنیاد ہے۔ کیونکہ نظام قدرت یہ ہے کہ جتنا خرچ کرو گے اتنا ہی بڑھے گا۔ پانی سے سمندر بھرے ہیں۔ کنویں کا پانی جتنا خرچ کرو گے بڑھتا جائے گا۔ درخت کو کاٹتے جاؤ بڑھتا جائے گا۔ لیکن اس کے بھی طریقے بتا دیئے ہیں کہ اوپر اوپر سے کاٹنا۔ جڑ سے مت کاٹنا ورنہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح رزق کے بھی خزانے بھرے ہیں کسی شے کی کوئی کمی نہیں ہے۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ کیا آپ نے پہچان لیا مکذب دین کو کتنے تعجب کی بات ہے کہ باوجود اتنے بیّن دلائل کے ہوتے ہوئے ایمان نہیں لاتے۔ پہچانا آپ نے اس شخص کو جو مکذب دین ہے بڑا تعجب ہے۔ اس میں مبالغہ ہے کہ باوجود اتنے بیّن دلائل ہونے کے پھر خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اور اس کی علامت یہ بتائی کیونکہ وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور اس کو کھانا نہیں کھلاتا۔ یتیم انسانوں میں اس بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ نہ ہو اور جانوروں میں جس کی ماں نہ ہو کیونکہ وہ بچے کی پرورش کرتی ہے تو ایسے بچے کا جس کا مربی کوئی نہ ہو اس کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور اس کو کھانا نہیں کھلاتا۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مفسرین ابوسفیان کے سلسلے میں بتلاتے ہیں کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ دو اونٹ ہر ہفتے ذبح کیا کرتا تھا مگر یتیم کو نہیں دیتا تھا۔ بعض ولید کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اس طرح

چار نام ہیں بعض ابوجہل کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ آیت اتری۔ واقعہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بچہ ابوجہل کا وصی تھا۔ یعنی اس کا باپ مرتے وقت اس کو ابوجہل کے سپرد کر گیا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرنا۔ وہ ننگا تھا۔ جب کپڑا مانگنے گیا تو ابوجہل نے اس کو دھتکار دیا۔ تو اکابر قریش نے اس سے استہزاءً کہا کہ تو محمد (صلعم) کے پاس جا وہ تجھ کو دلوادیں گے۔ وہ بچہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ ابوجہل تو ان کا سخت دشمن ہے اور حضور کی شان یہ تھی کہ وہ اپنی ذات کو تکلیف میں ڈال کر بھی غریبوں کی مدد فرماتے تھے چنانچہ جب وہ بچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ فوراً اٹھے اور ابوجہل کے پاس اس کو لے کر گئے ابوجہل نے آپ کو خوش آمدید کہا اور آپ کی سفارش پر اس کو بہت سا مال دیا۔ اکابر قریش نے اس کو طعنہ دیا کہ تو تو محمد (صلعم) کا بڑا بھاری دشمن تھا اب ان کا معتقد اور مرید ہو گیا۔ بے دین ہو گیا تو اس نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ ایک خفیہ نیزہ ایک پوشیدہ برچھا میرے سامنے لگا ہوا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ اگر میں نہ دوں تو فوراً ہلاک ہو جاؤں اس ڈر سے میں نے کہنا مان لیا اور دے دیا۔ اللہ پاک نے بتایا کہ مکذب دین کون ہے جو یتیم کو جھڑکتا ہے اور غیر مسکین کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور خود نہ دے نہ دے وہ اتنا ظالم ہے کہ دوسرے کو بھی منع کرتا ہے کہ اس کا مال بھی خراب نہ ہو۔ اصل میں اس کو مال سے محبت ہے چاہے اس کے پاس ہو یا کسی اور کے پاس۔ مال کیا ہے۔ یہی دنیا ہے۔ حب مال تو حب دنیا ہے۔ یہ علامت بڑی اچھی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ نے فرمایا کہ تمام مصیبتوں اور گناہوں کی جڑ حب مال ہے۔ حب دنیا ہے اور دنیا ادنیٰ کا مونث ہے۔ جیسے الفر کا لفری۔ اعلیٰ کا علیا۔ اسی طرح ادنیٰ کا مونث دنیا ہے اور نہایت تذکیر ہے

کمزور ہوتی ہے۔ ادنے اور دنیا کی تمام چیزیں عقبے سے ادنیٰ ہیں۔ تو کسی شے کے حاصل کرنے کا ذریعہ اس شے یعنی ذی ذریعہ سے کمزور ہوتا ہے تو مال جو دنیا کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وہ بہت زیادہ ادنے اور کمزور ہوا۔ یہ کائنات عقبےٰ سے ادنیٰ ہے اور مال اس کائنات سے ادنیٰ ہے تو یہ مال جو ہے دنیا ہوا۔ اس کو مال سے محبت ہے ــ تو یہ بتایا کہ اس کو مال سے اتنی محبت ہے کہ اپنا مال نہ دے نہ دے وہ دوسرے ہی سے دلوا دیتا۔ مگر وہ یہ بھی نہیں کرتا تو اس کو صرف مال سے محبت ہے اور مال کیا ہے۔ یہ مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جسمانی لذتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے دین اور علم سے ادنیٰ ہے علم روحانی لذتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں تو جو نسبت روح کو بدن سے ہے وہی وہی نسبت روح کی لذت کو بدن کی لذت سے ہے اور وہی نسبت روح کی لذت کے ذریعہ کو بدن کی لذت کے ذریعہ سے ہے اور جس طرح جسم بغیر روح کے مردہ ہے اسی طرح بدن کی لذت روح کی لذت کے بغیر مردہ ہے اور اسی طرح بدنی لذت کا ذریعہ روحانی لذت کے ذریعہ کے بغیر مردہ ہے یعنی مال بغیر دین کے مردہ ہے اور صاحب مال بغیر صاحب دین کے مردہ ہے۔

پہلے بتایا کہ یہاں تین چیزیں ہیں۔ حاجت، ضرورت اور محبت، حاجت اور ضرورت اس لئے ہے کہ اس سے بدن کو متقوم کیا جائے اور جب وہ تیار ہوگیا تو اب محبت اس شے سے متعلق ہوگی جس کے لئے یہ متقوم ہوا ہے اور مطلوب اور مقصود اس جہان میں راحت عظمےٰ ہے تو محبت راحت عظمےٰ کے ساتھ ہوگی اور کسی شے کے ساتھ نہ ہوگی یعنی اصل مقصود اور قابلِ محبت صرف دین کی طلب ہے۔ یہاں ہوا یہ کہ مقصود سے ہٹ کر ذریعہ سے محبت ہوگئی یعنی دنیا سے محبت ہوگئی، اور دین سے غفلت ہوگئی

مثال سمجھئے کہ مقصود ایک کوٹھی تک جانا ہے اور راستہ اور مسافت وہاں پہنچنے کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔ اب اگر کوئی کوٹھی بھول گیا اور ساری عمر راستے میں پریشان و سرگرداں رہا اور منزل تک نہ پہنچا تو منزل تک نہ پہونچنا ہی ذریعہ میں مصروف ہو جانا ہے اور ذریعہ میں مصروف ہو جانا ہی منزل اور مقصود کی تکذیب ہے اور اس سے یہ ثابت ہوا کہ خود یتیم کو دھکے دینا اور دوسروں سے بھی مال کا خرچ نہیں کرانا علامت ہے تکذیب دین کی، جو ایسا کرتا ہے وہی دین سے بے خبر ہے اور دین کی تکذیب کرتا ہے یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ کم سے کم مال خرچ نہیں کرتا۔ آج کل دو آنے میں اور اس آٹھ میں دو پیسے میں پیٹ بھرتا تھا۔ وہ اتنا مال بھی صرف نہیں کرتا۔ اس کو اس قدر پیسے کی محبت ہے۔ ذرائع سے محبت کرنا ہی مقصود کی تکذیب ہے۔ اللہ سب کو اس کی آفت سے محفوظ رکھے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ

ویل کے معنی، افسوس، جہنم کا گڑھا، حسرت۔ یہ لفظ مصیبت کے وقت بولا جاتا ہے۔

ساہی جمع ساہون کی، ساہون مشتق ہے سہو سے جس کے معنی بھولنا۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنی نماز سے بھولے ہوئے یعنی بے خبر ہیں۔ آگے ایک لفظ عن ہے عن بمعنی بُعد عن صلوٰتہم، اپنی نمازوں سے بعید ہو گئے تارک الصلوٰۃ ہو گئے یعنی ان کی طبیعت صلوٰۃ سے بعید ہو گئی۔ ان کے لئے ویل ہے۔ مگر تارک الصلوٰۃ کے لئے ایسی عظیم الشان وعید نہیں ہے تارک الصلوٰۃ فاسق تو ہے مگر محض ترک صلوٰۃ موجب ویل نہیں ہے۔ ویل ہے کافر اور منافق کے لئے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ مصلّی کا

لفظ ہے جو بتلاتا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ تارک الصلوٰۃ نہیں ہیں۔ پھر نماز پڑھتے ہوئے نماز سے بے خبر رہنے کے کیا معنی بعض مفسرین نے اس کی تاویل کی کہ عن کے معنی یہاں فی کے ہیں اور ایک بزرگ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا۔ کہ اللہ کا شکر ہے کہ خدا نے عن کہا اور فی نہ کہا۔ کیونکہ نماز میں تو ہر شخص بھولتا ہے۔ پھر سجدۂ سہو تو مشروع ہے۔ اگر موجب ویل ہوتا تو مشروع کیوں ہوتا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضور (صلعم) کو بھی سہو ہوگیا تھا۔ پھر کیا معنیٰ۔ اس کے متعلق کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ویل ہے کافر کیلئے، منافق کے لیے۔ تارک کے لیے نہیں ہے۔ تارک اخلاص کے لئے ہے۔ مومن کے لئے ویل نہیں ہے۔ مومن تارک الصلوٰہ فاسق وفاجر تو ہوتا ہے مگر کافر اور منافق نہیں ہوتا۔ مومن کے لئے ضروری نہیں کہ پوری شریعت کا عامل ہو اور پوری شریعت کا عامل تو صرف نبی ہوتا ہے۔ صدیقین میں بھی کچھ نہ کچھ کمی ہوتی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے مقدار کے لحاظ سے اور نوعیت کے لحاظ سے تو بالکل فرق ہوتا ہے۔ صدیق کے عمل کو نبی کے عمل سے وہ نسبت بھی نہیں جو بیٹے کی نماز کو باپ کی نماز سے ہوتی ہے۔ باپ کی نماز بچے کی نماز سے زیادہ قوی ہوتی ہے کہ بچہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے تو مصلی کے لفظ کے ساتھ عن کا لفظ یہ دقت پیدا کر دیتا ہے اس کا مجھے کوئی جواب کہیں نہیں ملا۔ ہاں ایک بات میرے خیال میں آئی وہ میں آپ کے سامنے بیان کر دیتا ہوں۔ یہ بڑا خطرناک مقام ہے۔ کوئی بات اپنی رائے میں ایسی کہہ دینی جو خدا کی مراد نہ ہوتی تو بہت بری چیز ہے۔ دعا کریں کہ خدا صدق مقال عطا کرے۔ غلط راستے سے بچائے۔

اصل میں دقت یوں پیدا ہوتی کہ آیت ساہون پر ختم ہوگئی اور یہ ٹکڑا

نہیں رک گیا اور جملہ پورا نہیں ہوا۔ قرآن میں اور بھی جگہ اسی قسم کی آیات ہیں جو مکمل جملہ نہیں ہیں۔ مثلاً والفجر۔ جملہ مکمل نہیں ہے تو یہ دوسری آیت پہلی آیت کے ساتھ ہے۔ کہ وہ کون سے نمازی ہیں جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں اور بھولے ہوئے ہیں وہ۔ وہ نمازی ہیں جو درحقیقت نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ بلکہ صرف دکھاوا کرتے ہیں نماز نہیں پڑھتے ہیں بلکہ صرف ریائی ہے۔ الذی صفت کا صیغہ ہے وہ یہ بتاتی ہے کہ موصوف کون لوگ ہیں۔ یہاں یہ اور سمجھ لیں کہ سہو کیا ہے۔ قوت دراکہ سے مدرک کا علیحدہ ہو جانا۔ مثلاً آنکھ کے سامنے کتاب ہے آپ اس کو دیکھ رہے ہیں جب کتاب سامنے سے ہٹا دیں گے کتاب دیکھنا ختم ہو جائے گا مگر وہ کتاب آپ کے تصور اور خیال میں باقی رہے گی۔ یا کسی مضمون کا خیال کر رہے ہیں تو قوت وہم جو دماغ کے اندر ہے وہ مدرک ہے ان تمام جزئیات کا۔ جب مدرکات سامنے سے ہٹ جاتے ہیں تو یہ قوت وہم فوراً ان تمام مدرکات کو اپنے خزانچی حافظہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ قوت دراکہ حس مشترک ہے۔ جب مدرکات سامنے سے ہٹ جاتے ہیں تو یہ اپنے خزانچی خیال کو دے دیتا ہے۔ تو سہو کیا ہے۔ خزانہ میں موجود اور دراکہ سے غائب۔ اگر خزانے میں بھی نہ ہو تو وہ سہو نہیں۔ نسیان کہلاتا ہے۔ یہ ادنیٰ تامل سے یاد آجاتا ہے۔ اگر خزانے میں بھی نہ ہو تو کسب جدید کرنا پڑتا ہے اور دوبارہ کوشش کرنا ہوتی ہے۔ معمولی تامل سے نہیں آتا۔

تو ایسا مصلی جس کے خیال میں تو یہ موجود ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ نماز کیا چیز ہے۔ مگر جو عمل وہ کر رہا ہے وہ صرف دکھانے کے لئے کر رہا ہے۔ اصل نماز نہیں پڑھ رہا ہے۔ سب منافق یہ جانتے ہیں کہ عبادت مخصوص ہے صرف اللہ کے

لیے۔ غیر اللہ کے لیے عبادت نہیں ہے غیر اللہ کا عبادت ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جس شے کے لیے ان کی تخلیق ہوئی ہے اس میں اپنی تخلیق کو خرچ کرنا عبادت ہے مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ اپنی تخلیق کو اپنے رب پر نثار نہیں کر رہا ہے بلکہ صرف وہ دکھا رہا ہے اور دھوکہ دے رہا ہے کہ وہ رب پر نثار ہو رہا ہے۔ یہی معنی ہیں نماز سے بے خبر ہونے کے۔ ویمنعون الماعون ۔

ماعون ان معمولی معمولی استعمال کی چیزوں کو کہتے ہیں کہ اگر ان کو صرف نہ کیا جائے تو بخیل کہلائے۔ کوئی شخص آپ کی گھڑی آپ سے طلب کرے اور آپ نہ دیں تو آپ کو کوئی برا نہ کہے گا۔ مگر ایک دیا سلائی آپ سے طلب کی جائے اور وہ بھی آپ نہ دیں تو یہ بری بات کہلائے گی اور ایسی معمولی معمولی اشیاء بھی جو نہ دے وہ بخیل کہلائے گا۔ تو جو شخص ایسی حقیر چیزیں صرف نہ کرتا ہو وہی تکذیب دین کرتا ہے۔ ایسا شخص نماز سے بے خبر ہے اور جس مقصد کے لیے وہ تخلیق ہوا ہے اس میں اپنے کو صرف نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ وہ صرف کر رہا ہے یہی منافقت ہے اور نماز سے بے خبری ہے کبھی انسان دوسروں کو دکھاتا ہے یہ منافقت ہے اور کبھی اپنے آپ کو دکھلاتا ہے اس کو اعجاب اور خود پسندی کہتے ہیں۔ یہ ریائے نفس ہے کہ نیکی کر کے خوش ہوتا ہے کہ اس نے نیکی کی یہ بھی بہت بری چیز ہے رسول نے تین چیزیں مہلک بتائی ہیں ان میں سے ایک اعجاب بھی ہے اللہ ہم کو آپ کو سب کو اس سے محفوظ رکھے مثلاً آپ ڈالی بھیجیں اور دیکھتے رہیں کہ پہونچی یا نہیں تو جب تک آپ کو ڈالی نظر آتی رہے گی وہ نہیں پہنچی۔ جب پہنچ جائیگی آپ کی نظر سے اوجھل ہو جائیگی تو جب تک آپ اپنی نیکی پر نظر رکھیں گے وہ صاحب ارض و سما کی بارگاہ تک نہیں پہنچے گی۔

ہدیہ بہ بارگاہِ رسُولِ مقبُول صلی اللہ علیہ وسلم

اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ (مسلم شریف)

تفسیر ایوبی

جلد چہارم

پارہ عم کے چند رکوعات کی جامع تفسیر

از

حضرت امام المتکلمین و محقّقین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب

دہلوی قدس اللہ سرّہٗ

مکتبہ رازی

ادارہ شہابِ ثاقب

محمد بن قاسم روڈ۔ کراچی ۱